چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
جون 2013

16 — بیلی — انوری رمضان
خوف و ہراس کے گرداب میں بل کھاتی ہوئی اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی

33 — پراسرار مجسمہ — علی کاشف آفاقی
صدیوں پر محیط ایک دل دہلاتی عقل کو الجھنے میں ڈالتی ناقابل یقین لیکن حقیقی جادوئی کہانی

43 — حنوط لاشیں — راجہ باسط مظہر
کیا یہ حقیقت ہے کہ روحیں بھی کسی امانت کی محافظ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

50 — رولوکا — اے وحید
وہ انوکھی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

73 — پراسرار ماسی — شفق شکیلی
جادو ٹونے کے لبادے میں لپٹی ہوئی اور خوف و ہراس پھیلاتی دہشت ناک کہانی

81 — ایوارڈ — فائزہ رحمٰن
عجیب و غریب دل دہلاتی خوف و ہراس پھیلاتی خونی رشتوں کو پامال کرتی سبق آموز کہانی

93 — ہنی مون — عمران قریشی
عشق و محبت کی ایک داستان حیرت جسے پڑھ کر اہل دل محو حیرت میں پڑ جائیں گے

103 — خون کی پیاس — ایس امتیاز احمد
دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی ایک ناقابل فراموش خونی اور تحیر انگیز پرہول روداد

108 — سنہری تابوت — ایم اے راحت
کرب و اذیت سے دوچار ایک دل خراش، دل فگار، عبرت ناک اور سبق آموز کہانی

129 — روح کا چین — خلیل جبار
کرب و اذیت سے دوچار ایک دل خراش، دل فگار، عبرت ناک اور سبق آموز کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

135 — لاج والا — راشد نذیر طاہر
خوف کے لبادے میں لپٹی خونی وادی کی طرف محو پرواز ذہن پر سکتہ طاری کرتی کہانی

147 — پرہول لمحے — ساحل دعا بخاری
رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی دل کو دہلاتی ایک ناقابل فراموش حقیقی کہانی

151 — بے آواز دنیا — عامر ملک
دلفریب...... دل آویز...... دلکش...... دلنشین اور حقیقت سے روشناس کراتی حقیقی کہانی

159 — کرکٹ میچ — ساجدہ راجہ
کیا یہ حقیقت ہے کہ روحیں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے

164 — بلیک ٹائیگر — ایم الیاس
تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے

189 — درنایاب — اسمارہ نوشین
مفاد پرستی اور مطلب پرستی اکثر انسان کو زندہ در گور کر دیتی ہے، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

204 — قوس قزح — ادارہ
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں......

209 — دیوی — بلقیس خان
دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

221 — اینجل — اقصیٰ رباب
اچھی کہانیاں پڑھنے والوں کے لئے ایک دلگداز، دلفریب، اچھوتی اور انوکھی کہانی

226 — دہشت ناک — شہزادہ چاند زیب عباسی
سطر سطر رونگٹے کھڑے کرتی اور انگشت بدنداں کرتی عجیب و غریب لہو لہو عبرت ناک کہانی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

☆ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کہ اللہ کی رحمت سے بے ایمان لوگ ہی ناامید ہوا کرتے ہیں۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 87)

☆ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے اور اس کے ملنے سے انکار کیا، وہ میری رحمت سے ناامید ہو گئے ہیں اور ان کو دردِ دینے والا عذاب ہوگا۔ (سورۃ عنکبوت 29 آیت 23)

☆ اے پیغمبرؐ میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے میرے بندوں جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اور اللہ تو سب گناہوں کی بخش دیتا ہے اور وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ زمر 39 آیت 53)

☆ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا تو انہوں نے کہا کہ اے قوم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور ناپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تو تم کو آسودہ حال دیکھتا ہوں اور اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی کرتے نہ پھرو اگر تم کو میرے کہنے کا یقین ہو تو اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمہارے لئے بہت رہے اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔ (سورۃ ھود 11 آیت 84 سے 86)

☆ اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 35)

☆ اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر کسی کا عمل ہوگا تو ہم اس کو لا موجود کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔ (سورۃ انبیاء 21 آیت 47)

☆ اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کی کہ ترازو سے تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔ (سورۃ رحمٰن 55 آیت 7 سے 9)

☆ ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے بھی جائیں گے یعنی ایک بڑے سخت دن میں جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے۔ (سورۃ مطففین 83 آیت 1 سے 6)

☆ ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 106)

☆ اور اے نبی تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبیؑ جس کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آیا ہو کہ جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں وسوسہ ڈال دیتا تھا۔ تو جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے اللہ اس کو دور کر دیتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے غرض اس سے یہ ہے کہ جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے اس کو ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے، اور جن کے دل سخت ہیں ذریعہ آزمائش ٹھہرائے بے شک ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں اور یہ بھی غرض ہے کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے، وہ جان لیں کہ وہ یعنی وحی تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو وہ اس پر ایمان لائیں اور ان کے دل اللہ کے آگے عاجزی کریں اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ ان کو سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 52 سے 54)

☆ اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا یعنی بہت تنگ کر لو کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں اور نہ بالکل کھول ہی دو کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 29)

☆ اور نماز نہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ آہستہ بلکہ اس کے بیچ کا طریقہ اختیار کرو۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 110)

☆ اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ (سورۃ فرقان 25 آیت 67)

☆ اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور بولتے وقت آواز نیچی رکھنا کیونکہ اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ (سورۃ لقمان 31 آیت 19)

☆ اور جب ہم بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا تو چند شخصوں کے سوا تم سب اس عہد سے منہ پھیر کر پھر بیٹھے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 83)

☆ اور سب مل کر اللہ کی ہدایت کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 103)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

ساحل دعا بخاری بھیر پور سیالکوٹ سے، 23 اپریل کی شام ابر آلود تھی۔ بادل صبح ہی سے آسمان پہ آوارگی میں مصروف عمل تھے۔ پاتال کی گہرائیوں میں ڈوبتا سورج بادلوں کی اوٹ سے لمحے بھر کو جھانکتا رہا اور پھر شرارت سے مسکراتے ہوئے بادل کا پردہ اوڑھ لیتا۔ سورج کی کرنوں کے باعث سفید اور ہلکے سرمئی بادل سنہری اور گلابی ہو رہے تھے۔ ایسے میں ابو جی کے توسط ڈر کا اعزازی شمارہ ملا تو دھڑکنیں کچھ دیر کو اپنی ترتیب بھول گئیں۔ خوشگوار حیرت نے ہمیں بے اختیار اپنے حصار میں لے لیا۔ یقین تو کیا گمان تک نہ تھا کہ درتو بہ اتنی جلدی ''وا'' ہو جائے گا۔ کیونکہ اپریل کے شمارے میں آپ نے کہا تھا کہ وہ ملی ہی نہیں تو ہم تو ہاتھ جھاڑ کے بیٹھ چکے تھے۔ لیکن مئی ڈر کی صورت آپ نے بلاشبہ میں ''سرپرائزنگ گفٹ'' دیا ہے۔ ڈرو واقعی اپنے چاہنے والوں کا خیال رکھتا ہے، آپ لوگوں کا بے حد شکریہ! ویسے ہے تو کم ظرفی کہ آپ نے ہمارا اتنا خیال کیا کہ ہماری تحریر کو لکھا نہیں اور اسے اولین صفحات پر جگہ دی اور کیا ہے نا کہ ہمیں کھلے گلابوں سے زیادہ ادھ کھلی کلیاں زیادہ پسند ہیں) زہریلی مسکراہٹ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے زیادہ انتظار نہیں کروائیں گے۔ ایک تو یہاں ڈر ملتا نہیں۔ اب اپریل کا ڈر تیرہ 13 اپریل کو ملا تھا۔ خیر اب نذیر بک ڈپو کے نذیر انکل کی منت کریں گے کہ ہر ماہ لا دیا کریں۔ اگر زہریلی مسکراہٹ قابل قبول ہے اور آپ اجازت دیں تو کچھ ادھوری تحریریں جن میں ''تلاش اجل، ہیروں کی تلاش، ابھی اک رات باقی ہے اور سنگ تراش مکمل کر کے بھیج دیں؟ ابھی اک رات باقی ہے اور سنگ تراش دو دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ اور ہمیں قوی یقین ہے کہ آپ کے معیار پر پوری اتریں گی۔ سنگ تراش واحد تحریر ہے ہماری جو ہمیں خود بہت پسند ہے۔ ورنہ تو ہمیں اپنا لکھا لکھا پسند نہیں آتا۔ بلقیس خان دعاؤں کے لئے شکریہ! عثمان غنی آپ نے ہمیں بہن کہا، اتنا پاکیزہ نام اور اعلیٰ مقام دینے پر ہم آپ کے مشکور ہیں۔ ہاں آپ کی تحریر بھی بہت اچھی تھی۔ فاریہ تبسم آپ کا نام بہت اچھا ہے۔

☆☆ ساحل دعا صاحبہ: خوشی کی بات ہے کہ اب آپ کی ناراضگی دور ہوئی، ہر اچھی کہانی خود بخود اپنا مقام بنا لیتی ہے، اگر کبھی کبھار کوئی پیراگراف کہانی سے الگ کیا جاتا ہے تو اس کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس کی کمی محسوس نہ ہو، صرف رائٹر کو پتہ چلتا ہے لیکن ادارے کو اپنی کارکردگی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ آپ دیگر کہانیاں ارسال کر دیں، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

فائزہ رحمٰن سالارانک سے، امید ہے ڈر کا تمام اسٹاف، قارئین اور رائٹرز خیریت سے ہوں گے اور اپنی زندگی کو حسین سے حسین بنانے کے لئے کوشاں ہوں گے۔ مئی کے شمارے میں خونی سفر نمبر ون رہی اور ہمدرد روح، درتو بہ، عشق حیات ہے بھی اچھی لگیں، بلیک ٹائیگر اور سنہری تابوت سو سو تھیں، بلقیس، امارہ نوشین، صبار مضان، فاریہ تبسم، صدف حسین کو سلام۔ میں نے جتنی بھی تحریریں بھجوائی ہیں اگر وہ ڈر میں اپنی جگہ نہیں بنا پائیں تو پلیز انہیں ایک بار پڑھ کر بتائیں ضرور کہ کہاں کوئی کمی بیشی یا غلطی ہے تا کہ Next Time اس کی اصلاح کر سکوں۔ باقی الیکشن میں اپنے ووٹ کا صحیح استعمال ہی ہمیں اپنی اور اپنے ملک کی مشکلات کو کم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈر کے لئے دن رات دعا گو۔ اللہ حافظ۔

☆☆ فائزہ صاحبہ: خوش ہو جائیے، آپ کی کہانی بنام ایوارڈ جلوہ گر ہو گئی، ہر وہ کہانی جو موضوع کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہے وہ اہمیت حاصل کرتی ہے، اکثر رائٹرز حصرات موضوع کا خیال نہیں رکھتے اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ارسال کر دیتے ہیں۔ خیر امید ہے اب آپ بھی کہانی لکھتے وقت موضوع کا خاص خیال رکھیں گی۔ ووٹ دینے والے تو اپنا ووٹ ڈال دیتے ہیں مگر اصل ذمہ داری کرتا دھرتا لوگوں کی ہوتی ہے اور قادر مطلق کے سامنے انہیں بھی جواب دہ ہونا پڑے گا، اب آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

عصمت اقبال عین منگلا ڈیم سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں آپ اور ڈر کا پورا اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ اپریل کا رسالہ ملا تو سب سے پہلے غزلیں پڑھیں اور اس میں اپنی دو عدد غزلیں دیکھ کر حیرت ہوئی، ایک تو وہ تھی جو میں نے بھیجی تھی دوسری وہ تھی جو ایک صاحب نے ایک ماہنامہ فروری 2013ء کے شمارے سے اپنے نام اور تخلص سے بھیجی تھی جو لوگ ایسا کرتے ہیں انہیں زیب نہیں دیتا کہ ایسا قدم اٹھائیں کیونکہ کوئی بات چھپتی نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ کسی بھی شاعر کی غزل یا نظم شائع کرنے سے پہلے

اگر تھوڑی سی تحقیق کر لیں تو کیا ہی اچھا ہو اور جو لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں ان کا درست انداز میں محاسبہ کیا جائے تا کہ ایسے نام نہاد شاعروں کی حوصلہ شکنی ہو۔ ورنہ لکھنے والوں کا رسالوں اور میگزین سے اعتبار اٹھ جائے گا۔ امید کرتی ہوں آپ اس جانب توجہ دیں گے۔

☆☆ عصمت صاحبہ: یہ سراسر غلط ہے اور ایسا کرنے والا دین و دنیا دونوں میں شرمسار ہوتا ہے اور ہو گا، رہی تحقیق کرنے کی بات تو کون ایسا ہے جو ملک میں شائع ہونے والے سارے رسالے پڑھے گا، غلط کام کرنے والے بے شمار لوگ پڑے ہیں، جنہیں اپنے غلط عمل کا ایک نہ ایک دن حساب دینا ہے۔

عاصمہ آصف کراچی سے، امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہو گا۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ کا شمارہ بھی لاجواب تھا اور اس بار ہمت کر کے میں نے بھی اپنی کہانی بھیج دی جو سچائی پر ہے یعنی ایک سچی کہانی ہے بس میں یہ چاہتی ہوں کہ لوگ اسے پڑھ کر چھوٹی چھوٹی غلطیاں نہ کریں جس سے وہ بڑی مشکل سے بچ جائیں۔ پہلی بار کہانی لکھی ہے نئی لکھاری ہوں تعاون کی طلب گار ہوں، امید کرتی ہوں آپ کو کہانی پسند آئے گی۔ مجھے اپنی پسند سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔

☆☆ عاصمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم آپ کی کہانی موصول ہو گئی، ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہو گی، بہت چھوٹی کہانی ہے آئندہ زیادہ صفحات اور یہ خیال رکھئے گا کہ کہانی فوٹو اسٹیٹ نہ ہو، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔

صباء محمد اسلم گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کا اسٹاف خیریت سے ہو گا، میری غزل شائع کرنے کے لئے Thanks، اور میں نے اپنی چچی کے لئے دعا کروائی تھی، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے لئے اب مغفرت کی دعا کریں اور ڈر ڈائجسٹ پڑھا ان میں سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں۔ غزلیں اور شعر تو بہت ہی زبردست ہیں، کسی ایک کی تعریف کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ سب ہی نے اچھا لکھا ہے۔ اور اسٹوریز بھی بہت زبردست ہیں۔ دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کی منازل طے کرے۔ (آمین) تمام قارئین اور ایڈیٹرز کو میرا بہت بہت سلام قبول ہو۔

☆☆ صباء صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی چچی کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر و جمیل عطا کرے، کہانیوں کی تعریف اور خط لکھنے کے لئے ویری ویری تھینکس، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

راحل بخاری بھیر پور سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ موت کی مسکراہٹ اور غیر انسانی مخلوق اچھی لگیں۔ بلیک ٹائیگر اور رولو کا دونوں ہی اچھی جا رہی ہیں۔ غزلوں میں سب کا ہی انتخاب اچھا تھا اور خط بھی سبھی کے اچھے تھے۔ ایس حبیب خان نجانے کہاں غائب ہیں۔ عمران قریشی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ہاں، یاد آیا! ٹائٹل اس بار زبردست تھا۔ موسم گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے اور لوڈ شیڈنگ شدید سے شدید ترین خدا سے دعا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو دولت ایمان سے سرفراز کرے تا کہ یہ لوگ ملک کا بھی کچھ سوچیں۔ بس اللہ ہی رحم کرے ہم پر، اب اجازت دیں، اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی شرکت کروں گی۔ آخر میں سب کو سلام۔

☆☆ راحل صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کی پسندیدگی اور خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ، چلئے حوصلہ افزائی ہو گئی اور اب قوی امید ہے کہ حسب وعدہ آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ میں شرکت کرتی رہیں گی۔ Thanks۔

فاریہ تبسم ٹھینگ موڑ قصور سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام قارئین، رائٹرز، اسٹاف اور دیگر عملے کو میری طرف سے محبت بھرے پیار کے تحفے قبول ہوں۔ مئی کا شمارہ تھوڑا سا لیٹ ملا، لیکن ملتے ہی بے صبروں کی طرح پکڑا، قرآن کی باتیں زبردست انتخاب تھا۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ غلام نبی نوری، اقصیٰ رباب، مریم ماہ منیر اور دیگر دوستوں کے خطوط اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے غلام نبی نوری کی کہانی پڑھی۔ ماشاء اللہ بہت زبردست تھی، میں تو آپ کی فین ہو گئی ہوں، رولو کا بیسٹ آف بیسٹ تھی۔ بلیک ٹائیگر پڑھی نہیں۔ سنہری تابوت تھوڑی لو تھی۔ عام کہانیوں میں خونی مردے گڈ، انتقام اچھی تھیں۔ عشق حیات ہے، ویری گڈ، آغوش، تھوڑا لیول کم تھا۔ درتو بہ، سحر انگیز تھی۔ اس کے علاوہ قبر، آخری دعا، خونی سفر، شعلے کی موت دل میں جگہ کرنے والی تھیں۔ سنیاسی راج کمار نقل شدہ تھی۔ قوس قزح میں سب نے اچھا لکھا۔

☆☆ فاریہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا خلوص نامہ بھیجنا ضرور یاد رکھیں گی۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم کے بعد عرض خاص ہے کہ ڈرڈائجسٹ سے منسلک قارئین خیر خیریت سے ہوں۔ امید واثق ہے کہ سب کچھ نارمل ہوگا اور زندگی خوب مزے میں گزر رہی ہوگی، جی تو ہمارا من پسندیدہ میگزین ڈر، 21 تاریخ تک مل ہی گیا۔ خیر صنف نازک حسینہ، دلکش پوز دے کر سرورق کو روشن کر رہی تھی، کہانیوں میں بلیک ٹائیگر کو ختم کر کے اچھی سی اسٹوری شروع کر دی جائے۔ سنہری تابوت الجھی ہے جلدی سے معاملات سلجھائے جائیں۔ سنگل اسٹوریز میں درتوبہ، زبردست رہی۔ آغوش نے بھی متاثر کرنے کی کارکردگی دکھائی، عشق حیات ہے اچھی لگی، غیر انسانی مخلوق، بوررہی، موت کی مسکراہٹ سسپنس سے بھرپور انوکھی اچھوتی تحریر رہی۔ انتقام نے بھی آخر تک جکڑے رکھا۔ خونی سفر کے کچھ مناظر اچھے لگے، کچھ کو بے جا طول دی گئی تھی۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ خطوط میں سب دوستوں کا شکریہ، کہ وقت نکال کر یاد کر لیتے ہیں۔ افشاں کہاں غائب ہو۔ جلدی سے آجاؤ اور ساجدہ راجا، شگفتہ حسین، اقصیٰ رباب، کائنات اور ساجدہ کو دل کی گہرائیوں سے (وش) فاریہ تبسم، اسارہ نوشین اور ساحل کو سلام۔ شعرو شاعری میں عثمان غنی کی غزلیں نظمیں اور شعر زبردست رہے۔ ایس امتیاز احمد نے بھی اچھی کوشش کی۔ اس ماہ کا ڈر مکمل خوب صورت تھا۔ اب تو وعدہ وفا ہونا چاہئے، دیوی آرہی ہے کہ نہیں یا پھر انتظار۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: آپ کی دیوی شامل اشاعت ہے، خوش ہو جایئے، اور آپ پر مٹھائی ڈیو ہوگئی، دیکھئے بھولئے گا نہیں اور پھر نئی کہانی ارسال کر دیں، امید ہے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

نورین اعظم راولپنڈی سے، السلام علیکم، میری طرف سے پوری ڈرٹیم کو میرا سلام پیش خدمت ہے۔ اس دفعہ ڈر تھوڑا لیٹ ملا، اس دفعہ خطوط میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور کہانیوں میں اپنی کہانی نہ دیکھ کر اتنا دکھ ہوا کہ میں بتا نہیں سکتی، آپ نے اگلے ماہ کی امید دلائی تھی، مارچ کا پورا ماہ میں نے جس قدر بے چینی اور انتظار سے گزارا ہے میں بتا نہیں سکتی۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی پہلے کہانیوں میں اپنا نام دیکھا مگر افسوس آپ نے کہا کہ کہانی حقیقت پر مبنی ہے مگر یہ کہانی تو میں نے اپنے ذہن سے لکھی ہے اتنی محنت سے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ پڑھنے والوں کے مزاج پر بوجھ ہوگا، مجھے ذرا تفصیل سے سمجھائے گا تاکہ مجھے ناامیدی نہ ہو آپ کو دو کہانیاں بھیجیں آپ نے شائع نہیں کی، چلیں آپ ''بھیانک سزا'' ہی شائع کر دیتے تاکہ میرا دل خوش ہو جاتا میں جانتی ہوں لکھنا بہت مشکل ہے، جس طرح آپ نئے لکھاریوں کو جگہ دیتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس طرح کوئی نہیں کرتا۔ اب جو کہانی میں لکھ رہی ہوں مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی ٹھیک نہیں ہوگی مگر میں پھر بھی پوری کر کے آپ کو بھیجوں گی اور آپ اسے ضرور شائع کریں گے مجھے امید ہے اور پورا بھروسہ بھی، یہ بھی اس لئے کہ یہ ڈر رسالہ میرا اپنا رسالہ ہے۔ اللہ اسے ترقی دے اور ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے۔ میری طرف سے تمام رائٹرز اور قارئین کو سلام۔

☆☆ نورین صاحبہ: حوصلہ رکھیں ''بھیانک سزا'' عنقریب شائع ہو جائے گی اور انوکھا تعلق شائع ہونا مشکل ہے، دوسری کوئی اور کہانی ارسال کر دیں، لیکن موضوع کا خاص خیال رکھئے گا، معاشرے میں ہونے کو بہت کچھ ہو رہا ہے، مگر تحریر میں لانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی ضرور اپنی رائے ارسال کریں گی۔ شکریہ۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کا شمارہ مئی 2013ء کڑکڑاتی دھوپ اور سخت تپش گرمی کی جولانیوں کے دوران قارئین کے ہاتھوں کی زینت بننے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ اس کا سرورق رنگین آرٹ پیپر پر دعوت خرید عطا کر رہا ہے۔ اس میں لاتعداد ڈراؤنی بھیانک راتوں کی نیند حرام کر دینے والی کہانیاں، اعلیٰ پایہ کی معیاری غزلیں، نظمیں اشعار جلوہ گر ہوتی ہیں۔ قدیم ادوار کے انبیاء پیغمبروں کے حالات زندگی اور نصیحت آمیز دلوں کو روحانی تقویت سے معمور حالات اس موجودہ دور کے لئے ایک سبق آمیز چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نئے نو آموز لکھاریوں کے لئے ہمت افزائی کرنا ادارہ کا فرض اولین ہے۔

☆☆ واجد صاحب: خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے Thanks، ڈرڈائجسٹ سے آپ کا قلبی لگاؤ واقعی قابل دید ہے۔ اور قوی امید ہے کہ ہر ماہ شکریہ کا موقع اپنی رائے بھیج کر دیتے رہیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف بخیریت ہوگا۔ اس بار پرچہ پھر لیٹ ہو گیا۔ شہر کے کافی چکر لگائے، ڈرڈائجسٹ کے لئے تب جا کے اس کا دیدار ہوا، سرورق بہت ہی خوب صورت اور حسین رنگوں سے مزین تھا جسے دیکھ کر قاری پرچہ خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ ایک معیاری رسالہ ہے جس کا ہمیں ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا

ہے۔ ہم آپ کو بڑی محبت اور خلوص سے خط تحریر کرتے ہیں۔ غزلیں اور خط شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ مجھے ڈرڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں، غزل ارسال خدمت ہے شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیجئے گا۔ سبھی سلسلے اچھے ہیں، قرآن کی باتیں، قوس قزح اور غزلیں بہت اچھی تھیں، کہانیوں میں آخری دعا، خونی سفر، درتوبہ، آغوش، انتقام وغیرہ ہر رائٹر کا اپنا الگ الگ انداز ہوتا ہے ان کہانیوں سے بے حد متاثر ہوں، تمام قلمکاروں کو آداب عرض۔

☆☆ اسلم جاوید صاحب: انسان کی قدر دل و دماغ میں ہوتی ہے، منہ دیکھی بات اچھی نہیں ہوتی، آپ واقعی اچھے دل دماغ کے مالک ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ڈرڈائجسٹ سے منسلک سارے لوگ قلبی لگاؤ کا ثبوت دے کر اپنی تحریریں ارسال کرتے ہیں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، 22 کو ملنے والا رسالہ 27 کو ملا، انتظار کرتے ہوئے کئی من خون کم ہو گیا اور بک اسٹال والے کہتے ہیں جیلانی صاحب ناک میں دم نہ کرو ہم آپ کو کراچی سے رسالہ لا کر دے دیتے ہیں، یہ ادارہ ڈر ہی ہے جس کی وجہ سے قبلہ کے ساتھی جن میں اسارہ نوشین، فاریہ تبسم، فائزہ رحمٰن، صدف حسین اور بلقیس خان وغیرہ اچھے لفظوں میں پر خلوص دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں، بہت شکریہ..... صبا محمد اسلم کے بھائی والد چچی جان کے لئے صحت یابی کے لئے دعا کریں گے مرکز میں بھی دعا کرائیں گے۔ ایس امتیاز صاحب کا تکیہ کلام خوب صورت لکھنے خوب صورت پڑھنے والوں کو سلام، امتیاز صاحب ایک خوبصورتی چہرے کی ہوتی ہے اور ایک خوبصورتی دل کی ہوتی ہے چاہے چہرہ بدصورت ہو آپ کون سی خوبصورتی کو تسلیم کرتے ہیں۔ کبھی تو بدصورت لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اچھا لفظ استعمال کر لیا کریں، یاد رہے میں بدصورت نہیں ہوں..... ناراض نہ ہونا آپ ہمارے پسندیدہ رائٹر ہیں، سب ساتھیوں کے لئے دعائیں۔

☆☆ شرف الدین صاحب: ایس امتیاز صاحب دل کی خوبصورتی کی بات کرتے ہیں، جس کا ظاہر نہیں بلکہ باطن اچھا ہو تو وہ اچھا انسان ہوتا ہے، اور آپ بھی اچھے قلب کے مالک ہیں۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، محترم و مکرم جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، بک اسٹال پر ''ڈر'' نظر آیا میں تو یقیناً ڈر گیا اور ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں پھر ڈرتے ڈرتے تھوڑی ہمت کر کے ڈر خرید ہی لیا اور ڈرتے ڈرتے کھولا۔ مگر یہ کیا اندر تو گلہائے رنگا رنگ کا ایک چمن زار تھا جو مشام جاں کو معطر کر رہا تھا۔ سب سے پہلے شعر و شاعری کی کیاری کا انتخاب کیا جس میں پہلا پھول پروفیسر واجد نگینوی کا، ابھی پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگا، لائق صد احترام پروفیسر صاحب نے عصمت اقبال عین کی غزل من و عن اپنے نام سے اپنا تخلص استعمال کرتے ہوئے چھپوادی، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ادارے کے لوگ اتنی زیادہ تحقیق تو نہیں کر سکتے کہ کون سا شاعر اپنا کلام بھیج رہا ہے۔ بہر حال ڈر کا شمارہ پسند آیا اتنا اچھا میگزین نکالنے پر دلی مبارکباد اور اس بات کی بھی مبارک کہ ڈر کے بے حساب قارئین میں ایک کا اضافہ ہوا، اپنی ایک غزل ارسال خدمت ہے، اگر ڈر کے مزاج اور معیار پر پوری اترے تو کسی قریبی شمارے میں جگہ عطا فرمادیجئے گا۔

☆☆ ریاض صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی تمام باتیں درست ہیں۔ امید ہے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام باتیں درگزر کر دیں گے، آپ کی باتوں کو امید ہے آئندہ کے لئے لوگ اپنے پلے باندھ لیں گے، آئندہ ماہ بھی خلوص سے بھرا تجزیہ کاشدت سے انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، ماہ رواں کا شمارہ ہمارے سامنے ہے، دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے، آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، میٹر آپ کے پاس ہیں، پلیز دیکھئے گا..... مزید Ad میٹرز میں۔ قاتل روحیں، مراسلہ، غزل، ارسال خدمت ہے۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام، پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کی طرف سے ویری ویری تھینکس اور دعا سلام، آپ کو قبول ہو، پلیز! اپنا خیال رکھتے ہوئے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ضرور ارسال کیجئے گا۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، آداب عرض! خیریت مسنون! الحمدللہ دن گزر رہے ہیں خوش اور مصروفیت میں۔ M.com

کی فائنل تیاری، یونیورسٹی کے اہم لیکچرز اور نئی رنگوں کے نئے جذبے.....! اپریل کا ڈر پڑھا، V.V.Thanks فار اعزازی کاپی، اینڈ Thanks a lot اسٹوری شائع کرنے کا.....! کہانیاں تمام کی تمام دلوں کو چھو لینے والی ہیں اور ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری 3 نئی کہانیاں حاضر خدمت ہیں۔ اللہ آپ کو اور سب کو خوش رکھے، اپنی پرخلوص دعاؤں میں مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھا کریں۔ شکریہ۔

☆☆ مدثر صاحب: کہانیاں موصول ہو چکی ہیں اس کے لئے شکریہ اور آپ کی نئی کہانی اگلے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی اور آئندہ اپنی مصروفیات سے چند منٹ نکال کر حال دل ارسال کر دیا کریں تا کہ خوشی ہو۔

سید محمود حسن حیدر آباد سے، السلام علیکم، اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ اسی طرح ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اور دنیائے ادب میں روشن ستارہ بن کر سدا جھلملاتا رہے میں سمجھتا ہوں کہ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ ایک مکمل رسالہ ہے جو کہ نہ صرف ڈراؤنی کہانیاں پیش کرتا ہے بلکہ آج کی سائنسی اور معاشرتی سچائیوں کو بھی بہترین پیرائے میں قارئین تک پہنچاتا ہے، ماہ اپریل 2013ء کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، خصوصاً خونی اسپتال، ایک ایسی تحریر تھی جو کہ آج کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہے اور ''راج دلاری'' تو دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ میں پہلے بھی بچوں کے لئے کہانیاں لکھتا رہا ہوں اب اپنی لکھی ہوئی کہانی ''انوکھی بانسری'' ارسال کر رہا ہوں، جو کہ ایک مختلف موضوع لئے ہوئے ہے۔ اگر آپ کو پسند آئے تو قابل اشاعت فرما دیں۔ امید ہے ماہنامہ ڈرڈائجسٹ ہمیشہ بہترین کہانیاں پیش کرتا رہے گا۔ شکریہ۔

☆☆ محمود صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کی کہانی انوکھی بانسری ملی اس کے لئے تہہ دل سے شکریہ قبول کیجئے، اب آپ کی یہ کہانی ماہنامہ فکشن میگزین میں جلوہ گر ہوگی۔ آئندہ بھی آپ کی تحریروں کا شدت سے انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

اذان عزیز ٹنڈو آدم سے، اب جو کے امتحانوں کا بھوت سر سے اتر چکا ہے اور ہم اپنی نیند بلکہ (نیندیں) بھی پوری کر چکے ہیں تو ہمارے ذہن رسا میں رعنائی نے یوں انگڑائی لی کہ کیوں نہ ڈرڈائجسٹ میں انٹری مار کر اپنے دل کی بات کروں، لکھنا لکھانا تو ویسے بھی ہمارا پیشہ رہ چکا ہے وہ کسی نے کہا ہے ناں کہ ''ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے..... ہاتھوں میں قلم رکھنا ہاں ہاتھ قلم میں رکھنا'' خیر مندرجات پر کُل افشانی کرتے ہیں۔ ٹائٹل حسب روایت تھا۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہر شمارے پر تبصرہ کریں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں ناں کہ قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد مخاطب ہونے کا موقع میسر آیا ہے۔ ویسے تو ہر شمارہ اپنے میں خاص ہوتا ہے، میں نے اکتوبر نومبر دسمبر میں اپنے خط آرٹیکل شعر ایک کہانی ارسال کی تھی، کہانی شاید آپ کے میرٹ پر پوری نہ اتری ہو مگر خط شائع کر کے تو شکریہ کا موقع دے سکتے تھے، مگر خیر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاک کی نااہلی کی نظر ہو کر رہ گئی ہوں اور دیر بعد ملی ہوں، اس ملک میں کون سی چیز ٹائم پر پہنچتی ہے سارے نظام درہم برہم ہیں۔

☆☆ اذان صاحب: چلئے شکر ہے کہ آپ کو ڈاک کی کارکردگی کا پتہ چل گیا، ورنہ تنقید کی ٹوکری ہمارے سر پر رکھ دیتے، کہانی ابھی پڑھی نہیں، ٹھیک ہوئی تو آئندہ شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ 1899، 1999ء، 2013ء میں بہت فرق ہے، اور جب دنیا وجود میں آئی تھی اس وقت بھی خون خرابہ ہوا تھا اور آج بھی خون خرابہ ہو رہا ہے مگر سارا مسئلہ سوچ اور فطرت کا ہوتا ہے، باقی باتیں آپ خود سمجھ جائیں۔ Thanks۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم، اداب عرض، امید ہے کہ ڈرڈائجسٹ کے ادارے سے وابستہ سارے لوگ خیر خیریت سے ہوں گے اور زندگی کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ ماہ مئی 2013ء کا ڈائجسٹ، 21 تاریخ کو ملا، ٹائٹل زبردست انوکھا اور اچھوتا تھا۔ کہانیوں میں اپنی کہانی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا، ویری ویری تھینک یو۔ پلیز، میری نئی کہانیاں بھی آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ ان سب کہانیوں پر میں نے دل سے محنت کی ہے۔ مجموعی طور پر اس مہینے کا ڈرزبردست خوب صورت پیارا اور بہت اچھا تھا۔

☆☆ عثمان صاحب: جن کہانیوں پر موضوع کے لحاظ سے محنت ہوتی ہے وہ صف اول میں کھڑی ہو جاتی ہیں، لہٰذا ہر رائٹر سے بار بار یہی کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانی تخلیق کریں، خیر آپ اچھی امید رکھیں، آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ اور امید ہے خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

قاسم رضا چنیوٹ سے، السلام علیکم، ڈر کے تمام اسٹاف اور قارئین ورائٹرز کو میری طرف سے سلام، خدا ہم سب کو اسی طرح شیر و

شکر رکھے۔ آمین۔ جناب ایڈیٹر صاحب! اپنی نئی کہانی ''جاگتا قلعہ'' کے ساتھ حاضر ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں۔ یہ "Chain Story" ہے۔ ایک کڑی بھی مس ہو گئی تو کہانی کا مزا خراب ہو جائے گا۔ ایک غزل بھی بھیج رہا ہوں، برائے مہربانی شائع کر دیجئے گا۔

☆☆ قاسم صاحب: نئی کہانی بھیجنے کا شکریہ، آپ کی کہانی کمپوز ہو چکی ہے مگر اگلے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی اور امید ہے کہ اس دوران کوئی اور نئی کہانی بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، السلام علیکم، آپ کی خیریت کا طالب ہوں، غزل کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں، اس خط کے ہمراہ اپنا تازہ کلام ارسال خدمت ہے، برائے کرم اگلی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔

☆☆ قدیر صاحب: تازہ کلام شامل اشاعت ہے، اور امید ہے کہ آئندہ شمارے کے لئے نیا کلام ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محسن علی جٹ ساہیوال سے، السلام علیکم، امید ہے ادارے کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے، مئی 2013ء کے شمارے میں سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جو کہ عمل کرنے کے قابل تھیں، کہانیوں میں فرسٹ پوزیشن رولوکا، باقی کہانیاں بھی معقول تھیں، اس بار غزلوں میں واجد نگینوی صاحب اور ساجدہ راجہ صاحبہ کا کلام پسند آیا، آپ کو دو کہانیاں بھیجی ہوئی ہیں جب کہ میری پہلی کاوش بے وفا لوگ کو کافی عرصہ ہو گیا مگر آپ نے شائع ہی نہیں کی اب تو یار دوست بھی کہنے لگے ہیں کہ لگتا ہے شاید ڈر والے بھی ان کی کہانیاں شائع کرتے ہیں جنہوں نے ممبر شپ لی ہو، جو لوگ دکانوں سے لے کر یعنی خرید کر پڑھتے ہیں، ان کو No لفٹ کرواتے ہیں۔ یعنی ان کو صرف دلاسہ دیتے ہیں اب آپ ہی انصاف کریں، معاملہ آپ کے سامنے ہے۔ اللہ ڈر کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ محسن صاحب: ممبر شپ اور بغیر ممبر شپ کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی بہت جلد، ہم لوگ خوف خدا کو ذہن میں رکھتے ہیں اور کسی کی محنت ضائع نہیں کرتے، گھبرائیں نہیں، عنقریب آپ کے دل میں بھی خوشی کے لڈو پھوٹیں گے۔

محمد وارث آصف واں بھچراں سے، السلام علیکم، امید ہے کہ مزاج بخیریت ہوں گے، زیر نظر کہانی ارسال خدمت ہے، جس کا نام میں نے ''دشت جنون'' تجویز کیا ہے۔ مذکورہ کہانی میری محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کہانی کو لکھنے میں، میں نے بہت محنت کی ہے، امید ہے کہ میری محنت کا مجھے صلہ ملے گا اور یہ کہانی ضرور شائع ہوگی۔ جناب والا اس سے پہلے بھی میں نے ایک کہانی عشق زادے بھیجی تھی۔ پلیز! جلد سے جلد عشق زادے اور یہ کہانی دشت جنون شائع کر کے طویل انتظار سے چھٹکارا دیا جائے۔ پرزور ریکویسٹ ہے امید ہے کہ عمل ہوگا۔ ڈر سے لگاؤ کا تسلسل جاری وساری ہے انشاء اللہ اسی طرح محنت سے کہانیاں لکھ کر ڈر کی نگری کو آباد کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ ایک بار پھر پرزور اپیل ہے کہ دونوں کہانیوں کو شائع کیا جائے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ آمین۔

☆☆ وارث صاحب: نئی کہانی بھیجنے کا شکریہ، ابھی پڑھی نہیں مگر قوی امید ہے کہ یہ اچھی ہوگی۔ ڈرڈائجسٹ کا وہ واحد ادارہ ہے جو کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا، اگر کہانی معیاری نہ ہو تو پھر کیا جائے، خیر اچھی امید رکھیں، آئندہ شمارے میں آپ کی کہانی بھی شامل اشاعت ہوگی۔

نائیک محمد عظیم رضوی کھاریاں کینٹ سے، السلام علیکم، ڈر کے پورے اسٹاف اور تمام قارئین کو بھی، حسب معمول آغاز ڈر کے ٹائٹل سے جو کہ نہایت خوب صورت ہوتا جا رہا ہے اور ہماری دعائیں شمارے کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے شکریہ کہ آپ نے غزل، لطائف شامل کئے۔ کہانیوں میں قسط وار رولوکا Good رہی، بلیک ٹائیگر، سنہری تابوت بھی ٹھیک ہی تھی، سنگل اسٹوری میں درتوبہ ملتی جلتی کہانی ہے۔ خونی سفر، آخری دعا، قبر، موت کی سختی، خونی مردے، موت کی مسکراہٹ، Good رہی اور قوس قزح میں پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی، ایس امتیاز کراچی، ساجدہ راجہ، اسلم جاوید کی غزلیں اچھی لگیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ عظیم صاحب: صاحب خلوص دل سے خلوص نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ ماہ بھی ڈرڈائجسٹ کو یاد کر کے نوازش نامہ بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔

☆☆☆

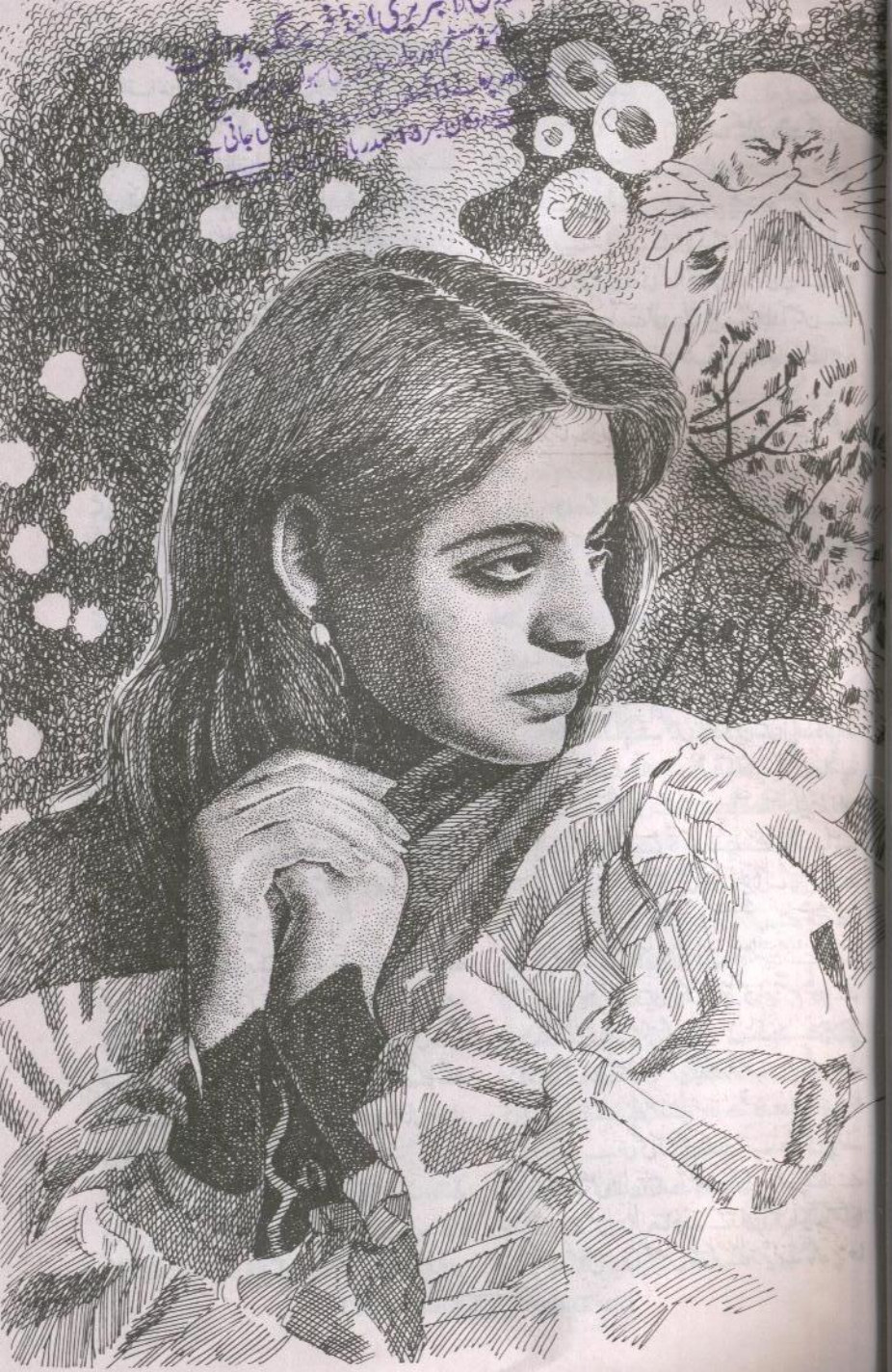

نیو وکی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید وفروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

بیلی

انوری رمضان۔پنڈدادنخان

خوبرو حسینہ نے اپنے مہمانوں کی بہت ھی خاطر تواضع کی، ان کا ھر طرح کا خیال رکھا، مگر اس حسینہ کی چال ڈھال سے لگتا تھا کہ کچھ پراسراریت ھے ضرور مگر پھر ایک مقام آیا کہ وہ اچانک ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

خوف وہراس کے گرداب میں بل کھاتی ہوئی اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ معمولات زندگی رواں دواں تھی۔ مصروف شاہراہ پر دھواں چھوڑتی گاڑیاں فضائی آلودگی کا سبب بن رہی تھیں۔ ٹریفک کے ہجوم کی بناء پر بار بار سرخ سگنل آن ہو جاتا اور فضا میں گھٹن کا احساس مزید بڑھ جاتا۔ اونچی عمارتوں کے اوپر کالا دھواں منڈلا رہا تھا۔

وہ ایک عظیم الشان عمارت تھی۔ جہاں سے ہر مہینے ایک بار میگزین نکلا کرتا تھا۔ اس میگزین نے ملک بھر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ ہر کوئی اس میگزین کا دیوانہ نظر آتا تھا۔ میگزین کی بھرپور اشاعت میں جہاں عملے کا ہاتھ تھا وہیں رائٹرز کو بھی کریڈٹ جاتا تھا جو خوفناک کہانیاں لکھنے میں دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ انہی رائٹرز کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اس دفتر میں چند روز سے چہ میگوئیاں جاری تھی۔

”دیکھئے جمال صاحب! یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد فیصلہ ہے ہمارے ملک کے تمام طباعتی اور اشاعتی اداروں میں آج تک ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا، کیونکہ اس پر بہت اخراجات اٹھتے ہیں۔ آج تک کسی بھی رسالے کے رائٹرز کو ایسا خراج تحسین پیش نہیں کیا جا سکا، جیسا ہم کرنے جا رہے ہیں۔“ میگزین کے چیف ایڈیٹر مختار صاحب اپنے پلان کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔

”اوکے...... یہ پاسبل ہو سکتا ہے، مگر کیا ہمارے رائٹرز اتنی دور دور سے آسکیں گے؟“ جمال صاحب نے بھنوئیں اچکائیں۔

”یس سر...... جب وہ اتنی دور دور سے ہمارے میگزین کیلئے مواد بھیج سکتے ہیں تو پھر ہمارے بلانے پر وہ آئیں گے بھی......“ مختار صاحب نے کہا۔

”دیٹ، اٹس کلیئر...... آپ زاہد سے مل کر مزید پلان ترتیب دے لیں اور اس پلان پر جتنے بھی اخراجات اٹھتے ہیں۔ انہیں ہمارے کیشئر ایگزیکٹو سے ڈسکس کرلیں۔“ جمال صاحب نے کہا اور فون پر نمبر ملا کر کسی سے بات کرنے لگے وہ بہت مصروف شخصیت تھے۔ ان سے بس اتنا ہی ٹائم لیا جا سکتا تھا، چنانچہ مختار صاحب اٹھ کر روم سے باہر آگئے۔ اب ان کا رخ میٹنگ روم کی جانب تھا۔

وہ پارک میں بچوں کیساتھ فٹبال کھیل رہی تھی ۔ ٹریک سوٹ پہنے، بالوں کو اونچی پونی ٹیل میں قید کیے، اپنے پیروں کو جوگرز مین قید کیے، جب وہ فٹبال کو کک لگاتی تو وہ اڑتا ہوا دور جا گرتا اور سارے بچے بال کے پیچھے لپکتے۔ تبھی وہ اپنی اسپورٹس کیپ اتار کر خوشی سے اونچی اونچی چھلانگیں لگاتی شام کے دھند لکے پھیل گئے تھے ۔ تھک ہار کر اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور کار میں آبیٹھی ۔ اس کا گھر کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے روم میں بیٹھی آئس کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب اس کا بھائی ہاتھ میں خاکی رنگ کا لفافہ تھامے آدھمکا۔

"یہ دیکھو افشاں! ہمارے محبوب رسالے نے ہمیں انوائٹ کیا ہے، جہاں پر ہمیں کچھ تاریخی جگہیں دکھائی جائیں گی۔ سجاد حسین نے خاکی لفافہ افشاں کی طرف بڑھایا۔

"اوہ انٹریلی.....؟ پھر تو صباء کو بھی انوائٹ کیا ہوگا۔" افشاں کا چہرہ خوشی کے مارے چمکنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں صباء کا فون آ گیا اور وہ بھی خود کو ملنے والے دعوت نامے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

یہ ایک بڑی کوٹھی کا روشن سا کمرہ تھا۔ پوری کوٹھی میں برطانیہ سے منگوائی گئی ٹائلز نصب تھیں۔ تمام در و دیوار شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔ گیٹ پر چوکیدار دو خوفناک کتوں کیساتھ کھڑا تھا۔ حد نظر تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ایک نہایت خوبصورت باغ جس کے بیچ میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی اسی شاندار کوٹھی کا وہ ایک نہایت خوبصورت اور سجا سجایا کمرہ تھا جس کے وسط میں بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایس حبیب خان ایک خاکی رنگ کا لفافہ ہاتھ میں پکڑے سو رہی تھیں۔ اسے ایک میگزین کی طرف سے بطور لکھاری انوائٹ کیا گیا تھا۔

"عامر بھائی..... عامر بھائی..... یہ دیکھیں، ڈاکیہ آپ کیلئے کچھ دے گیا ہے۔" عامر کا چھوٹا بھائی چلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عامر نے خاکی رنگ کا کاغذ پھاڑا۔ اندر سے ایک دعوت نامہ برآمد ہوا۔ جس پر سنہری حروف میں مسٹر عامر کا نام درج تھا۔ اس کے علاوہ دیگر رائٹرز کا نام بھی درج تھا۔ جنہیں اس دعوت میں مدعو کیا گیا تھا۔ مدعو کئے گئے رائٹرز میں بہت سارے رائٹرز تھے انکے علاوہ افشاں، صباء اور سجاد شامل تھے۔

"سر آپ کا نہیں خیال؟ کہ سورج غروب ہوتے ہی سفر شروع کر کے ہم نے تھوڑی سی غلطی کی ہے۔" مدعو کئے گئے رائٹرز اب وین میں سوار اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر رواں دواں تھے۔ وین میں پھیلی خاموشی کے لہب سکوت کو ساجدہ نے توڑا تھا۔

"دیکھیں بھئی..... اس پکنک کیلئے وقت بھی تو مناسب ہی ہونا چاہیے ناں....." مختار صاحب نے کھڑکی کے شیشے کے پار گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے سر! آپ کے اس نئے اور اچھوتے خیال نے ہمارے بیچ مزید دوستی کرادی ہے اور اسی بہانے ہم سب ایک دوسرے سے مل لئے ہیں۔" سجاد حسین نے چپس کا پیکٹ ناصر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، جسے ناصر نے ایک پل میں پکڑ لیا۔

یہ ایک عجیب سا خوفناک راستہ تھا۔ فضاء میں جنگلی پودوں اور گوبر کی بو رچی بسی تھی۔ دن میں پتہ نہیں یہاں کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ دفعتاً ہی وین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور تمام رائٹرز ہی چلتی وین میں کھڑے ہو گئے۔ وین کے لیڈیز پورشن میں ماحول زیادہ پرتشویش تھا۔ جہاں افشاں، ساجدہ، اور صباء وغیرہ خوب چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ سنبل اور عروج نسبتاً بہادر طبیعت ہونے کے باعث انہیں سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔

ہوا یہ تھا کہ اچانک کہیں سے وین میں ایک کالا اور سفید دھاری دار بہت بڑا سانپ نکل آیا تھا۔ یہ جنگلی سانپ یقیناً وین کے کھلے شیشوں سے اندر آیا ہوگا حالانکہ ایڈیٹر زاہد انہیں بار بار شیشے بند کرنے کا کہہ رہے تھے کیونکہ یہ ایک گھنا جنگل تھا جہاں سے کبھی بھی کوئی خطرناک چیز حملہ آور ہو سکتی تھی مگر رائٹرز نے انجوائمنٹ کی غرض سے شیشے بند کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اب وہ بھگت رہے تھے۔

ڈرائیور نے وین روک دی تھی پر ہنگم شور کے باعث ناگ بری طرح بپھر گیا تھا اور اس کے منہ سے تیز تیز پھنکاریں نکل رہی تھیں، ناصر، سجاد اور عامر اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بے سود..... قسمت ان سب کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی کہ ابھی تک سانپ نے کسی پر حملہ نہیں کیا تھا۔ بس لال انگارہ آنکھوں کے ساتھ پھنکارے جا رہا تھا اتنے میں جمال صاحب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھا

۔اس کے بعد انہوں نے تمام ہمت جمع کر کے ہاتھ سانپ کی سمت بڑھائے اور اسے اٹھا کر پوری قوت سے شیشے سے باہر پھینک دیا۔

سانپ اس اچانک افتاد پر گھبرا سا گیا تھا۔

"شیشے اوپر چڑھائیں سب..... ہری اپ....." مختار صاحب نے اپنی جانب کا شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے، اونچی آواز میں چیخ کر سب سے کہا۔

"ڈرائیور نے وین روک دی ہے۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ چلو سب اترتے ہیں۔" صباء نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ساجدہ سے کہا۔

"یہاں سے اتروگی تو مزید مصیبت میں پھنسو گی۔ اس گھنے جنگل میں اتر کر کہاں جاؤ گی تم؟" ساجدہ نے صباء کو رسائی سے سمجھایا۔ اتنے میں وین کے لیڈیز پورشن میں ناصر داخل ہوئے اور بولے۔

"لیجئے سانپ! ناگ کو سر جمال نے باہر پھینک دیا ہے۔ اب آپ لوگ اطمینان سے رہیں اور وین کے تمام شیشے بند رکھیں۔ اتنا ذہن میں رکھیں کہ آپ سب تک کوئی بھی مشکل ڈائریکٹ نہیں آئے گی کیونکہ کسی بھی مشکل کو آپ لوگوں تک پہنچنے کیلئے، ہم سے لڑنا ہوگا۔ ناصر سب خواتین رائٹرز کو سمجھانے کیلئے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

سجاد نے ناصر کے پیچھے سے سر نکالا اور بولے۔

"بی کاز! وی آر ہارر میگزین فیملی۔" سجاد کے اس جملے پر سبھی ہنس پڑے اور اپنی اپنی سیٹوں پر واپس چلے گئے۔ وین ایک بار پھر چل پڑی تھی۔

"ابھی ابھی سجاد بھائی نے بولا ہے کہ، وی آر ہارر میگزین فیملی۔ وی کے آخر میں تو اتنے میں افشاں رمضان اپنی سیٹ سے کھڑی ہوئیں اور ہینڈلز وغیرہ پکڑتی ہوئی لیڈیز پورشن سے باہر آنے لگی۔ سبھی رائٹرز گردن موڑ موڑ کر افشاں کو دیکھ رہے تھے بالآخر افشاں ایڈیٹر صاحب کی سیٹ کے پاس جا کر رک گئی اور بولی۔

"سر! میری ایک بات مانیں گے؟" افشاں بہت سیریس لگ رہی تھی۔

"جی بولیں! ازآر ایوری تھنگ آل رائٹ؟" ایڈیٹر صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھے۔ فوراً سر اٹھا کر جواب دیا۔

"سر جی! ڈرائیور سے کہہ کر وین جلدی رکوائیں۔ مجھے لگتا ہے، جب سر جمال نے سانپ کو باہر پھینکا تھا، تو وہ سیدھا جا کر کسی راہگیر پر گرا تھا۔ کسی کی جان جا سکتی ہے سر پلیز اسٹاپ دی وین۔" افشاں نہایت فکرمندی سے بول رہی تھی۔

"مگر..... اس ویرانے میں کسی راہگیر کا کیا کام؟ اٹ از امپاسبل۔"

"کوئی راہگیر ہو سکتا ہے سر، ہماری کہانیوں میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" عثمان نے پیپسی کا ٹین کھولتے ہوئے کہا۔ جس پر ایڈیٹر صاحب نے اکتفا میں سر ہلایا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وین ایکبار پھر رک گئی اور سب سے پہلے میگزین کا اسٹاف نیچے اترا یکے بعد دیگرے بھی نیچے اتر آئے۔ افشاں متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، کیونکہ اندھیرا بہت تھا۔ اتنے میں صفدر نے اپنے کندھے پر لٹکے سفری بیگ سے ایک بڑی سی ٹارچ نکالی اور یوں اب کچھ فاصلے پر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

"سردی کافی بڑھ گئی ہے۔" سنبل نے اپنے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ جس پر ساجدہ نے اپنی گرم اونی شال سنبل کے کندھوں پر ڈال دی۔

"ساجدہ یار! تمہیں بھی تو سردی....." ساجدہ نے سنبل کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کچھ کہنے سے روک دیا اور اپنے ریڈ کلر کے اوور کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ جس نے ساجدہ کو سرتاپا مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ سنبل مسکرا کر رہ گئی۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" عامر ارد گرد گھنی جھاڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"ون منٹ....." چیف ایڈیٹر نے چونک کر کہا..... "میں وہاں کچھ دیکھ سکتا ہوں۔" مینجنگ ایڈیٹر کی گواہی میں انہوں نے اپنے قدم آگے کی جانب بڑھا دیئے۔ باقی سب لوگ بھی ساتھ چل دیئے۔

"افشاں صاحبہ! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں

"ایڈیٹر صاحب نے ٹارچ کی لائٹ گھنے درخت کے نیچے پڑی بے جان سی لاش پر ڈالی۔ افشاں اس لاش کو دیکھ کر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر بے اختیار پیچھے کو ہٹی تھی۔ کرن نے ایک دم ہی عروج کا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ صباء بھی کافی خوفزدہ نظر آرہی تھیں۔ ناصر، عامر، سجاد اور عثمان بھی ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رات اب اپنے دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ درختوں پر بیٹھے جنگلی پرندے اپنے پروں میں سر دیئے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

"اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟" سنبل نے لاش کے ہاتھ کی طرف توجہ دلائی۔

"یہ کوئی سیاہ رنگ کا تھیلا لگتا ہے۔ مگر اس میں کیا ہوسکتا ہے؟" عامر نے لاش کے پاس جانے کی کوشش کی مگر ایڈیٹر صاحب نے انہیں روکنے کا اشارہ کر دیا۔

"عامر! آپ کو تھیلے کی فکر لگی ہوئی ہے حالانکہ ہمیں افسوس کرنا چاہیے کہ ہم اس بے چارے آدمی کو بچا نہیں سکے۔ بہت زہریلا سانپ تھا۔ اس کے منہ اور ناک سے کیسا نیلا نیلا جھاگ نکل رہا ہے۔" افشاں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"بہت ظالم سانپ تھا کہیں نظر بھی نہیں آرہا۔" ناصر نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔

"نظر کہاں سے آتا بھائی؟ اس کی موت تھی ڈس کر غائب ہوگیا۔" سجاد نے کہا۔

"یہ بدنصیب نجانے کہاں سے آرہا ہوگا؟" نیچنگ ایڈیٹر افسوس کر رہے تھے۔

"اب کیا کریں؟ اسے بے یارومددگار چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے۔" عروج نے درخت پر بیٹھے الو سے نظریں ہٹا کر لاش کی طرف دیکھا۔

"کوئی اتا پتا بھی نہیں ہے۔ جیب دیکھو اس کی ..... شاید کوئی کاغذ وغیرہ نکل آئے"۔

چیف ایڈیٹر نے عثمان سے کہا مگر عثمان اپنی جگہ بدستور کھڑے رہے۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے سر! کیسا گندا پانی ناک اور منہ سے نکل رہا ہے۔ توبہ میرے خدا..... کیسا زہریلا سانپ تھا۔" عثمان نے کانوں کو ہاتھوں لگایا۔

نیچنگ ایڈیٹر اپنے اس ہاتھ کو دیکھنے لگے۔ جس سے پکڑ کر انہوں نے سانپ کو باہر نکالا تھا۔ تبھی ایڈیٹر زاہد بولے تھے۔

"آپ کے ہاتھ کو کچھ نہیں ہوا سر یہ بس اس شخص کی موت تھی۔"

"ہمیں بہر حال اس کا تھیلا چیک کرنا چاہیے۔ شاید کوئی ایڈریس نکل آئے۔" اسٹاف اور تمام رائٹرز کی رضامندی پاکر سجاد نے ہاتھوں پر گلوز چڑھائے اور لاش کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ تھیلے کا منہ کھولا تو اندر سے بندھا ہوا ایک کمبل تھا۔ رسی اتار کر جب کمبل کو کھولا۔ تو سجاد کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہے اس میں؟" چیف ایڈیٹر جلدی سے آگے بڑھے پھر جو کچھ انہوں نے دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ کسی عورت کی کہنی سے کٹا ہوا ہاتھ تھا۔ جس میں سونے کی بہت ساری چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ اور بازو سوجا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو سونے کی موٹی موٹی بالیاں بھی تھیں جن سے گوشت کے باریک لوتھڑے چپکے ہوئے تھے اور خون ابھی بھی بہہ رہا تھا۔

وہ ایک لٹیرا تھا جو اس وقت اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

"شاید یہ کم بخت چوڑیاں اتارنے کی کوشش میں ناکام ہوکر کہنی سے بازو ہی کاٹ لایا تھا۔" ساجدہ معاملہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو بالیوں کی بھی یہی صورتحال لگ رہی ہے۔" صباء نے مبالغہ آرائی کی۔

"اتنا شقی القلب انسان..... اللہ نے دنیا میں ہی اس کو سزا دے دی۔" مابین گویا ہوئیں۔

"اگر یہ شخص زندہ میرے ہاتھ آجاتا تو میں اس کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیتا۔" عثمان نے غصے کے مارے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"سر جی! دیکھیں، اللہ نے خود ہی اس کو سزا دے دی ہے۔" صباء ٹھنڈی سی آہ بھر کر بولیں۔

"جی بالکل!" نیچنگ ایڈیٹر گویا ہوئے۔

"لوگ کہتے ہیں، اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ..... کیا معلوم؟ وہ مظلوم عورت کتنی نیک ہو یا شاید ابھی وہ زندہ ہو اور یہ ظالم زندہ کا ہی باز وکاٹ لایا ہو۔" ایڈیٹر صاحب کے لہجے میں بے پناہ تاسف تھا۔

"اب اس کا کیا کریں سر؟" سنبل اپنے شولڈر بیگ کو سنبھالتے ہوئے تمکنت سے بولی۔

"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھنا شروع کریں۔ سجاد اور عامر..... آپ لوگ اس کی لاش کو اٹھا کر ادھر جھاڑیوں میں پھینک دیں۔ یہ قبر کے قابل بھی نہیں ہے۔"

"کیوں سر؟"

ساجدہ نے تائید چاہی جس پر ایڈیٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سجاد اور عامر لاش کی طرف بڑھے جبکہ باقی لوگوں نے وین کی طرف قدم بڑھائے کچھ ہی دیر بعد سب لوگ وین میں اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ اور ڈرائیور وین اسٹارٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا مگر وین اسٹارٹ ہونے کا نام تک نہ لے رہی تھی۔

ڈرائیور بونٹ کھول کر کچھ چیک کرنے لگا اس کے بعد وہ ادھر ادھر لاچار نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اس میں کوئی خرابی ہوگئی ہے شاید مگر کیا خرابی ہوئی ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آرہی۔"

ڈرائیور نے تھک ہار کر بونٹ بند کر دیا۔ سبھی فق چہرہ لئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا کوئی نئی افتاد انکی منتظر تھی۔ اتنے گھنے جنگل میں موبائل سگنل بھی کام نہیں کر رہے تھے۔

شفاف آسمان پر چاند موجود تھا۔ ان کی وین سڑک کے کنارے کچے راستے میں درختوں اور جھاڑ جھنکار کے بیچ کھڑی تھی اور وین کے عقب میں جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں شور برپا کر رہی تھیں۔ ٹھنڈ ان کی ہڈیوں کو چیرے جا رہی تھی مگر اوہ..... جان بھی کیسی پیاری چیز ہے..... وہ سب مسلسل آنکھیں کھول کر کسی متوقع آفت کے پیش نظر، خود کو نیند سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

اب رات کا دوسرا پہر دم توڑنے کو تھا۔ آسمان پر ہر سو تارے نکل آئے تھے۔ زرد زرد بجھا سا چاند، ایکدم غیر یقینی طور پر مکمل روشن ہو چکا تھا۔ چاند کی اچانک عود کر آنیوالی روشنی، درختوں کے پتوں کو چمکا رہی تھی۔ وہ جنگل کے درخت تھے۔ مضبوط..... تناور..... اونچے اور اتنے گھنے کہ چاندنی گھاس کو چھو نہیں پا رہی تھی۔ ان درختوں کے سائے، درختوں کے بیچ بنی شاہراہ پر لمبے گر رہے تھے۔ اتنے میں دور سے آنیوالی آوازوں نے ماحول میں ارتعاش پیدا کرنا شروع کر دیا، یہ کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں تھیں۔ ایسے میں..... سب جانور بھی خاموش ہوگئے تھے۔ ٹاپوں کی آوازیں سناٹے کی چادروں کو چیرنے لگی تھیں۔

وین میں موجود سبھی لوگ گردنیں موڑ موڑ کر عقب سے آنے والی ٹاپوں کی آوازوں کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں امید کے دیئے بھی ٹمٹمانا شروع ہوگئے تھے کہ شاید ان کے لئے کوئی مدد کا فرشتہ آرہا ہے۔

دونوں اطراف سے جنگل کے بیچ گھری کچی پکی سڑک پر ایک بگھی دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ بگھی ساگوان کی تھی..... اس میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ چکنے چکنے سفید سے گھوڑے..... ان کے منہ پر لال ریشمی رومال اور بدن پر چم چم کرتی جھالر کی پٹیاں تھیں بگھی کے اونچے دروازے سختی سے بند تھے۔ "داؤ....." صباء رمضان کے منہ سے اچانک نکلا۔

"اس میں کون ہوسکتا ہے؟" عروج کی جانب سے سوال ابھرا۔

"اس کے اندر تو کوئی شہزادی ہی ہوسکتی ہے"۔ افشاں نے بسکٹ منہ میں دبایا۔

"اب اس کے اوپر تم کوئی کہانی مت لکھ دینا" افشاں، ساجدہ نے ہنستے ہوئے افشاں کے ہاتھ میں پکڑے بسکٹ کے پیکٹ سے ایک بسکٹ لیا۔

"کہہ تو ایسے رہی ہو ساجدہ، جیسے یہ افشاں نہیں، بلکہ کوئی ایسا ہو جسے بس کہانی لکھنے کا شوق ہے چاہے آئیڈیا

ملے نہ ملے..... سنبل کے کہنے پر سبھی لڑکیوں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

گھنے جنگل کے بھاگتے درخت بگھی اور وین میں فاصلہ مسلسل کم کرتے جارہے تھے۔ درختوں پر بیٹھے ،پروں میں سر دیئے پرندے سہمی سہمی نظروں سے بگھی کو دیکھ رہے تھے۔

''ہمیں ہر طرح کی صورتحال کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ اس بگھی کی آمد ہمارے لئے فائدہ مند ہی ہو۔'' چیف ایڈیٹر نے ریوالور ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''ہوسکتا ہے! یہ کوئی چور اچکے ہوں۔'' ناصر نے اپنا خیال پیش کیا۔

''چور اچکے بگھی میں نہیں آتے ناصر صاحب۔'' ایڈیٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے ناصر کے خیال کی نفی کی اب اسٹاف اور سبھی لڑکے مکمل طور پر چوکنا ہوکر بیٹھ گئے تھے۔

''اگر وہ کوئی خطرناک لوگ ہوئے تو یہ چلے گی کیا؟'' عثمان نے بیگ سے غلیل نکالی۔

''چلے گی نہیں میرے بھائی! دوڑے گی..... ان فیکٹ وہ لوگ اس قبل مسیح کی غلیل کی دہشت سے ہی بے ہوش ہوجائیں گے۔'' سجاد نے ہنستے ہوئے عثمان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا جبکہ عثمان نے مایوس ہوکر غلیل واپس بیگ میں ڈال لی تھی۔

بگھی برق رفتاری سے سڑک کے بیچوں بیچ بھاگتی چلی آرہی تھی بگھی کے عین سامنے کے رخ پر ایک چھت کی لکڑی تھی۔ جس کے اوپر دھات کا بڑا سا پیالہ لگا ہوا تھا۔ اس پیالے کے اندر آگ کا چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ جو راستہ دکھانے کا باعث بن رہا تھا۔

بگھی اب انتہائی قریب آگئی تھی۔ چیف ایڈیٹر صاحب سب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی ڈرائیور دروازہ کھول کر وین سے اتر آیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی مینجنگ ایڈیٹر اور ایڈیٹر زاہد بھی وین سے نیچے اتر آئے کیونکہ وہ اپنے کسی بھی ساتھی کو مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ لڑکوں نے بھی ساتھ آنیکی کوشش کی مگر انہیں سختی سے روک دیا گیا اور اب وہ اپنی اپنی طرف کے شیشے نیچے اتارے بگھی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

وین کے لیڈیز پورشن میں لڑکیوں کا بھی یہی حال تھا۔

بگھی اب وین کے عین سامنے آکر رک گئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر یہ اب تک بغیر کسی کوچوان کے چلی آرہی تھی بگھی کا دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے کم خواب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک سفید ہاتھ باہر نکلا اور پردہ ہٹادیا۔ اسٹاف کے تمام ارکان دم سادھے کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار تھے اور ہمہ تن گوش تھے۔

اس مدھم سی روشنی میں بگھی کے اندر کا منظر اب بالکل واضح تھا۔

وہ کوئی کم عمر لڑکی تھی۔ جو اندر لال مخملی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی میکسی زیب تن کررکھی تھی جو پاؤں تک آرہی تھی۔ پاؤں میں نازک سی کولہاپوری چپل تھی۔ جس کے اوپر سنہری پتھر اجڑے تھے میکسی کی چوڑی دار تنگ آستینیں کلائیوں تک آرہی تھیں۔ اس کے سفید ہاتھ دودھ میں دھلے تھے اور مخروطی انگلیاں ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین تھیں ہاتھوں کے نیچے بڑا سا سفید بیبٹ رکھا تھا۔ لباس کا گھاٹ کھلا تھا۔ جس کی وجہ سے راج ہنس کی سی لمبی گردن صاف نظر آرہی تھی۔ جس سے ہیروں کا ایک نازک سا ہار چپکا ہوا تھا۔

اٹھی ہوئی ٹھوڑی، نازک سی ناک، موم کی سی گوری جلد..... گلاب کی سی دلکشی لئے ہونٹ، جن پہ سرخی لگی تھی۔ سنہری مائل بھورے بال، جو اکھٹے کرکے بائیں کندھے پر ڈالے گئے تھے۔ بڑی بڑی سنہری آنکھیں، جن کے گرد کا جل کا موٹا حاشیہ کھینچا گیا تھا۔ گہرائی میں ڈوبی آنکھوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا، جیسے گہرے سیاہ پانیوں میں سورج جھلملا رہا ہو۔

دفعتاً ہی حسن و دلکشی کی مورت میں حرکت سی پیدا ہوئی اور اس نے اپنے نازک سے سفید پاؤں نیچے زمین پر

اتارے۔ جنگل کی یہ بنجر زمین کسی طور بھی اس کے پیروں کے قابل نہیں لگ رہی تھی۔

وین میں سے، شیشوں سے جھانکتے سبھی رائٹرز کے منہ مارے حیرت کے کھلے ہوئے تھے۔ آج تک وہ ہزاروں کہانیوں کے تانے بانے بنتے آئے تھے مگر یہ کہانی انہیں بالکل نئی لگ رہی تھی۔

اسٹاف کے ارکان ابھی بگھی میں سے مزید افراد کے نکلنے کی توقع کررہے تھے مگر اس لڑکی کے نکلتے ہی دروازہ خود بخود بند ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے بگھی اڑن چھو ہوگئی۔ اب وہ اسٹاف کے سامنے بالکل ساکت کھڑی تھی۔

ایڈیٹر نے وین کے لیڈیز پورشن کے شیشے پر دستک دی۔ عروج نے آگے بڑھ کر شیشہ نیچے کیا تو انہوں نے بھی گرلز کو وین سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تاکہ اس اجنبی لڑکی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ لڑکیاں اب وین سے باہر آگئی تھیں۔ رائٹرز بھی کہاں کسی سے چھپے رہنے والے تھے؟ چنانچہ بغیر اجازت لئے وہ بھی وین سے باہر آدھمکے تھے۔

''آپ کون ہیں؟ اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' مینجنگ ایڈیٹر نے سکوت کو توڑا تھا۔

''یہ سوال تو ہمیں آپ سے کرنا چاہیے۔'' رعب حسن سے مخمود لڑکی نے گردن اکڑا کر کہا تھا۔

''دیکھیں جی! ہم سب رائٹرز ہیں اور یہ ہمارے میگزین کا اسٹاف ہے۔ ہم لوگ پکنک کی غرض سے نکلے تھے مگر اب گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ اور ہم اس جنگل میں قید ہوگئے ہیں۔'' صباء آگے بڑھ کر تفصیل سے اسے سمجھا رہی تھی۔ جبکہ وہ لڑکی اپنی سنہری مائل آنکھوں سے، اونچا سا پونی ٹیل جھلاتی اور قرینے سے بات کرتی صباء کو یکلخت دیکھے جارہی تھی۔

''تو آپ پریشان کیوں ہیں؟ یہاں سے ناک کی سیدھ میں چلتے جائیں کچھ ہی فاصلے پر ہمارا آشیانہ ہے۔ اس کی بالائی منزل پر آپ بخوشی رات بسر کرسکتے ہیں جیسے ہی اجالا پھیلے گا آپ لوگ یہاں سے چلے جائیے گا۔'' لڑکی نے شان بے نیازی سے کہا اور بغیر جواب کا انتظار کیئے۔ چلتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں جا کر غائب ہوگئی۔

''یہ کیا چیز تھی؟'' عامر جیسے اب ہوش میں آئے تھے۔

''ویسے عامر بھائی! آپ نے نوٹ کیا، کہ اس لڑکی کی آنکھوں کا کلر افشاں اور صباء سے کتنا ملتا جلتا تھا؟'' سنبل حیرت سے بولی۔

ہاں..... اور شاید اسی لئے وہ لڑکی صباء کو گھورے جارہی تھی کہ کہیں اس نے میری آنکھیں تو نہیں چرالیں۔ عامر چیونگم چباتے ہوئے بولا۔

''اصل میں یہ ہماری خاندانی آنکھیں ہیں۔'' سجاد حسین نے بال سیٹ کرکے اپنے کالر کھڑے کئے اور عامر کی طرف سے اپنی طرف اچھالی گئی چیونگم کیچ کی۔

''تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ لڑکی بھی آپ کے خاندان کی ہی تھی۔'' عروج اپنے بالوں کو پونی میں باندھتے ہوئے بولی۔

''ناں باباناں..... اللہ نہ کرے۔'' افشاں نے

والدین کا پیغام

1- جس دن تم ہمیں بوڑھا دیکھو صبر کرنا اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔

2- جب ہم کوئی بات بھول جائیں تو ہم پر طنز نہ کرنا اور اپنا بچپن یاد کرنا۔

3- جب ہم بوڑھے ہو کے چل نہ پائیں تو ہمارا سہارا بننا، اور اپنا پہلا قدم یاد رکھنا۔

4- جب ہم بیمار ہوں تو وہ دن یاد کر کے ہم پر اپنے پیسے خرچ کرنا جب ہم تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی خواہشیں قربان کرتے تھے۔

(عامر ملک- ٹنڈو آدم)

ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

"ویسے اسکا حسن و جمال تو بتا رہا تھا کہ وہ ہمارے ہی خاندان کی تھی۔" ساجدہ نے شان سے بے یاری سے اس لڑکی کے سے انداز میں کہا تو سبھی ہنسنے لگے۔ اتنے میں انہیں صفدر حسین کی آواز سنائی دی۔

"میرے خیال میں تو ہمیں اس لڑکی کے بتائے گئے راستے پر چلنا چاہیے کیونکہ رات اس طرح سے وین میں نہیں گزاری جاسکتی۔ اتنے گھنے جنگل میں ہاتھی جیسے جانوروں کا ہونا کچھ بعید نہیں ہے اور ایسے جانوروں کے آگے ہماری وین کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔" صفدر حسین کی رائے کو سبھی نے سراہا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بیگ کندھوں پر لٹکائے ناک کی سیدھ میں رواں دواں تھے۔

ابھی انہوں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ انہیں اپنے دائیں طرف والی جھاڑیوں میں شدید حرکت کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتحال سمجھتے جھاڑیوں سے ایک خونخوار ریچھ برآمد ہوا۔ وہ اپنی کہنیاں موڑے ہوئے انہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بلب کی مانند چمک رہی تھیں۔ سبھی لوگوں میں ایکدم ہلچل سی مچ گئی اور انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ انہیں بھاگتا دیکھ کر ریچھ مزید تاؤ میں آگیا اور وہ منہ سے غراہٹیں نکالتا ہوا ان کے پیچھے پل پڑا۔

لڑکیوں کے منہ سے تو چیخیں بھی نکل رہی تھیں۔ افراتفری میں بھاگتے ہوئے ان کے پیروں سے جوتے تک نکل گئے تھے اور کچھ ننگے پاؤں بھاگ رہی تھیں۔

"مختار! اپنا ریوالور نکالیں۔" فیچنگ ایڈیٹر نے سرعت سے کہا جس پر چیف ایڈیٹر نے اپنا ریوالور بیگ سے نکالا۔ مگر ان کے کانپتے ہاتھ عقب سے آتے ریچھ پر فائر کرنے سے انکاری تھے۔ ان کا سانس بھاگنے کی وجہ سے پھولا ہوا تھا۔

تھکے ہارے یہ انسان آخر کتنا بھاگ سکتے تھے؟ ریچھ میں اور ان میں فاصلہ مسلسل کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایڈیٹر زاہد نے ریوالور اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹریگر پر انگلی رکھی۔

ان کا نشانہ خطا بھی ہوسکتا تھا مگر اپنے لوگوں کے تحفظ کیلئے وہ یہ رسک لینے کو تیار تھے۔

بالآخر آنکھیں بند کر کے انہوں نے بسم اللہ پڑھی اور ٹریگر دبا دیا۔ جنگل کی پرسکوت فضاء ایکدم چنگھاڑ اٹھی۔ اس کا فائر کامیاب گیا تھا۔ ریچھ کی ٹانگ شدید زخمی ہوگئی تھی اور وہ وہیں بیٹھا کراہ رہا تھا۔ سب کے دوڑتے قدموں کو اچانک بریک لگ گیا۔ ان کے سانس بری طرح سے پھولے ہوئے تھے۔

"اب اور نہیں چلا جا رہا مجھ سے..... میں بہت تھک گئی ہوں۔" ساجدہ روہانسی ہوگئیں۔

"ہم لوگ بھی بہت تھک گئے ہیں۔" ناصر اور سجاد بھی وہیں بیٹھ گئے تھے۔

اب کسی کو مزید چلنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میرے خیال میں یہ وہی جگہ ہے جہاں ہم آنا چاہ رہے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے ایک خستہ حال مکان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ایک دو منزلہ مکان تھا جو آدھے سے زیادہ جالوں سے اٹا پڑا تھا اس کے در و دیوار برسوں پر محیط کوئی کہانی سنا رہے تھے، جو ابھی بالکل سمجھ سے باہر تھی جگہ جگہ چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ابھی وہ مکان کے اندر جانے پر غور کر رہے تھے، کہ سورج نے ہولے ہولے افق سے سر نکالنا شروع کر دیا۔ جنگل کی ہر چیز صبح کے اجالوں میں ڈوبنے لگی تھی۔ انہوں نے اس جنگل میں پوری رات گزار دی تھی اور وہ اندازہ بھی نہ کر پائے تھے صبح کی روشنی نے ان کے اندر نئی ہمت اور نئے حوصلے بھرنا شروع کر دیئے تھے، سب ایک بار پھر سے تازہ دم ہوگئے تھے۔

وہ چاہتے تو واپس لوٹ سکتے تھے مگر تجسس سب کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس مکان کے اندر داخل ہونے کی ٹھان لی۔

"ہمارا ارادہ تھا کہ درختوں کے نیچے دسترخوان بچھا کر کچھ کھائیں پئیں گے اور بس..... واپس چل پڑیں گے مگر شاید قسمت ہمیں کچھ اور دکھانا چاہتی ہے۔" چیف ایڈیٹر صاحب نے پھیلتی دھوپ کے پیش نظر گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔ تیز دھوپ سے انہیں الرجی ہوتی تھی۔

مکان کے گرد سے اٹے دونوں کواڑ بند تھے۔ سب سے آگے عامر تھے جونہی عامر نے اندر قدم رکھا۔ کوئی بڑی سی شے برق رفتاری سے آکر ان کے گلے لگ گئی۔ عامر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور نیچے زمین پر گر گئے۔ عامر پر حملہ آور وہ کوئی انسان ہی تھا۔ جس کے بال میل کی زیادتی کے باعث آپس میں بری طرح چپکے ہوئے تھے۔ لباس بھی چیتھڑوں میں منقسم تھا۔

سجاد حسین ایک دم عامر کو بچانے کیلئے آگے بڑھے اور اس پاگل شخص کو ایک طرف دھکا دیا۔ یہ دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں اس کے علاوہ ایک پاگل نما شخص بھی تھا ان دونوں کے پیر زنجیروں میں بندھے تھے جس کی وجہ سے وہ عامر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ اب وہ سب ان دونوں پاگلوں کی پہنچ سے ہٹ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ دونوں پاگل کراہیت کی حد تک بدنما تھے۔

تہہ در تہہ جمے میل اور زخموں سے بہتی پیپ نے اس کی جلد کی اصلی رنگت چھپا دی تھی ان کے منہ سے رال ٹپک ٹپک کر منہ پر گر رہی تھی۔

بال بھی بے ترتیب لمبائی میں بڑھ کر مشانوں سے نیچے آرہے تھے، زنجیروں کے نشانات نے پیروں کو بری طرح سے خون آلود کر رکھا تھا۔ وہ تمام لوگوں کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے انہوں نے کوئی انسان صدیوں سے دیکھا نہ ہو۔ ان کی حالت عجیب تھی۔ وہ کوئی نابلدسی زبان بول رہے تھے۔ شاید وہ انسانوں کی طرح بولنا، چلنا، پھرنا اور رہنا بھول چکے تھے۔

"کیا انہیں اس لڑکی نے قید کر رکھا ہے؟" عروج نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

"پر اس نازک سی لڑکی کا ان دونوں سے کیا واسطہ ہے۔" ناصر بولے۔

"اگر وہ تجھے اتنی ہی نازک لگتی ہے تو اس جنگل سے زندہ بچ نکلنے کی دعا کرتا کہ گھر واپسی پر تو اپنی والدہ کو بات آگے بڑھانے کیلئے بھیج سکے۔" عامر مسکراتے ہوئے بولے۔

"توبہ کر یار۔" ناصر نے عامر کو کہنی ماری۔

سب کا دھیان بالائی منزل کی طرف گیا اور انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔ اوپر کی منزل دیکھ کر کسی طور پر یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی انسان کی رہائش گاہ ہے۔ اس مکان کا اندرونی نقشہ بھی عجیب سا تھا گرد آلود، قدیم طرز کا دیمک زدہ فرنیچر۔

"خود کتنا بن ٹھن کر رہتی ہے اور گھر کی حالت دیکھو۔ اگر میری امی اس لڑکی کا یہ گھر دیکھ لیں ناں۔ تو کبھی مجھے سست اور کاہل ہونے کا طعنہ نہ دیں۔" سنبل نے ٹیبل کی گرد آلود سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

یونہی گھر میں گھومنے پھرنے اور آرام کرنے میں انہوں نے پورا دن بتا دیا شام کے سائے سر پہ آئے تو احساس ہوا کہ بلبل کی طرح سارا دن انہوں نے اڑنے چگنے میں گزار دیا۔ ابھی وہ واپسی کا سوچ ہی رہے تھے کہ وہی رات والی لڑکی ان کے سامنے آگئی۔

"ہم نے آپ سے کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیے گا۔ پر آپ نہیں گئے۔ خیر..... کھانا دوسرے کمرے میں لگا دیا ہے۔ تناول کر لیجئے گا اور اس کے بعد آرام کیلئے لیٹ جائیے گا ہم بھی آرام کرنے جا رہے ہیں اور یاد رکھیے گا ہمیں اپنے آرام میں دخل بالکل پسند نہیں۔"

لڑکی نے بے اعتنا چہرے کے ساتھ کہا اور واپس چلی گئی۔

جس کمرے میں کھانا رکھا گیا تھا۔ وہ نسبتاً صاف تھا۔ کھانا اشتہار انگیز تھا۔ لذت، ہوش اڑائے جا رہی تھی۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ آرام کی غرض سے اردگرد نگاہ دوڑائی تو وہ صرف دو کمرے تھے جہاں آرام کیا جاسکتا تھا چنانچہ ایک کمرہ لڑکیوں کیلئے اور دوسرا کمرہ میگزین کے اسٹاف اور لڑکوں کے لئے مختص کیا گیا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

"سر! ہمارا ابھی سونے کا موڈ نہیں ہے ہم ذرا ارد گرد کے کمرے دیکھ کر آتے ہیں۔" ناصر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

اردگرد کے کمروں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بس یہی دو قابل استعمال کمرے تھے۔

ایڈیٹر صاحب اپنے جوتوں کے تسمے کھول رہے تھے۔

"ہم کونسا آرام کی غرض سے وہاں جارہے ہیں بس یونہی ذرا سا ٹہل کر آتے ہیں۔" عامر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سجاد کو بھی اٹھنے کا اشارہ کردیا۔

وہ تینوں اب بالائی منزل کے بائیں طرف والے کمرے میں تھے۔ جو فالتو سامان سے لبریز تھا۔ چھت سے جالے لٹک کر زمین تک آرہے تھے۔ اس کمرے کا باہر کی جانب ایک کھلا حصہ تھا، جو کسی دور میں بالکنی رہا ہوگا وہ تینوں بمشکل جگہ بنا کر چلتے ہوئے بالکنی تک آگئے۔ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا اور اس کی چاندنی میں پوری بالکنی نہائی ہوئی تھی۔ بالکنی کے ایک حصے میں بھی کچھ ٹوٹے پھوٹے ڈبے پڑے تھے۔ سجاد کانوں میں ہینڈز فری لگائے، ریلنگ پر ہاتھ ٹکائے چاندنی میں ڈوبے ہوئے جنگل کو دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں عامر کی خوشی میں ڈوبی چیخ سنائی دی۔ ناصر نے اچانک مڑ کر دیکھا تو عامر ایک ڈبہ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ یہ پانچ کلو کے گھی کا خالی کنستر تھا۔ جواب زنگ آلود ہو چکا تھا، کچھ ہی دیر بعد ناصر سجاد کو ہینڈز فری اتارنے کا اشارہ کررہا تھا۔ جبکہ عامر بالکنی کے فرش کے اوپر بکھری چیزوں کو سمیٹ کر بیٹھنے کیلئے جگہ صاف کررہا تھا۔

"کیا سن رہا تھا؟" ناصر نے سجاد کو فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خلاء میں ہونے والے دھماکے تو سننے سے رہا میں ظاہر ہے ہینڈز فری پر گانے ہی سن رہا تھا۔" سجاد اب عامر اور ناصر کے ساتھ فرش پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ چاند اب عین ان کے سامنے پڑ رہا تھا اور ان تینوں پر چاندنی چھائی ہوئی تھی۔

"کون سا گانا؟" عامر ٹین کا ڈبہ اپنے سامنے کچھ اس انداز سے رکھے بیٹھا تھا۔ جیسے عموماً رسم ڈھولکی میں ایک خاتون، ڈھولکی اپنے آگے رکھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔

"بیلیا..... فاخر کا گانا ہے۔" سجاد نے ہینڈز فری اب اتار دیا تھا۔

"چل..... پھر یہی گاتے ہیں۔ عامر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جس پر سجاد اور ناصر، نے یکے بعد دیگرے اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اب عامر بڑے ماہرانہ انداز میں ڈھولک کی تھاپ پر کنستر پر ہاتھ مار رہے تھے اور تینوں دوست، گھی کے خالی ڈبے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہم آواز ہوئے تھے۔

چاہت میں تیری پاگل
ڈھونڈوں میں تجھ کو ہر پل
ہونا چاہوں میں تیری
راہوں میں فنا!
دنیا تے جلدی مینوں
توں نیئں ملدا
بیلیا..... بیلیا.....

چاند کی روشن کرنیں بھی جیسے انکے گانے کی تال پر رقص کررہی تھیں۔ درختوں پر بیٹھے پرندے اب حیران ہوکر بالکنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں بند کرکے تینوں اپنی ہی دھن میں گائے جارہے تھے۔ گاتے گاتے جونہی ناصر نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہی سراپا قیامت کھڑی تھی۔ اس کی ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں بھاپ اڑاتے کافی کے مگ رکھے تھے۔ اس نے اپنا سفید ہیٹ سر پہ اوڑھ رکھا تھا۔ ہیٹ سے نکلتے اس کی سنہری مائل شانوں تک آتے بال..... وہ اس وقت بالکل انگریزی فلموں کی ہیروئن لگ رہی تھی۔

"وہ دیکھ! تیرا بیلیا آگیا ہے۔" سجاد نے ناصر کو کہنی ماری۔ سبھی گانا بھول کر اس لڑکی کو دیکھنے لگے تھے۔ جس کے سنہری بالوں کو ہوا اڑا رہی تھی۔ لڑکی نے اب اپنے قدم آگے بڑھائے اور ٹرے لاکر ان کے قریب رکھ دی۔ مگوں سے بھاپ تیزی سے اٹھ کر عجیب عجیب شکلیں بنا رہی تھی۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کے ساتھ ہی وہیں فرش پر بیٹھ گئی اس کی سفید میکس زمین کی گرد سے میلی ہورہی تھی۔

"لگتا ہے! یہ لڑکی بات کرنے کے موڈ میں ہے کاش عثمان بھی یہاں ہمارے ساتھ آجاتا مگر اسے تو بڑا فرمانبردار بننے کا شوق ہے ناں..... رک گیا وہیں اسٹاف

اسماء الحسنیٰ ۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہوجایا کرتی ہیں

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش
جنات کا سایہ | دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل ناکام ہوگیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

خواہش

کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔

نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان

0300-6484398

ممبرز کے ساتھ....."

ناصر نے دل ہی دل میں سوچا۔

"آپ اتنا خاموش کیوں رہتی ہیں؟" سجاد حسین نے بات کا آغاز کیا۔

"کیا یہ گھر آپ ہی کا ہے؟" ناصر نے کافی کا گرم مگ اٹھایا۔

"چلیں، یہی بتادیں کہ آپ اس ویرانے میں کیوں رہتی ہیں؟ اور نیچے کی منزل میں موجود ان دو پاگلوں سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟" عامر نے سوال داغا مگر ان تمام سوالوں کے جواب میں دوسری طرف ہنوز خاموشی برقرار تھی۔ وہ تینوں لڑکی کو بغور دیکھتے ہوئے اپنے جوابات کا انتظار کرتے رہے مگر لڑکی نظریں جھکائے خاموشی کا بت بنی بیٹھی تھی کافی دیر بعد اس نے اپنی سنہری آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ تینوں بھی اس کی تقلید میں کھڑے ہوگئے۔ لڑکی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ریلنگ کی سمت بڑھ گئی اور ریلنگ پر دونوں ہاتھ ٹکا کر وسیع جنگل کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ رات کے اس پہر چاند نے جنگل کی سبزوادی کو آغوش میں لے رکھا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے اس کی تراشیدہ لٹیں کندھوں کو چھوتی آگے پیچھے جھول رہی تھیں۔ ہوا کے دلفریب جھونکے اس کے چہرے کو چھو کر گزر رہے تھے، ایسا ہی ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کمرے کا کھلا دروازہ تیز آواز کے ساتھ بند ہوگیا ان تینوں نے تیزی سے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتے۔ لڑکی کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی وہ کچھ بول رہی تھی۔

"ان دونوں پاگلوں سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ..... بیلی کا تھا۔"

"واٹ.....؟ بیلی کون؟" تینوں بیک وقت بولے۔

"چاندنی میں ڈوبا یہ سرسبز جنگل کبھی ہنستا بستا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ وہ اس گاؤں کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ دولت نے اس کی رعنائی کو مزید جلا بخش رکھی تھی۔ لاکھوں کی جائیدا کی وہ تنہا وارث تھی۔ جب اس کے والدین ایک پراسرار بیماری سے جاں بحق ہوگئے۔ تو رشتے داروں نے اس سے جائیداد ہتھیانے کے منصوبوں پر غور کرنا شروع کردیا۔ مگر وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس نے اپنی جائیداد کو احسن طریقے سے سنبھالنا شروع کردیا۔ کاروبار میں کیے گئے منشی کے گھپلے وہ آسانی سے پکڑ لیتی۔ اس کے رشتے داروں کو اپنی امیدوں پر پانی پھرتا نظر آرہا تھا اور پھر انہوں نے ایک بھیانک کھیل کھیلا۔"

"بیلی کی سالگرہ نزدیک آرہی تھی۔ آنیوالے مہینے کی سولہ تاریخ کو وہ اکیس برس کی ہونیوالی تھی۔ پر آہ ..... ان ظالم لوگوں نے اسے اکیس برس کی ہی رہنے دیا ..... اپنی سالگرہ پر اس نے ایک بہت بڑے لنگر کا اہتمام کیا تھا۔ سات قسم کے چاولوں کی سات دیگیں تھیں۔ سات قسم کے میٹھے پکوانوں کی دیگیں ..... اور سات قسم کے سالن تھے۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ بچے ہوئے کھانے کی دیگیں غریبوں کے گھروں میں جائیں گی۔"

"اس بات پر رشتے داروں کا منہ مزید پھول گیا تھا وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔"

لڑکی ایک پل کے لئے خاموش ہوگئی تھی اور سامنے لگے اونچے سے درختوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں الو کا گھونسلہ تھا۔ گھونسلہ خالی تھا اور الو پھڑ پھڑاتا ہوا اطراف کے اونچے گھنے جنگلوں درختوں میں اپنا گھونسلہ تلاش کررہا تھا۔ بالآخر اسے اپنا گھونسلہ مل گیا اور وہ جلدی سے اس میں چھپ کر ٹھنڈ سے اپنا بچاؤ کرنے لگا۔ الو کو اپنی منزل پاتا دیکھ کر لڑکی نے گہرا سانس لیا اور دوبارہ مخاطب ہوئی۔

"سالگرہ کے دن جب سب انتظامات مکمل ہوگئے تھے اور بیلی تیار ہونے لگی تو اس کے چچا نے اسے بہت خوبصورت پہناوا لاکر دیا۔ بیلی نے جب سفید رنگ کے بیش قیمت پہناوے کو زیب تن کیا تو وہ کوئی شہزادی لگ رہی تھی رشتے داروں نے اسے تیار بھی شہزادیوں کی طرح کیا تھا۔ دیکھنے والے کچھ لوگ تو اسے عیسائی دلہن کا بھی خطاب دے رہے تھے۔ اپنی تعریف پر وہ پھولے نہیں

رہی تھی۔ کھانا کھل چکا تھا مگر گاؤں والوں کی نظریں بیلی کا ہی طواف کررہی تھیں۔ رشتے داروں کے بارے میں سوچ پر بیلی کو آج پہلی بار ندامت ہورہی تھی۔ گاؤں والے اپنی اپنی کم عمر اور حسین چودھرائن کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہورہے تھے اور وہ اپنا بڑا سا سفید فراک سنبھالے ادھر سے ادھر اتراتی پھر رہی تھی۔ جبھی اس کی نظر حویلی کے مین گیٹ پر پڑی جہاں سے پنچایت کے سردار دل نواز خان غصے سے تلملاتے ہوئے داخل ہورہے تھے۔ اس کے پیچھے پنچایت کے باقی ارکان ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں اٹھائے آگ بگولہ تھے۔

اس کے چچا سردار دل نواز خان کے آگے ہاتھ جوڑ ے رحم کی بھیک مانگتے آرہے تھے۔ اس سے پہلے کہ بیلی کچھ سمجھتی، سردار دل نواز نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑے بندوں کی طرف دھکا دیا جو اسے جانوروں کی طرح گھسیٹتے ہوئے حویلی سے باہر لے گئے۔ سردار دل نواز نے سب گاؤں والوں کو اگلے روز پنچایت میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور چلے گئے۔

اگلے روز پنچایت کا چوپال بھرا پڑا تھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ بیلی کو زنجیروں میں جکڑ کر کیکر کے درخت کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ اتنے بیش قیمت لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ کوئی فقیرنی سی لگ رہی تھی، اس کے چہرے پر صدیوں کی تھکن تھی اور ملائم بال گرد سے اٹ کر کھردرے سے ہوگئے تھے۔

پنچایت پورے گاؤں کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ ان کی چودھرائن ایک کبیرہ گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔ اسے ایک عیسائی لڑکے سے عشق ہوگیا تھا اور آج ہی کے دن اس نے عیسائیت کا مذہب اپنا کر اس لڑکے سے شادی کرلی ہے اور یہ کام اس نے آپ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کیا ہے۔ ہم سب پر کبھی یہ راز نہ کھلتا، اگر وہ لڑکا خود پنچایت کے سامنے آکر یہ راز فاش نہ کرتا۔ لڑکے کو پنچایت حاضر کرتی ہے۔

سردار دل نواز کے کہنے پر جب لڑکا آیا تو بیلی نے پہلی بار اپنا نڈھال سا چہرا اٹھا کر لڑکے کو دیکھا۔ وہ اسے آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اسے جانتی تک نہیں تھی وہ اس کے خلاف کھلی سازش کی گئی تھی مگر کس نے کی تھی؟ یہ اس کا نڈھال ذہن ابھی سوچنے سے قاصر تھا۔

پنچایت کا فیصلہ ہے کہ اس لڑکی کو سنگسار کردیا جائے لڑکے کو کچھ نہیں کہا جائے گا کیونکہ اس کی بدولت ہم اس چودھرائن کے قبیح فعل تک پہنچتے ہیں۔ دین میں مرتد کی سزا موت ہے۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟" سردار دل نواز نے گاؤں کے لوگوں سے رائے چاہی تھی۔

"موت ہے..... موت ہے....." گاؤں والوں کی طرف سے آوازیں آنے لگیں تھیں۔ بیلی کو زنجیروں سے آزاد کردیا گیا اور اسے کھینچ کر کھدے ہوئے گڑھے کی طرف لایا گیا۔ اس کا چچا ہاتھ جوڑے رحم کی بھیک مانگتا رہ گیا۔ مٹی کے کچے گڑھے میں اترتے وقت بیلی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جس چچا کو وہ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی آئی تھی۔ آج وہ ہی چچا اسے بچانے کیلئے تڑپتا پھر رہا تھا۔

گہری رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہورہی تھی۔ سجاد، عامر اور ناصر کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوکر لڑکی کو سن رہے تھے۔

گڑھے میں اتر کر بیلی کو کندھوں تک کچی مٹی میں ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس کا صرف سر اور گردن باہر رہ گئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں اور پنچایت کے ارکان نے بڑے بڑے پتھر ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب نے بیلی کے چہرے اور گردن پر پتھروں کی بارش شروع کردی۔ پل بھر میں ہی عیش وآرام میں پلی بیلی کا چہرہ اور گردن خون میں نہا گئے مگر پتھر تھے کہ رک نہیں رہے تھے۔

"مارو اس کو ..... کوئی اور مرتد ہونے نہ پائے ..... کوئی اور دین اسلام سے رخ موڑنے نہ پائے ....." لوگ بھرپور آوازوں کے ساتھ اس پر پتھر کس رہے تھے۔ درد جب اپنی انتہا کو پہنچا تو اس کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کرنے کی تیاری پکڑلی۔

درد کی شدت سے بے حال ہوکر اس نے اپنی خون میں لتھڑی آنکھیں جھٹکے سے کھولیں تو سر، کان، ماتھے سے بہتا لال گاڑھا خون اس کی آنکھوں میں بھرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود، اس کی مدھم ہوتی بینائی نے ایک روح فرسا

منظر دیکھ لیا تھا۔

اس کا چچا نوٹوں سے بھرا بریف کیس اسی عیسائی لڑکے (جس نے پنچایت میں بیلی سے شادی کرنے اور اسے عیسائی بنانے کا دعویٰ کیا تھا) کو تھماتے ہوئے گلے مل رہا تھا۔ عیسائی لڑکا اب بریف کیس تھام کر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور گاڑی کچی مٹی کی سڑک پر دھول اڑاتی ہوئی نظروں سے دور ہوتی جارہی تھی۔

دن کا وقت ہونے کے باوجود آسمان نے سرخی پکڑ لی تھی۔ شام کا منظر ہو گیا تھا۔ بیلی میں ابھی بھی زندگی کی امید باقی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن کا گوشت ادھڑا دھڑ کر لٹکنے لگا تھا۔ آنکھیں بھی پھوٹ چکی تھیں۔ ناک کی ہڈی بھی ٹوٹ کر لٹک گئی تھی مگر سنگ باری کا سلسلہ تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اپنے چچا سے آخری انتقام لینے کی خواہش اس کے اندر دم توڑنے لگی تھی۔

معصوم ہوتی سانسوں کے ساتھ اس نے دل ہی دل میں کلام الٰہی کا ورد شروع کر دیا۔ "یا اللہ! آپ گواہ رہنا، میں نے آپ کے علاوہ کبھی کسی کو اپنا رب نہیں مانا۔ آپ ہی میرے رب ہیں۔" اس کے ساتھ ہی ایک اور بڑا سا پتھر آیا اور مٹی میں دبے اس کے جسم نے ایک شدید جھٹکا لیا۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی وہ سنگسار کر دی گئی تھی۔

مگر جانے کیوں.....؟ عین اسی پل، آسمان نے اپنی رنگت اس حد تک سرخ کر دی تھی۔ جیسے وہ ابھی آگ برسا دے گا۔

لڑکی نے اب اپنے ہاتھ ریلنگ سے ہٹا دیئے تھے۔ وہ چلتے ہوئے ناصر، سجاد اور عامر کے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جو ابھی تک کہانی میں ہی کھوئے ہوئے تھے۔

"مگر..... اس کے چچا کا کیا بنا؟" سجاد جیسے ایک دم ہوش میں آیا تھا۔

"ہم آپ کو اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔" لڑکی نے قدرے خفگی سے کہا۔ جس کی وجہ سے اس کی کشادہ پیشانی پر ہلکی سی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"پر آپ اس ویرانے میں کیوں رہتی ہیں؟" عامر نے سوال کیا۔

"بیلی کے واقعے کے بعد سے ہمارا انسانوں میں دل نہیں لگتا۔ ہم نے اپنی گزر بسر اسی مکان میں کر لی ہے۔ بس ایک ہی بار شہر جا کر مہینوں کا سودا سلف لے آتے ہیں۔ ہم یہاں اس تنہائی میں بہت مطمئن ہیں۔ خود غرض انسانوں کے ساتھ ہمارا گزارہ نہیں۔" لڑکی نے تاسف میں ڈوبے ہوئے کہا۔

"مگر آپ ہیں کون؟" ناصر نے لفظ "آپ" پر زور دے کر کہا۔

"شاید آپ کو ہماری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم نے کہا نا، غیر ضروری سوالات مت پوچھیے۔" لڑکی کی سنہری آنکھوں میں غصہ در آیا تھا۔ سجاد نے اس کا غصہ کم کرنے کے لئے اس کا دوبارہ سے دھیان بیلی کی طرف کیا۔

"کیا انہوں نے بیلی کو دفنا دیا؟"

"سنگسار کرنے کے بعد مذہبی عقائد کے مطابق دفنایا جاتا ہے۔ جائیداد کے حصول کے بعد جب اس کے چچا کو اپنے جرم کا احساس ہوا تو اس نے چار بندوں کو ہمراہ بنا کر بیلی کی دوبارہ قبر کشائی کروائی۔ اس کا جسم ابھی تک تر و تازہ تھا۔ اسلامی طریقے سے غسل دلوا کر نماز جنازہ پڑھایا گیا اور پھر اسے واپس دفنایا گیا۔ یہاں سے مشرق کی سمت میں اس کی قبر ہے، جہاں بارش کی بوندوں سے پروان چڑھنے والا گھنا سا درخت اس پر ہر وقت چھاؤں کئے رکھتا ہے۔" لڑکی دوبارہ سے ریلنگ پر ہاتھ جمائے مشرق کی سمت میں دیکھے جارہی تھی۔ جہاں سے کچھ ہی دیر بعد سورج ابھرنے والا تھا۔ یہ کیسی داستان تھی؟ جو پوری رات پر محیط تھی۔

"آپ کے ساتھی جاگنے والے ہوں گے، ہم ناشتے کا بندوبست کئے دیتے ہیں۔" لڑکی نے کہا اور سرعت سے ان کے پاس سے گزر گئی۔ اس کے پیچھے صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔

"یار.....! یہ تو لڑکی نکلی، ہم تو اسے کوئی بھوت سمجھ رہے تھے۔ تو پھر ناصر، بات پکی.....؟" سجاد نے ناصر سے لڑکی کے بارے میں رائے چاہی۔

"سجاد یار! تو کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟ آبادی والی لڑکیاں مر گئی ہیں کیا؟ جو میں اس ویرانے میں پلی لڑکی کا انتخاب کروں۔ تو اپنے بارے میں سوچ۔" ناصر نے مسکراتے ہوئے جوابی فائر کیا۔

"کیاں؟ ماہم میرا برا حال کر دے گی۔؟" سجاد نے بے چارگی ظاہر کی۔

"عامر! چل تو ہاں کر دے۔" سجاد اور ناصر بیک آواز ہو کر بولے۔

"نہیں یار! اسی این جی بند رہتی ہے اور پیٹرول مہنگا ہو گیا ہے۔ اتنی دور کون بیوقوف بارات لے کر آئے گا؟" عامر کے صاف انکار کرنے پر تینوں ہی ہنستے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ جہاں انہیں اسٹاف ممبرز سے رات بھر غائب رہنے کے لئے کافی ڈانٹ بھی کھانی پڑی۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب کچھ بھول بھلا کر ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ناشتہ بہت لذیذ بنا ہوا تھا۔

"آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں..... بہت سچے ہیں۔" لڑکی نے ناشتے کی میز پر مالٹے کے جوس کا جگ رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جی! انسان کبھی کہاں مکمل ہوا ہے۔" مینجنگ ایڈیٹر صاحب نے دائیں ہاتھ میں پکڑے فوک سے انڈہ توڑتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات ہی ہے۔ ورنہ آپ یہاں سے، یوں بغیر نقصان اٹھائے نہ لوٹ رہے ہوتے۔" لڑکی اب کونے میں ایک طرف کو کھڑی ہو گئی تھی۔

"یس.....! یو آر رائٹ۔" صباء نے بات کرنے کی جلدی میں سالم ٹوسٹ نگل لیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ابھی جب ہم یہاں آ رہے تھے تو راستے میں ہمیں ایک ایسا ہی واقعہ دیکھنے کو ملا تھا۔ اس کے بعد صباء نے سارا واقعہ سنایا۔ جس میں کٹے ہوئے بازو اور کان کا ذکر تھا۔ لڑکی یہ واقعہ یوں سنتی رہی، جیسے یہ سب اسے پہلے سے پتہ ہو۔

"ایسا یہاں پہلی بار نہیں ہوا، غلط کام کرنے والے غلط انسان یہاں ہمیشہ مارے جاتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ سب لوگ بہت اچھے ہو، جو یہاں سے سلامت جا رہے ہو۔" صباء کے واقعہ سنانے کے بعد لڑکی گویا ہوئی تھی۔

"او کے جی! پھر ہمیں اجازت دیں۔" ایڈیٹر زاہد ٹشو سے ہاتھ پونچھتے اٹھے۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" عثمان بھی کرسی پیچھے گھسیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سبھی اپنے اپنے بیگز سنبھالے، سیڑھیاں اترتے نیچے آ رہے تھے۔ لڑکی بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آ رہی تھی۔ سجاد، ناصر اور عامر کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔

نیچے آئے تو دونوں پاگلوں میں سے ایک پاگل سر نیچے کئے اور دیوار پر ٹانگیں اوپر جمائے جانے کتنی دیر سے کھڑا تھا کہ پورے جسم سے خون، اس کے دماغ اور چہرے میں جمع ہو کر انہیں سرخ کر رہا تھا۔ وہ سب نیچے آئے تو دوسرے پاگل نے اپنی زنجیروں میں جکڑی ٹانگ زور سے زمین پر ماری اور دوسرا ہاتھ انہیں دیکھتے ہوئے سیلوٹ کے سے انداز میں ماتھے پر مارا۔ اس کی دیکھا دیکھی، سر نیچے کئے اور پیر دیوار پر جمائے پاگل بھی سیلوٹ کرنے کی چاہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر خون چونکہ ایک دم سے اس کے جسم کے باقی حصوں میں گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ محض چکرا کر رہ گیا۔

"یہ دونوں کون ہیں؟" عروج نے ڈرتے ڈرتے لڑکی سے پوچھا۔

"یہ جو چکرا رہا ہے۔ یہ ایک عیسائی لڑکا ہے اور یہ (لڑکی نے سیلوٹ میں پہل کرنے والے پاگل کی طرف اشارہ کیا) "چاچا" ہیں۔ خلاف توقع لڑکی نے جواب دیا۔

"آپ کے چاچا؟" افشاں رمضان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"نہیں..... میرے نہیں۔" لڑکی نے حقارت سے کہا اور مزید بولی۔ "ان دونوں کے متعلق تفصیلات آپ ان تینوں سے لے لیجئے گا۔" لڑکی نے ناصر، سجاد اور عامر کی طرف اشارہ کیا، جو پھٹی آنکھوں کے ساتھ اب ان دونوں پاگلوں کو دیکھ رہے تھے۔

"خیر..... میرے خیال میں ہمیں چلنا چاہئے۔"

چیف ایڈیٹر نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ان کے پیچھے ہی باقی اسٹاف ممبرز بھی باہر نکل گئے۔

لڑکی نے ان سب کو جاتا دیکھ کر کہا۔"اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔" اس کے بعد لڑکی واپس اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔شاید وہ بالائی منزل میں ہی رہائش پذیر تھی۔

عامر، ناصر اور سجاد کی آنکھوں کے سامنے بیلی کو سنگسار کرنے کے مناظر آرہے تھے اور وہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ دونوں پاگلوں کو تکے جارہے تھے۔ان تینوں کو ارد گرد کا کچھ ہوش نہ تھا۔

"سنئے مس...... سنبل کی آواز گونجنے پر سیڑھیاں چڑھتی لڑکی ایک دم رک گئی۔تاہم ابھی بھی اس کی پشت ہی تھی۔

"اپنا نام بتاتی جایئے، پلیز! تاکہ ہمیں اپنے محسن کو یاد رکھنے میں آسانی ہو۔" لڑکی کے غصے کے پیش نظر سنبل نے ہاتھ جوڑے تھے۔لڑکی نے ہولے ہولے ان کی طرف رخ کیا اور سنبل کے جوڑے گئے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔پھر اس نے افشاں، صبا، ساجدہ، سنبل، عروج پر نظر ڈالی وہ سب اس کی طرف متوجہ تھیں۔تاہم ناصر، سجاد اور عامر لڑکی کی طرف متوجہ نہ تھے۔وہ ابھی بھی دونوں پاگلوں کو ساکت آنکھوں سے دیکھے جارہے تھے جو اب اپنے سر پہ ہاتھوں کے سینگ بنا کر ایک دوسرے کو ڈرا رہے تھے۔

"بیلی...... بیلی نام ہے ہمارا۔" لڑکی کے منہ سے الفاظ کیا ادا ہوئے؟ مکان کے باہر پرندوں میں ہلچل سی مچ گئی اور دونوں پاگل بھی ایک دوسرے کو ڈرانا چھوڑ کر، سہم کر دیوار سے یوں چپک گئے تھے، جیسے بچہ ماں سے چپک جاتا ہے۔عامر، سجاد اور ناصر نے جھٹکے سے گردن موڑ کر، سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑی لڑکی کی طرف دیکھا۔جس

میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی تھی۔الوداعیہ ہاتھ ہلاتی ہوئی بالائی منزل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

یہ تینوں یونہی منہ کھولے ہونقوں کی طرح کھو[...] ہوئے تھے کہ عثمان کے ایک ایک گھونسہ رسید کرنے پر [...] واپس ہوش میں آئے۔

"اگر یہیں رہنے کا ارادہ ہے تو بولو......؟ باہر [...] تالا لگا کر چلا جاتا ہوں میں، صرف تم تینوں کی وجہ سے [...] واپس آنا پڑا ہے۔" عثمان مصنوعی غصے سے بولے۔

"آں...... ہاں چلتے ہیں۔" سجاد کے منہ [...] بمشکل نکلا۔اس کے بعد تینوں نے آنکھوں میں کچھ طے [...] اور نیچے جھک کر قدرے بڑے پتھر اٹھائے اور پوری قو[...] سے ان پاگلوں کو کھینچ کے مارے۔عثمان کمر پر ہاتھ ر[...] سمجھی سے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے۔پتھروں کی چوٹ [...] ہی پاگل اچھلنے لگے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے لگ[...]

"یہ کیوں کیا؟" عثمان نے الجھے ہوئے [...] میں پوچھا۔

"ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔" عامر [...] دانت پیستے ہوئے کہا۔

"پر کیوں......؟" عثمان کو کچھ سمجھ نہ آرہی تھی۔

وہ تینوں عثمان کو بیلی کی ساری کہانی بتاتے ہو[...] آگے بڑھ رہے تھے۔کچھ ہی فاصلے پر وین میں [...] لڑکیاں بیٹھ چکی تھیں، اسٹاف ممبرز وین کے باہر کھڑے [...] چاروں کا انتظار کررہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وین اسٹارٹ ہوچکی تھی۔اور یہ [...] ہوا خوش و خرم قافلہ واپسی کے لئے چل پڑا۔مگر اس وا[...] کی بدولت ان کے دلوں پر کچھ سوگواریت ثبت ہوچکی [...] اسی لئے وین میں سب خاموش تھے۔اور عثمان بیلی [...]

نیو وی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

پراسرار مجسمہ

علی کاشف آفاقی - آزاد کشمیر

غار کے فرش پر ایک دلکش دلفریب نسوانی بت ایستادہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ اب وہ بت اپنی نقرئی ہنسی سے پورا غار رونق افروز کردے گا۔ مگر اچانک ایک نوجوان دوڑتا ہوا بت سے جا ٹکرایا تو دھواں سا اٹھا اور بت غائب ہوگیا۔

صدیوں پر محیط ایک دل دہلاتی عقل کو اچنبھے میں ڈالتی ناقابل یقین لیکن حقیقی جادوئی کہانی

بعض لوگوں کی زندگی بہت عجیب گزرتی

ایمان، سفیان احمد اور سمیر زمان۔یہ چاروں دوست امیر

یہ آئیڈیا ساحل کا تھا۔ اس نے اپنے تینوں دوستوں کو کہا۔ ”یارو۔ گزشتہ چھٹیوں میں ہم کراچی، اسلام آباد، پشاور اور رحیم یار خاں وغیرہ جاتے رہے ہیں کیوں نہ اس دفعہ کسی گاؤں کی طرف چلا جائے۔“ تمام دوستوں نے اس خواہش کا خیر مقدم کیا۔

سفیان کہنے لگا۔ ”تجویز تو تم نے بہت اچھی دی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جایا کہا جائے؟ میرا مطلب ہے کون سے گاؤں میں؟“

”میرے خیال میں آزاد کشمیر کی طرف جانا اچھا ہے۔“ سمیر بولا۔

”میری بات سنو! میری خالہ آزاد کشمیر میر پور میں چکسواری نامی ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ چکسواری کے قریب ہی ایک بہت خوبصورت گاؤں ہے۔ میرا خیال ہے وہاں چلا جائے۔“ علی جو بڑی دیر سے چپ بیٹھا تھا بولا۔

”ویری گڈ پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ ساحل خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ چاروں دوست بے چینی سے چھٹیوں کا انتظار کرنے لگے۔

جلد ہی ان کا انتظار ختم ہو گیا۔ انہوں نے مکمل تیاری کی اور اپنے والدین سے اجازت لے کر میر پور کی طرف چل پڑے۔ وہ ایک شاندار گاڑی میں سوار تھے۔ ساحل ڈرائیو کر رہا تھا۔ باقی ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے ساحل بھی ان کی گفتگو میں لقمہ دے رہا تھا اچانک اسے ایک خیال آیا۔ ”کیوں نہ ہم اپنے گروپ کا ایک نام رکھ دیں۔ اس طرح ہماری ایک شناخت بن جائے گی۔

”واہ۔ واہ کیسا دماغ پایا ہے ساحل سمندر نے۔“ علی نے اسے داد دی۔

”مگر اس کا نام کیا ہو گا؟“ سفیان نے نقطہ اٹھایا۔

”ہاں! یہ مسئلہ تو ہے۔“ علی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”کیوں نا ہم اپنے گروپ کا نام 4MP رکھ دیں۔“

”نہیں یہ مناسب نہیں رہے گا کوئی اور سوچتے ہیں۔“ ساحل نے اس کی تردید کی اور وہ چاروں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔

آخر طویل سفر طے کر کے وہ چکسواری پہنچے علی پہلے ہی فون پر اپنی خالہ کو مطلع کر چکا تھا۔ اس کے اہل خانہ اس کے انتظار میں تھے۔ جوں ہی وہ چاروں ان کے گھر پہنچے ان کا پر جوش استقبال کیا گیا۔ رات ہونے کو تھی اور یو طویل سفر کی وجہ سے چاروں تھک چکے تھے۔ سو کھانا کھاتے ہی سو گئے۔

دوسرے دن وہ صبح کے وقت جاگے۔ نہا دھو کر ناشتہ کرنے لگے۔ اسی دوران علی نے اپنے دوستوں کا اپنی خالہ اور ان کے فیملی ممبرز سے تعارف کرایا۔

علی کی خالہ کے دو بیٹے تھے۔ ساجد اور امجد، ساجد انٹر میں تھا جبکہ امجد ابھی آٹھویں میں پڑھتا تھا۔

علی کے خالو صادق نے ان سے پوچھا۔ ”تم چاروں ایسے شہر سے آئے ہو جہاں جانے کی خواہش ہر ایک کو ہوتی ہے، اور اس میں کیا مصلحت ہے کہ تم چاروں گاؤں میں آ گئے۔“

علی نے اپنے خالو کو اپنی آمد کا اصل مقصد نہیں بتایا تھا اس لئے وہ بے خبر تھے۔ ”جی ہم کو کسی گاؤں کی سیر کا شوق تھا۔ اس لئے آئے ہیں۔“

یہ سن کر خالو بولے۔ ”بیٹا! اس گرمی میں تم کو کیا سوجھی کہ سیر کو نکل پڑے۔“

اب سفیان بولا۔ ”انکل دراصل ہماری اسکول لائف میں یہیں چھٹیاں آتی ہیں تو ہمیں سیر و سیاحت کا موقع ملتا ہے۔“

علی کے کزن ساجد نے پوچھا۔ ”تو دوستوں کو نسے گاؤں کی سیر کرو گے۔“

علی نے اپنی خالہ سلیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خالہ کہہ رہی تھیں کہ ادھر کوئی گاؤں ہے۔ بوڑھ پور بہت خوبصورت ہے۔“

خالہ سلیمہ بولیں۔ ”ہاں! یہاں چکسواری سے تھوڑے فاصلے پر بلاک ہے اور بلاک کی مشرق کی طرف بوڑھ پور ہے۔“

ساحل نے پوچھا..... ”آنٹی اسے بوڑھ پور کیوں کہتے ہیں؟“

خالہ سلیمہ کے بجائے خالو صادق نے جواب دیا۔ ”وہ اس لئے کہ وہاں پر بوڑھ کا ایک قدیم درخت ہے اور وہ درخت بہت بڑا اور پھیلا ہوا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ سن کر سمیر کی آنکھیں جیسے پھیل گئیں۔ ”اتنا بڑا درخت؟“

خالو صادق نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہر حال ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ لوگ بوڑھ پور جانے کے لئے تیار ہونے لگے۔

تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد وہ بوڑھ پور میں موجود تھے۔ وہ ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ لوگ کھیتوں میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ساحل نے کار کو ایک طرف کھڑا کیا۔ وہ سب کار سے اترے تو کھیتوں میں کام کرنے والے آدمی حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ وہ چاروں پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔ ساحل نے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ”یار! یہ مکئی ہے نا؟“

علی نے جواب دیا۔ ”ہاں۔ لیکن یہاں پر اسے ”فک“ کہتے ہیں۔“

وہ چاروں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے چلنے لگے۔ دن کے دس بجے تھے سورج سر پر آ رہا تھا مگر یہاں اتنا حبس نہیں محسوس ہو رہا تھا بلکہ ہلکی ہوا چل رہی تھی واقعی یہ ایک خوبصورت اور دلکش گاؤں تھا اردگرد مکانات بھی بنے تھے کہیں چھوٹا سا ٹیلہ تھا وہاں دو تین مکان تھے کہیں کسی کھیت کے کنارے اور کہیں بیچ میں۔ کھیتوں میں زیادہ تر بوڑھے آدمی کام کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک اونچا سا پہاڑ ہے۔ اس کے قریب ہی بوڑھ کا ناقابل یقین حد تک پھیلا ہوا بڑا درخت ہے۔ وہ حیرت سے اس درخت کو دیکھ رہے تھے کہ ایک بوڑھا سا آدمی ان کے قریب آ گیا۔

سلام و دعا کے بعد وہ پوچھنے لگا۔ ”آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟“ اس نے اپنی زبان میں پوچھا تھا۔

علی نے جواب دیا۔ ”بابا جی! ہم لاہور سے آئے ہیں۔“ چکسواری میں وہاں ہمارے رشتہ دار رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اس گاؤں کے بارے میں بتایا کہ یہاں ایک بہت بڑا درخت ہے۔ اس لئے ہم یہاں آ گئے اس درخت کو دیکھنے کے لئے۔“ وہ سب بابا کے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

درخت کے ذکر پر اس بزرگ کے چہرے کا رنگ ایک لمحہ کو عجیب سا ہوا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور کہنے لگا۔ ”اچھا ٹھیک ہے ویسے آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں لہٰذا آپ لوگ ہمارے گھر چلو۔“

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اس بزرگ کے پیچھے چلنے لگے گاؤں کے اکثر گھروں کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔ وہ چاروں دیکھ رہے تھے کہ گھروں کے مکین صحن میں موجود درختوں کے سائے تلے بیٹھے تھے کہیں کہیں کئی بچے بیٹھے نظر آئے تو کاپیوں پر لکھ رہے تھے یقیناً ہوم ورک لکھ رہے تھے علی نے چلتے ہوئے اس بزرگ سے پوچھا۔ ”بابا جی آپ کا نام کیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میرا نام رشید ہے پر لوگ مجھے شیدا کے نام سے پکارتے ہیں۔“

جلد ہی وہ بابا شیدا کے گھر پہنچ گئے بابا نے انہیں بیری کے درخت کے سائے میں پڑی چارپائیوں پر بٹھایا۔ بابا کا گھر سیمنٹ کا بنا ہوا تھا مگر بغیر پلستر کے تھا۔ ان چاروں کو وہاں عجیب سکون کا احساس ہوا چونکہ گھر کے گرد چار دیواری نہیں تھی اس لئے تھوڑے فاصلے پر وہ بوڑھ کا عظیم الشان درخت بھی نظر آ رہا تھا جس کے قصے انہوں نے سنے تھے۔ اتنے میں بابا ایک بڑا سا جگ اور چار گلاس لے کر وہاں آ گیا جگ میں لسی تھی بابا نے چاروں کو گلاس بھر کر لسی دی۔ تمام مشروبات اپنی جگہ مگر گرمیوں میں لسی کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے پھر وہ بابا کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ ”بابا جی کیا آپ اکیلے ہوتے

ہیں۔" علی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! میرا ایک بیٹا تھا جو کہ سال ہوتے شادی کرنے کے بعد بیرون ملک چلا گیا اور پچھلے سال میری بیوی اپنے خالق حقیقی سے جاملی اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔" بابا نے ایک لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

بہرحال وہ چاروں اس بابا کی دکھی کتھا سننے نہیں آئے تھے۔ سفیان نے پوچھا۔ "بابا یہ اتنا بڑا درخت ہے۔ ہم نے اس سے پہلے اتنا لحیم شیم پھیلا ہوا درخت نہیں دیکھا کیا کچھ معلوم ہے کہ یہ کب سے ہے؟"

بابا نے سفیان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "بیٹا اس وقت میری عمر پچاسی سال کے قریب ہے اور میرے دادا نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت بھی یہ درخت اسی حالت میں موجود تھا اب آپ لوگ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ درخت کب سے ہے۔"

یہ سن کر ان سب کی آنکھیں پھیل گئی بابا کی عمر 85 برس تھی اور پھر اس کا دادا یقیناً یہ درخت کم وبیش 200 برس پرانا تھا۔

ساحل نے بابا سے پوچھا۔ "بابا جی! کیا کبھی کسی نے یہ درخت نہیں کاٹا؟"

بابا جو اس درخت کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔ "اوہ پتر! میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم کاٹنے کی بات کرتے ہو کوئی بگڑی اس درخت کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے۔"

بابا کے لہجے میں پوشیدہ خوف کو وہ چاروں بہت واضح طور پر محسوس کرتے ہوئے چونک پڑے تھے۔

علی نے جلدی سے سوال کیا۔ "وہ کیوں؟"

"بس بیٹا! کچھ باتیں ایسی ہوتیں کہ۔" بابا نے مبہم سا جواب دیا تو وہ چاروں، سسپنس میں مبتلا ہو گئے ساحل نے کہا "بابا جی کھل کر بات کریں۔"

"بابا، ابھی بولنے ہی لگا تھا کہ اچانک آواز آئی۔ "اسلام علیکم۔" ف سب نے آواز کی سمت دیکھا ایک لمبا سا آدمی ان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ بابا نے اسے غور سے دیکھا پھر بولا "فاروق۔" فاروق آگے آ اور چاروں سے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہو بولا۔ "رشید بابا نے میرا نام آپ کو بتا دیا ہے اب آپ اپنے نام بتائیں؟" سمیر نے اپنا اور دوسروں کے نا بتائے تو فاروق بولا۔ "اچھا! آپ لوگ لاہور سے آ ہیں؟" چاروں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دوستو! تم اس درخت کے بارے میں س کر آئے ہو گے۔" سفیان نے جواب دیا۔ "بالکل۔ اس درخت کے قصے ہم نے سنے تو شوق ہوا دیکھنے سوچلے آئے۔"

فاروق نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے یہ درخت ہے یہی ایسا پراسرار کہ....." فاروق ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ بولا۔ "بس کر فاروق تو نے کیا آ جماعت پڑھ کر انہونی کی باتیں شروع کر دیں حقیقت سے چشم پوشی ٹھیک نہیں۔"

فاروق بولا۔ "بابا۔ تم اپنے فرسودہ خیالات اپنے پاس رکھو، یہ پڑھے لکھے بندے ہیں فضول باتو پر یقین نہیں رکھتے۔"

بابا بولا۔ "تو ایسی باتیں نہ کر کہ یہ باتیں بکواس ہیں جس دن تو اس پہاڑ کے پاس جائے گا اس دن تجھے پتے چلے گا کہ یہ کیسا بکواس ہے۔"

وہ چاروں اور بابا نے کی اس گفتگو سے بخو بیٹھے تھے۔ آخر علی نے پوچھا۔ "فاروق صاحب کیا آپ ان باتوں کی وضاحت کریں گے؟" فارو نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "بات یہ ہے کہ یہ درخت بہت پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ کسی کو اس کی تاریخ نہیں معلو ہمارے گاؤں کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس درخت پر جن بھوت بستے ہیں اور اگر کوئی اس درخت کے پا چلا جائے تو اسے مار دیتے ہیں آپ کو پتہ ہے کہ جن بھوت وغیرہ ہوتے ہی نہیں۔ بس یہ خیالات ہیں ا توہم پرست لوگوں کے۔" اس نے تفصیل بتائی تو چاروں بھی ہنس پڑے۔ ان کی تربیت ایسے گھرانو میں ہوئی تھی جہاں مذہب کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ اور

بھوت نامی چیزوں کے وجود پر تو انہیں یقین تک نہ تھا۔ اس کے نزدیک یہ محض افسانوی باتیں تھیں۔

سفیان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تبھی بابا جی درخت کے ذکر پر پریشان نظر آنے لگے تھے۔ بہرحال جن بھوت نامی شے تو ہے نہیں دنیا میں۔"

اس کی بات سن کر رشید اچلایا۔ "بیٹا! میں تم لوگوں کو صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ تم لوگ اپنے خیالات کو بدل ڈالو، ان نادیدہ قوتوں کا وجود اس دنیا میں ہے اور فاروق کی باتوں پر کان نہ دھرو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ، اور اس وقت تمہارے پاس وقت نہیں ہو گا سوائے پچھتانے کے۔"

فاروق نے بابا سے کہا۔ "آپ چپ کریں۔ دیکھیں یہ لوگ بھی ان فرسودہ باتوں پر یقین نہیں کر رہے۔"

بابا بولا۔ "میرا کام سمجھانا تھا اگر آپ لوگ نہیں سمجھتے تو یہ آپ لوگوں کی اپنی مرضی ہے مگر میں پھر بھی کہتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں کو کوئی تلافی نقصان ہو جائے۔" بابا کی باتیں سن کر وہ سب مسکرانے لگے۔

ساحل بولا۔ "فاروق صاحب! کیوں نہ اس درخت کے پاس چلا جائے۔"

فاروق جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہاں کیوں نہیں۔" وہ سب کھڑے ہو گئے رشید بابا کا شکریہ ادا کیا۔ اور فاروق کے ساتھ جانے لگے۔ رشید بابا انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اس کا دل بھرنے لگا۔ "جوانو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری باتوں پر دھیان نہ دیا، خیر میری دعا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی نقصان والا واقعہ نہ پیش آئے۔"

وہ پرنم آنکھوں سے انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک درد بھری کہانی چھپی تھی گویا ایک راز جسے فاش کرنے کی جرأت وہ ابھی تک نہیں کر سکا تھا۔

بوڑھ کا عظیم الشان درخت بابا کے گھر سے زیادہ

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہو گا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہو گا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

دور نہ تھا۔ وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ درخت کے آس پاس اس قدر جھاڑ جھنکار تھا کہ پاؤں نہیں رکھا جاتا تھا۔ بوڑھ کا درخت پہاڑ کے قریب تھا اس کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ اس نے پہاڑ کا کچھ حصہ ڈھانپ رکھا تھا گویا اس کی ٹہنیوں نے آگے جانے کی کوشش کی تھی مگر پہاڑ کی رکاوٹ سے وہ اس کے ساتھ ٹکرا گئیں پہاڑ ٹہنیوں کو روک سکتا تھا مگر درخت کی نشوونما نہیں۔ اس لئے جوں جوں درخت کی شاخیں بڑھتی گئیں ٹہنیاں پہاڑ کے ساتھ لگ کر دائرہ سا بناتی رہیں اور اب صورت حال یہ تھی کہ اس پہاڑ کا کچھ حصہ ٹہنیوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

وہ لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے اچانک درخت کے اوپر سے کوئی چھپاک کی آواز سے گرا۔ وہ ڈر گئے غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک سانپ ہے وہ بہت ہی بھیانک اور خوفناک کوبرا سانپ تھا۔ فاروق کہنے لگا۔ ''میں نے سخت غلطی کی جو رائفل نہیں لایا۔''

''اور کلہاڑی وغیرہ کی بھی ضرورت ہوگی۔'' سفیان نے کہا۔ پھر وہ باہر نکل آئے اس جھاڑ جھنکار سے کیونکہ آگے درخت کی ٹہنیاں تھی لہٰذا آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ کل آگے تک جایا جائے گا لہٰذا چاروں دوست چکسواری واپس آ گئے۔

دوسرے دن آٹھ بجے وہ سب بوڑھ پور پہنچ گئے فاروق ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انکے وہاں پہنچتے ہی وہ بولا۔ ''آ گئے دوستو!'' ان سب نے اسے سلام کیا اور پھر بوڑھ کے درخت کی طرف چل پڑے۔ درخت کے قریب پہنچ کر فاروق نے ایک طرف سے بندوق اور ایک لمبا سا چھرا نکالا۔

''یہ، یہ یہاں کیسے آ گیا؟'' سمیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں نے رکھے تھے صبح سویرے۔ اگر بعد میں لاتا تو شاید لوگ شک میں پڑ جاتے۔'' فاروق نے جواب دیا۔ پھر وہ درخت کے بالکل قریب پہنچ گئے فاروق چھرے سے ٹہنیاں کاٹ کر راستہ بنانے لگا۔ چھرا کافی تیز تھا راستہ جلد بنتا گیا وہ چاروں دوست بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے گھنی ٹہنیوں کی وجہ سے یہاں ہلکا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا کہیں کہیں خشک لکڑیاں بھی پڑی تھیں۔ اچانک فاروق کا ہاتھ رک گیا وہ ساکت ہو کر اسی طرف دیکھنے لگا۔ دوسروں نے بھی اس کی نگاہوں کی سمت میں دیکھا تو وہ بھی دہل کر رہ گئے کیونکہ کل والا خوفناک کوبرا سامنے کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ فاروق نے آہستگی سے رائفل سیدھی کی اور کوبرے کے سر کا نشانہ لیا۔ فاروق کا نشانہ اچھا تھا گولی نے کوبرا کے سر کو چھیتڑوں میں تبدیل کر دیا وہ اچھلا اور پھر ساکت ہو گیا۔ ''گرمی کا موسم ہے نا۔ اس لئے یہ چھاؤں میں بیٹھا تھا۔'' فاروق نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بہرحال وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اس کے بعد سفیان نے چھرا لیا اور راستے میں موجود جھاڑ جھنکاڑ کاٹنے لگا۔ اگرچہ چھرا تیز تھا مگر ٹہنیاں بھی موٹی تھیں اس لئے وقت ہو رہی تھی۔

ساحل نے کہا۔ ''سفیان مجھے دے دو تم تھک گئے ہو گے۔'' تو سفیان نے چھرا ساحل کو دے دیا وہ کاٹنے لگا۔ جو ٹہنیاں انہوں نے کاٹی تھیں ان سے شگاف سا بن گیا تھا۔ جب وہ مزید آگے بڑھے تو ساحل اچانک چلایا۔ ''ارے ارے وہ دیکھو!'' سب نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ درخت کی ٹہنیاں کاٹتے کاٹتے وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جسے درخت نے ڈھانپ رکھی تھی۔ اب وہاں پر ایک غار کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔

''یہ، یہ کیا ہے؟'' سفیان ہکلایا۔

فاروق کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں یہ غ ہے۔'' پھر وہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔ اور غور سے دیکھ لگا۔ ''ہاں، یہ غار ہی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا۔'' وہ حیرت سے بولا باقی سب بھی حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اچانک سرسراہٹ کی آواز آئی۔ وہ ایک د

پھر ٹھٹک گئے۔ وہ آواز غار کے دہانے کے قریب سے آ رہی تھی۔ دوسرے لمحے سمیر کی چیخ نکلتی چلی گئی۔ دہانے کے قریب ایک لمبا چوڑا بھیانک اور ڈراؤنا اژدھا نظر آ رہا تھا وہ سب خوف زدہ ہو گئے لیکن فاروق نے رائفل سیدھی کر لی اور اژدھا کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اژدھا اگلے جہان کو پہنچ گیا دوسرے ہی لمحے وہ دم بخود رہ گئے کیونکہ اژدھے کے مردہ وجود میں آگ بھڑک اٹھی اور منٹوں میں اژدھا راکھ کے ڈھیر میں منتقل ہو گیا۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ یہ کیا اسرار ہے؟ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اژدھے کو آگ لگنے کا سبب دریافت کرتے یا واپس کی راہ لیتے۔ لیکن ماورائی مخلوق پر ان کا عدم یقین اور جذبہ مہم جوئی نے انہیں اکسایا کہ وہ غار میں داخل ہو جائیں۔

اگلے چند لمحوں میں وہ غار کے اندر تھے غار میں ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ان کے پاس روشنی کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ فاروق کہنے لگا۔ ''اس اندھیرے میں ہم اندھوں کی طرح کھڑے رہیں گے کیوں نہ روشنی کا انتظام کیا جائے؟''

''مگر کیسے؟'' سفیان نے سوال کیا۔

فاروق ایک منٹ انہیں ٹھہرنے کا کہہ غار سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خشک لکڑی کا ڈنڈا تھا اس نے اپنی بنیان اتاری اور اسے ڈنڈے پر لپیٹ دیا فاروق کو چاروں دوست الوؤں کی طرح دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور جب روشنی ہوئی تو وہ سمجھ گئے کہ فاروق نے کیا تکنیک استعمال کی ہے فاروق نے اپنی بنیان ڈنڈے کے سرے پر لپیٹ کر اسے آگ لگا لی تھی۔ اس طرح وہ ڈنڈا ایک مشعل کا کام دے رہا تھا روشنی ہونے پر انہوں نے غار کا مشاہدہ کیا جہاں وہ کھڑے تھے وہاں غار اتنا تنگ نہیں تھا وہ آگے بڑھنے لگے۔ فاروق مشعل تھامے ہوئے سب سے آگے تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے وہ ایک کھلے کمرہ نما جگہ میں پہنچ گئے انہوں نے اردگرد دیکھا ان کا دماغ چکرا کر رہ گیا آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

اس کمرے کے وسط میں ایک برہنہ عورت کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ گلابی رنگت، بھرا بھرا بدن، گھنی بھنوئیں، یاقوتی ہونٹ اور جھولنے کے انداز میں لمبے بال آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک بھی دکھائی دے رہی تھی۔

مجسمہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کے جسم کے نازک خطوط نمایاں ہو گئے تھے پہلی نظر دیکھنے سے گماں ہوتا تھا کہ زندہ عورت رقص کر رہی ہے۔ مگر دوسری نظر سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا جسم بے حرکت ہے۔

''یہ، یہ کک کیا اسرار ہے؟'' فاروق کی لڑکھڑائی ہوئی آواز سنائی دی۔ باقی تو اس مجسمہ کی خدوخال اور خوبصورتی میں کھوئے ہوئے تھے۔

آج کے جدید دور میں دس بارہ سال کے بچے بھی زندگی کے ہر پہلو سمجھنے لگے ہیں۔ دنیا کے رنگینیاں، ظاہری و پوشیدہ باتیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور سفیان، ساحل، سمیر اور علی کا تعلق ایسی سوسائٹی سے تھا جہاں ہر بات کی آزادی تھی۔ سو اس مجسمہ کو دیکھ کر ان سب کی حالت ایسی ہوئی کہ بے اختیار ان سب کا دل اس مجسمے کی طرف کھنچنے لگا۔ مجسمے کے نازک خطوط اس انداز سے نمایاں کئے گئے تھے ان کے دل دھڑک اٹھے۔

اچانک ایک آواز آئی۔ ''تم پانچوں پہلی دفعہ اس غار میں آئے ہو۔ بلکہ دریافت بھی تم نے کیا ہے۔'' آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ وہ حیران و پریشان بولنے والے کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا صرف آواز سنائی دے رہی تھی۔

''تم سب کی خواہش میں جانتا ہوں مگر تم ہو پانچ اور یہ ایک ہے۔ لہٰذا تم میں سے جس نے بھی اس کو پہلے ہاتھ لگایا۔ یہ زندہ ہو کر اس کے ساتھ چلی جائے گی۔''

کہتے ہیں کہ جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈال دیا جائے تو وہ مزید جلنے لگتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا وہ سب اس مجسمے کی دلکشی میں کھوئے ہوئے تھے اور ذہنی

طور پر اس کے قریب کھینچے جارہے تھے۔

اس آواز نے ان کے جذبات کو بھڑکا دیا۔ ان کی طلب مزید بڑھ گئی مگر ساحل پر کچھ زیادہ ہی اثر ہوا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دوڑتا ہوا گیا اور مجسمے کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

اچانک انہیں اس زوردار دھماکہ سنائی دیا ساتھ ہی ایک بھیانک قہقہہ بھی۔ فاروق کا ہاتھ کانپا اور مشعل نیچے گر گئی پورے کمرے میں پھر گھپ اندھیرا چھا گیا پھر فاروق نے ہمت کر کے مشعل دوبارہ جلائی تو وہ دنگ رہ گئے کہ مجسمہ اپنی جگہ سے غائب تھا جبکہ مجسمے کی جگہ اب ساحل کی لاش پڑی تھی۔ اس کے باقی تینوں دوستوں کو یوں لگا جیسے ان کے دلوں پر کسی نے برچھیاں ماردی ہوں۔

''ارے یہ تو ساحل ہے اس کو کیا ہوگیا ہے؟'' سفیان نے پرنم آنکھوں سے کہا باقی لوگوں کی جیسے گویائی ختم ہوکر رہ گئی تھی ان کے حواس ختم ہوکر رہ گئے تھے اس وقت ان سب کے ذہنوں میں صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

''میرا کام تم لوگوں کو سمجھانا تھا میں نے سمجھادیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جانی نقصان ہوجائے۔ وہ آواز رشید بابا کی تھی اور ان سب کے دماغوں میں یہ سوال گونج رہا تھا'' کیا بابا شیدا اس پراسرار غار سے آگاہ تھا؟''

اس دنیا میں کسی نہ کسی کا مرنا برحق، لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں مگر جانے جانے میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ ہارٹ اٹیک سے مرجاتے ہیں اور کچھ کسی اور بیماری سے مگر ساحل کو تو کوئی بیماری نہ تھی۔ وہ بس پراسرار مجسمے کو ہاتھ لگانے سے مرگیا تھا بہرحال اگلے پانچ گھنٹوں کے اندر اندر ساحل کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کردیا گیا۔ پورے گاؤں کو اس موت کے بارے میں پتہ چل گیا تھا سفیان، علی، سمیر اور مرحوم ساحل کے والدین کو بھی مطلع کردیا گیا تھا۔ علی کے خالو صادق بھی آگئے تھے۔ فاروق سفیان اور علی سمیر پریشان تھے کہ ساحل کی موت ہوئی کیسے؟ اس نے تو مجسمے کو صرف ہاتھ لگایا تھا۔ اور یہ موت؟ اور یہ موت؟ یہ سب کیا اسرار ہے ان کے ذہن الجھے ہوئے تھے۔ گاؤں والوں کو انہوں نے بتایا تھا کہ ساحل غار میں داخل ہوا تو ہشاش بشاش تھا لیکن اندر پہنچ کر اسے دل میں شدید درد اٹھا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا پھر چند منٹ میں ہی وہ دنیا سدھار گیا۔

گاؤں والوں نے ان کی بات کا کہاں تک یقین کیا؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو غار کو دیکھ کر حیران ہورہے تھے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں پتا نہیں تھا۔ علاقہ پولیس نے اس معاملے کی چھان بین کی اور پھر تھک ہار کر انہوں نے فائل کو بند کردیا۔

ایک بات تو عجیب تھی بلکہ ہوش گم کردینے والی تھی وہ یہ کہ اس عورت کا برہنہ مجسمہ وہاں سے غائب کیسے ہوا تھا۔ وہ سب پریشان تھے کہ عورت کا مجسمہ گیا تو آخر گیا کہاں؟

''اسلام علیکم۔'' اچانک انہیں آواز سنائی دی اس وقت وہ غار کے قریب ہی کھڑے تھے وہ بابا شیدا تھا جس نے انہیں سلام کیا تھا۔ پھر وہ انہیں لے کر اپنے گھر آگیا 4 بجے کا وقت تھا سورج کا سفر اپنی منزل کی طرف جاری تھا بابا شیدا نے انہیں جو کہانی سنائی اسے سن کر وہ سب انگشت بدنداں رہ گئے خاص کر کے فاروق زیادہ حیران و پریشان تھا۔ بابا نے جو کہانی سنائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی تو ایک سال بعد اس کے گھر اللہ نے اسے بیٹا دیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے بیٹے کا نام عمران رکھا۔ وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ عمران بڑا ہونے لگا وہ بہت شرارتی تھا۔ ہر ایک کے ساتھ شرارتیں کرنا اس کا شیوہ تھا۔ مگر عمران تھا بہت خوبصورت گاؤں کا ہر آدمی اسے چاہتا تھا۔

بوڑھ کا لحیم وشحیم درخت بابا رشید کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا عمران جب پانچ سال کا ہوا تو وہ اس درخت کی طرف جانے لگا شیدا اس کو واپس لے آتا عمران کی ماں بھی اس پر کڑی نظر رکھتی کہ عمران درخت

کی طرف نہ چلا جائے کیونکہ وہاں بہت زیادہ جھاڑ جھنکاڑ تھا لیکن تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے؟ ایک دن عمران درخت کی جانب چلا گیا اور پھر ٹہنیوں کے بیچوں بیچ چلتا ہوا غار کی طرف چلا گیا ادھر گھر سے گئے اسے کافی دیر ہوئی تو اس کی ماں نے شیدے کو بتایا۔

شیدا دوڑتا ہوا درخت تک پہنچا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ یہاں ہوگا وہ بڑی مشکل سے ٹہنیوں کے درمیان چلتا ہوا آگے گیا تو ساکت رہ گیا اس کا پیارا بیٹا عمران غار کے قریب پڑا تھا اور ایک اژدھا اس کے قریب تھا۔ نجانے کیوں شیدا کی زبان گنگ رہ گئی اس نے دیکھا کہ اژدھا اسے دیکھ کر واپس غار میں داخل ہوگیا ہے عمران مردہ حالت میں پڑا تھا شیدا حواس باختہ لڑکھڑاتے قدموں سے عمران کی لاش اٹھائی اور خاموشی سے واپس آگیا۔ گھر آکر اس نے بتایا عمران وہاں پہاڑی سے گرا اور اس کا سر زور سے ایک پتھر کے ساتھ ٹکرایا جس کے نتیجے میں اس کی وفات ہوگئی۔

آخر میں بابا شیدا سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

''میں نے سوچا تھا کہ یہ حقیقت نہ بتاؤ۔ پھر میں نے جن بھوت سے ڈرایا لیکن تم لوگوں نے میری بات نہ مانی اور جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ تم لوگوں کا پیارا دوست اپنی جان سے گیا۔'' وہ سب سر جھکائے بابا شیدے کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں ندامت ہورہی تھی کہ ساحل کے والدین کو کیا جواب دیں گے۔

رات ہونے کو تھی جب وہ بوڑھ پور سے اپنے دوست کو گنوا کر نکلے تو سفیان ڈرائیو کررہا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی پچھلی سیٹوں پر علی اور سمیر خاموش بیٹھے تھے وہ گاؤں کی حدود سے نکلے۔ رات کا اندھیرا ہرسو مسلط ہوچکا تھا کار میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کچھ فاصلے پر انہوں نے ایک ہیولہ سا دیکھا پھر جب کار تھوڑی آگے گئی تو وہ دنگ رہ گئے وہ ہیولہ نہیں بلکہ ان کا دوست ساحل تھا وہی ساحل جو کہ مرچکا تھا اور اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوائی جاچکی تھی۔

''مگر وہ یہاں کیسے کھڑا تھا۔'' سفیان نے بے اختیار کار کو بریک لگائی کار کے رکتے ہی جھٹ سے ساحل نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں فوراً بیٹھ گیا کار میں موجود تینوں دوست مبہوت ہوکر اسے دیکھنے لگے۔ ''ت'' تم کیسے؟'' سفیان کی لڑکھڑائی ہوئی آواز نکلی۔

ساحل مسکرایا۔ ''میں ایسے کہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاسکتے آخر دوست ہوں تمہارا۔'' اس نے کہا تو سفیان بولا۔ ''مگر تم تو مرگئے ہو۔''

''میں اس وقت مصروف ہوں تم کو یہ بتانے آیا ہوں کہ وہ مجسمہ آج سے 300 سال پرانا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب بوڑھ پور میں ایک ہندو راجا حکومت کرتا تھا وہ بہت ظالم اور جابر تھا وہ جادو میں کافی مہارت رکھتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایک منجھا ہوا جادوگر تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی شادی پڑوسی ریاست کی راجکماری شوبھا کی شوبھا ایک ہوس پرست عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی اور ایک دوسرے آدمی سے ناجائز تعلقات قائم کرلئے اس کا شوہر راجکمار پرکاش سادہ سا آدمی تھا مگر اس لئے اپنی بیوی کی عیاری اور بے وفائی کو محسوس نہ کرسکا لیکن اس کے باپ نے جان لیا۔ شوبھا اپنے ملنے والے کے ساتھ چھپ چھپا کر اسی غار میں رنگ رلیاں مناتی تھی۔ ایک دن شوبھا اس شخص کے ساتھ اس غار موجود تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے دنیا مافیا سے دور تھے۔ شوبھا بالکل برہنہ تھی اس کا سسر جادوگر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے غضب ناک ہوکر اس شخص کو نرخ میں پہنچادیا۔ اور شوبھا کو پتھر کے مجسمہ میں منتقل کردیا مجسمہ کی صورت میں وہ نہ دیکھ سکتی تھی نہ حرکت کرسکتی تھی مگر محسوس کرسکتی تھی شوبھا کی نفسیاتی خواہشات میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔

لیکن اس کے سسر نے جادو کے زور سے اس کی نفسیاتی خواہشوں کو مزید بھڑکا دیا اب وہ اپنی خواہشات میں جلتی رہتی تھی اور اپنے کسی رفیق کے تلاش میں دن رات جلتی رہتی تھی۔

اس کے سسر نے غار سے باہر آ کر وہاں ایک بوڑھ کا درخت لگادیا اور ساتھ ہی وہاں حصار قائم کردیا تاکہ کوئی غار میں داخل نہ ہوسکے اگر کوئی داخل ہوجاتا اور اس کا ہاتھ شوبھا کے مجسمے کے ساتھ مس کر جاتا تو وہ زندہ ہوسکتی تھی۔

پھر اس نے پرکاش کی شادی ایک اور راجکماری سے کرادی وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس کے بعد وہ جادوگر تقریباً سو برس تک زندہ رہا اس دوران بوڑھ کا درخت تن آور ہوچکا تھا لہٰذا اس نے اس غار کے گرد سے حصار ختم کردیا اور اپنے جادو کے زور سے ایک دوسری مخلوق میں سے ایک کو وہاں مقرر کردیا کچھ عرصہ بعد وہ مرگیا اب اگر کوئی ادھر آنے کی کوشش کرتا تو اس مخلوق کا کام تھا کہ وہ اس کا رخ موڑ دیتی تھی لیکن اگر وہ شخص زیادہ آگے بڑھ جاتا تو وہ مخلوق اس شخص کو جان سے ماردیتی تھی۔

تین سو سال گزر گئے، بوڑھ کے درخت نے اس غار کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا دوسری مخلوق وہاں موجود تھی اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ایک خوفناک اور بھیانک سانپ کو اس غار کے دروازے پر مقرر کردیا، اور خود اپنے ساتھیوں کے پاس چلی گئی۔

اسے یقین تھا کہ وہ سانپ وہاں کسی کو نہیں آنے دے گا۔ لیکن جب ہم نے وہاں جانے کی ٹھان لی اور اژدھے کو مار دیا۔ چونکہ وہ جادوئی سانپ تھا لہٰذا مرتے ہی وہ جل گیا اس کے بعد اس مخلوق کو خبر ہوگئی جب تک وہ وہاں پہنچتی ہم سب غار میں داخل ہوگئے تھے۔ اب ہم کو مارنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا اس نے ہمیں بھڑکایا اور یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں سب سے پہلے مجسمے کے قریب جا کر مجسمے کو پکڑ لیا نتیجتاً میری موت ہوگئی اور تم بچ رہے۔

تو میرے دوستو! میں ایک رو ہوں، میرا جسم پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ ہوچکا ہے میں وہاں یہ لکھوادوں گا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔

یہ سن کر سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ انہیں اپنے دوست کے بچھڑنے کا ناقابل برداشت غم تھا۔

ساحل نے پھر کہا دوستو! جو ہونا تھا وہ ہوچکا مگر میں تم لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ جب بھی تم پر کوئی مصیبت آئی تو مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔

سفیان نے کہا۔ ”تم کل تک ہمارے ساتھ تھے تمہارے جانے کا غم بہت زیادہ ہے۔ تم نے اس دن ہمارے گروپ کے نام کے لئے کہا تھا۔ تو میں نے سوچا ہے کہ ہمارے گروپ کا نام ساحل گروپ ہوگا۔ اور ہم ”ایس جی“ کے نام سے پہچانے جائیں گے۔ باقیوں نے بھی تائید کی ساحل نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بولا۔ ”خدا حافظ میرے دوستو! اب میں جارہا ہوں بعد میں ملاقات ہوگی اور پھر وہ غائب ہوگیا۔

کار میں تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اور پھر سفیان نے کار اسٹارٹ کی اور آہستہ سے آگے بڑھادی۔

سب اسی طرح ہوا تھا جیسے ساحل نے کہا تھا پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ساحل کو تیسری مرتبہ ہارٹ اٹیک ہوا تھا اس کی والدہ کا رو رو کر برا حال تھا اس کے والد احمد سکندر نے انہیں بڑی مشکل سے دلاسہ دیا تھا۔

ساحل کے سوئم میں سفیان کے والدین، علی کے والدین، اور پھر سمیر کے والدین ساحل کے گھر میں موجود تھے سب ساحل کے گھر موجود تھے۔ ان کے چہرے سوگوار تھے ساحل کی والدہ غم سے نڈھال تھیں ان کی سسکیاں رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

ساحل کے دوستوں کے سوا کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ساحل سب کو دیکھ رہا ہے۔ ہاں، ساحل احمد اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے دل غم میں تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ”کاش میں اس وقت ان کے پاس ہوتا تو یہ سب خوشی سے قہقہے لگا رہے ہوتے۔“

حنوط لاشیں

باسط مظہر- حامد جھنگی راولپنڈی

کھلے سمندر میں پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی بوٹ اچانک قابو سے بے قابو ہوگئی، اس کا رخ ایک انجان منزل کی طرف ہوگیا، بوٹ میں سوار مسافر حیران و پریشان، انگشت بدنداں ہوگئے کہ اتنے میں دلخراش حالات سے پالا پڑگیا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ روحیں بھی کسی امانت کی محافظ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

کچھ سال پہلے میرے ساتھ جو یہ واقعہ رونما ہوا تھا، اسے آج بھی جب کبھی یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کل کا واقعہ ہو اور اپھر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا میں پہنچ چکا ہوں۔ جس کا تصور بھی کوئی عام آدمی نہ کرسکے لیکن یہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ واقعہ جھوٹ نہیں بلکہ بالکل حقیقت ہے میں جب بھی تنہائی کے عالم میں یادوں کے تاروں کو چھیڑتا ہوں تو یادِ ماضی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔

ہوا کچھ اس طرح کہ چند سال پہلے جب زندگی بہت حسین و دلکش لگتی تھی کوئی غم کوئی دکھ ذہن کے آس پاس بھٹک نہیں پاتا تھا ہر طرف خوشیوں کا سماں ہوتا تھا اس وقت میں یعنی زین، شہباز اور ریحان بہت گہرے دوست تھے ہم تینوں دوستوں کو سمندری سفر جنون کی حد تک پسند تھا۔

ایک دن ہم تینوں نے مشترکہ رائے سے سمندری سیر کے لئے ایک عدد بوٹ کرائے کی لی، ضروریات زندگی کا مختصر سا سامان لیا۔ ساتھ ہی مچھلی کے شکار کا انتظام بھی کرلیا۔

دوسرے دن صبح تقریباً نو بجے ہم نے سمندر کے ساحل سے بوٹ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کردیا۔ بوٹ کو شہباز ڈرائیو کررہا تھا۔ میں اور ریحان پیچھے بیٹھے سمندر کی لہروں اور طرح طرح کی مچھلیوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہورہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے نمکو کا ایک پیکٹ کھولا اور کھانے لگے۔ تقریباً تین گھنٹے بعد ہم خشکی سے بہت آگے نکل آئے تھے چونکہ شہباز بوٹ فل اسپیڈ سے چلا رہا تھا اور ہم بہت جلد سمندر کے وسط میں پہنچنے والے تھے اس کے بعد ہم تینوں خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔

ریحان بولا۔ ''یارزین چلو کوئی مچھلی وچھلی ہی شکار کریں، مجھے بھوک محسوس ہورہی ہے۔'' اس بات پر شہباز نے بھی تائید میں سر ہلایا چنانچہ میں نے کانٹا نکالا اور قسمت آزمانے لگا ابھی مجھے کانٹا ڈالے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ آسمان پر گہرے بادل چھانے لگے، ایسا لگ رہا تھا کہ شاید تھوڑی ہی دیر میں ہم کسی مصیبت یا سمندری طوفان کی زد میں ہوں گے۔ اور ہمارا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں بہت زبردست طوفان آگیا۔ ہماری بوٹ سمندر کے اور زیادہ اندر جانے لگی بوٹ کو سنبھلنا مشکل ہورہا تھا طوفان تیز سے تیز تر ہورہا تھا۔ لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر سنگدلی کا مظاہرہ کررہی تھیں۔ ہم کافی گھبرا گئے تھے ہم تینوں پہلے کئی مرتبہ سمندر میں کافی دور تک چلے جاتے تھے مگر کبھی بھی ہمارا سامنا اس طرح کے سمندری طوفان سے نہیں پڑا تھا یہ فرسٹ ٹائم تھا اس لئے ہم بہت زیادہ ڈر گئے تھے

شہباز نے کہا ''یار میں تو کہتا ہوں ہمیں فوراً واپسی کا رخ کرنا چاہئے۔'' میں نے اس کی بات پر عمل کیا، اس وقت بوٹ میں ڈرائیو کررہا تھا میں نے فوراً واپسی کے لئے بوٹ کو موڑا مگر طوفان مخالف سمت کا تھا، اس لئے بوٹ خود بخود سمندر کے بیچوں بیچ جانے لگی۔ آخر ہماری بوٹ ایک بڑے بھنور میں پھنس گئی اور ہچکولے کھانے لگی۔ ہم سب حیران تھے کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔ لیکن ریحان کو پتہ چل گیا تھا کہ کیا صورت حال ہے اور اس کا حل کیا ہے۔

اس نے ہمیں بتایا کہ ''یہ سمندر کا چھلاوہ ہے، مطلب سمندر ہم میں سے کسی ایک کی قربانی مانگ رہا ہے، سمندر ہر دس سال میں کم از کم دو سے تین دفعہ اس طرح قربانی مانگتا ہے سمندر میں ایک دم سے طوفان کا آنا اور بوٹ کا بڑے بھنور میں پھنس جانا یہ سب اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سمندر کی بھوک مٹائی جائے۔ اس لئے میں نے یہ حل نکالا ہے کہ یہ قربانی میں دوں گا اگر میری قربانی سے تم دونوں بچ سکتے ہو تو مجھے کوئی غم نہیں بلکہ خوشی ہوگی کہ میں نے دوستی کا حق ادا کردیا۔''

ہم دونوں نے بیک وقت کہا۔ ''ایسا مت کرو، کچھ نہیں ہوگا تم اور ہم مل کر اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرلیں گے۔''

لیکن اچانک ریحان بولا ''ایک بات یاد رکھنا، ہماری دوستی مثالی دوستی تھی۔''

میں نے کہا ''تھی کیوں مثالی دوستی ہے۔'' لیکن ریحان کی بات درست ثابت ہوئی اور وہ فوراً سمندر میں چھلانگ لگا گیا۔ ہم نے فوراً آواز دی۔ ''ریحان..... میرے دوست..... تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

شہباز نے فوراً ریحان کو بچانے کے لئے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ میں نے بھی شہباز کے پیچھے چھلانگ لگادی اور اب ہم تینوں سمندر کی آغوش میں تھے اور یہ ایسا تھا کہ اب شاید اس سے نکلنا ناممکن تھا، ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب ہی تھے، شہباز اور میں ریحان کو پکڑ رہے تھے اور اوپر آرہے تھے مگر لہروں کے زور کے آگے ہماری طاقت جواب دے رہی تھی اچانک ہمارے پاؤں میں رسیاں سی جکڑنے لگیں اور ہمیں کوئی نیچے کی جانب کھینچنے لگا ہم نے لاکھ کوشش کی

مگر ناکام رہے اور بالآخر ہمیں کچھ سمجھ نہیں آیا۔

جب آنکھ کھلی تو ہم نے خود کو نرم نازک گداز بستر پر پایا اور ہمارے سامنے کے بستر پر حسین وجمیل ایک دوشیزہ لیٹی پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو اٹھ کر فوراً بیٹھ گیا اور اپنے آگے پیچھے دیکھا تو دونوں طرف ریحان اور شہباز تھے میں نے انہیں ہلایا تو وہ دونوں بھی جاگ گئے اور میری طرح اٹھ کر بیٹھ گئے اب ہم تینوں کی نگاہیں دوشیزہ کی طرف اور دوشیزہ کی نگاہیں ہم تینوں کی طرف تھیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''مس..... آپ..... ک..... ک..... کون؟''

دوشیزہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ گھبراؤ نہیں تم تینوں محفوظ ہو۔ لیکن تم دوسری دنیا میں پہنچ چکے ہو، تم سمندر میں کافی گہرائی میں پہنچ چکے تھے۔ اور سمندر کی تہہ کے قریب تھے میں کسی اور دنیا کی کھوج ایک عرصے سے لگا رہی ہوں جب سمندر کی تہہ تک پہنچی تو تم تینوں کو دیکھا اور پھر تمہیں ادھر لے آئی اصل میں ہماری دنیا سمندر کی تہہ کے نیچے ہے اب تم لوگ فکر نہ کرو میں تم لوگوں کے لئے کھانا منگواتی ہوں۔'' اور جب وہ کھڑی ہوئی تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس لڑکی کی ایک عدد دم تھی اور پاؤں ایسے تھے جیسے گھوڑے کے ہوتے ہیں باقی جسم نارمل جیسے ہماری دنیا کی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ ویسے وہ لڑکی بے حد حسین تھی مگر اس کے جسم پر موجود دم اور پاؤں اس کی خوبصورتی کو خراب کررہے تھے۔ تھوڑی دیر میں کھانا آگیا کھانے میں روٹیاں جو کہ ہلکے سبز رنگ کی تھیں۔ اور گوشت مرغی کے گوشت سے ملتا جلتا تھا، ذائقہ بہت اچھا تھا اس لئے ہم تینوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

اس کے بعد وہی لڑکی آئی ہمیں مخاطب کرکے بولی۔ ''میں ایک عرصے سے تم جیسے تین نوجوانوں کو تلاش کررہی تھی۔ کیونکہ میرے علم کے مطابق تم لوگوں کی الگ دنیا ہے ہم لوگ ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہماری مدد صرف تمہاری دنیا کے لوگ وہ بھی تین جوان سالہ نوجوان ہی کرسکتے ہیں۔

اگر تم تینوں ہماری مدد کرو تو میں تمہاری جان بخش دوں گی ورنہ تم تینوں کو سزائے موت دے دی جائے گی اور تم اب ہماری دنیا میں قید ہو اس لئے تم یہاں مکمل طور پر بے بس ہو۔''

ہم تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں پر سوالیہ نگاہ ڈالی اور ہامی بھرلی کہ ''ہم آپ کی مدد کریں گے۔''

لیکن اچانک شہباز نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہماری بھی ایک شرط ہے کہ تم ہمیں واپس ہماری دنیا تک بہ حفاظت چھوڑ کر آؤ گی۔'' اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہ حفاظت ہم تینوں کو ہماری دنیا میں چھوڑ کر آئے گی۔

ہم نے کام پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''ہماری دنیا میں ساتھ والے علاقے آسیب نگر میں ایک قبرستان ہے جو کہ بہت پرانا ہے اس قبرستان میں کوئی اور مخلوق بستی ہے۔ جو کہ ہماری دنیا کے لوگوں کو رات کے وقت بہت بری طرح سے چیر پھاڑ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ مگر مخلوق کی شکل وصورت نظر نہیں آتی اور ہماری ان کی آپس میں کیا دشمنی ہے۔ اس بارے میں بھی علم نہیں ہے پھر میں نے اپنے عمل سے معلوم کرلیا کہ ہم اس مخلوق کا مقابلہ نہیں کرسکتے بلکہ وہ دنیا جس کے باشندوں کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے جو کہ ہماری، دنیا کے اوپر آباد ہیں اور وہ بھی کم از کم تین عدد نوجوان ہوں، وہی ہماری مدد کرسکتے ہیں اس دن سے میں تمہاری دنیا میں آنے کی جدوجہد کررہی تھی۔ اتفاق سے تم بھی ہماری دنیا کے کافی قریب پہنچ چکے تھے سو میں اپنے علم سے تم تینوں کو یہاں لے آئی۔ اب آگے کا تم خود ہی اندازہ لگالو کہ ہمارے لئے کیا کرسکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ہم تینوں آج رات کو اس قبرستان میں جائیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ تم نے ہماری وہاں پہنچنے میں رہنمائی کرنی ہے۔''

دوشیزہ نے ہاں میں سر ہلایا اور چلی گئی، ہم

تینوں ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرنے لگے کہ ''آخر کرنا کیا ہے؟''

میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو یہ دنیا بھی ہماری دنیا جیسی تھی بالکل ایسے ہی لگتا تھا جیسے ہم اپنی دنیا میں ہوں مگر فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے لوگوں کے پاؤں جانوروں کے پاؤں جیسے اور پیچھے ایک چھوٹی دم تھی۔

بالآخر شام ہوگئی اور پھر رات کی تاریکی پھیلنے لگی کچھ دیر بعد وہی لڑکی آئی اور بولی۔ ''مقررہ وقت آن پہنچا ہے کیا تم لوگ تیار ہو؟''

ہم تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اس کے بعد اس لڑکی نے ہمیں لوہے کے تین موٹے موٹے راڈ دیئے اور کہا ''حفاظت کے لئے رکھ لو۔''

ہم تینوں کی مسکراہٹ نکل گئی کہ قبرستان میں روحوں، چڑیلوں یا جو بھی وہ مخلوق ہے اس سے لڑنے کے لئے بھلا یہ لوہے کے راڈ کیا کام کریں گے۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا اگر ہم اس لڑکی کا کہا نہ مانتے تو وہ ہمیں ہماری دنیا تک نہ پہنچاتی۔ آخر اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ اور ہم لڑکی کی قیادت میں قبرستان کی جانب روانہ ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم قبرستان کے سامنے تھے اور لڑکی واپس جا رہی تھی ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے رات کی تاریکی قبرستان کے پرہول ماحول کو مزید خوف ناک کر رہی تھی اس وقت تو زندہ انسان بھی اپنے اپنے گھروں کے اندر نیند کی آغوش میں ہوتے ہیں جہاں سے ہم آئے تھے وہ روشنیوں کی دنیا تھی اور یہاں ہر طرف اندھیرے کا راج تھا اب تک سونے والوں کی روشنی کا کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ قائم تھا۔ اور اوپر سے جھینگروں کی پراسرار آوازیں پورے ماحول کو دہلا رہی تھیں۔

قبرستان کے گرد احاطے کی چار دیواری کے ساتھ ہی خاردار جھاڑیوں اور درختوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ اس قبرستان میں اکثریت ان قبروں کی تھی جو کہ پرانی اور شکستہ تھیں دراصل یہ کوئی بہت پرانا قبرستان تھا رات کے سناٹے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی درختوں کو بھیانک بنا رہی تھی۔ درخت رات کی تاریکی کی وجہ سے کسی دیو یا بھیانک بلاؤں کا تصور پیش کر رہے تھے۔ ماحول بہت خطرناک اور ڈراؤنا ہو چکا تھا۔

مگر ہمارے ذہنوں میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اگر کامیاب ہوگئے تو با حفاظت اپنی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ اور اگر ناکام ہوگئے تو یہ لوگ ماردیں گے۔ آخر کار میں نے قبرستان میں پہلا قدم رکھ دیا میرے پیچھے شہباز اور ریحان بھی چلنے لگے دس، بارہ قدم اٹھانے کے بعد ہم تینوں رک گئے کیوں کہ ابھی تک ہمارے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور قبرستان کی پراسراریت جسم و جاں پر وحشت طاری کر رہی تھی۔

ہم تینوں خاموش تھے اور ڈر رہے تھے اور بولنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر بولے تو وہ مخلوق ہماری گردنیں اڑا دے گی پھر تینوں ادھر ،ادھر دیکھنے لگے کہ شاید ان قبروں، درختوں اور جھاڑیوں کے علاوہ کسی اور چیز پر بھی نظر پڑ جائے۔ مگر ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ ہم مکمل طور پر پھنس چکے تھے نہ پیچھے جا سکتے تھے اور نہ آگے کیوں کہ پیچھے دوسری دنیا کے لوگ اس لڑکی کے حکم پر مار دیتے اور آگے یہ عجیب و غریب ڈراؤنا قبرستان میں نادیدہ مخلوق موجود تھی۔

ہمارے دماغ میں کوئی حل نہیں نکل رہا تھا اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ تھا کہ ہم قبرستان کے وسط تک پہنچنے کی کوشش کریں ورنہ ہم ناکام ہو جائیں گے اور ناکامی کی صورت میں دونوں طرف سے موت تھی۔

آخر جب ہم قبرستان کے وسط میں پہنچے تو ایک لمحہ کے لئے ہم تینوں کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ہمیں چھوا ہو، ہم نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو ہمیں سوائے تاریکی کے کچھ نہ دکھائی دیا۔

اچانک دو عدد سائے ہمارے سامنے نمودار ہوئے۔ ایک سایہ ذرا پتلا تھا اور دوسرا درمیانہ سا، ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مرد اور عورت ہوں، میں نے حوصلہ کر کے مخاطب کیا۔ ''کو..... کون..... آپ کون.....؟''

''ڈرو مت ہم آپ کی ہی دنیا کے لوگ ہیں ہمیں اس لڑکی نے خود اپنے علم سے بلایا ہے اور وہ ہمیں یعنی خدائے مصر کو قید کرنا چاہتی ہے ہم ساڑھے پچیس ہزار سال سے خنوط ہو کر سو رہے تھے مگر اس لڑکی نے ناقص علم کر کے ہمیں جگایا اور اوپر سے ہماری اجازت کے بغیر ہمارے محلے سے ہمیں اپنے علم کے ذریعے یہاں لے آئی، میں یہ باتیں آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم تینوں بھی میری ہی دنیا سے تعلق رکھتے ہو۔''

یہ سن کر ریحان نے کہا ''محترم خدائے مصر اس لڑکی سے اور اس لڑکی کی دنیا والوں سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔''

''نہیں میں خدائے مصر فرعون اور میری بیوی شہزادی فرطانہ کبھی بھی معاف نہیں کر سکتے۔ اس سے پہلے بھی یعنی آج سے چودہ سال پہلے بھی اس لڑکی کے باپ نے ایک غلط عمل کر کے ہمیں خنوط کرنے کا علم چرا لیا تھا ہم نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی اس کے خوابوں میں آ کر اسے ڈرایا، سمجھایا کہ خنوط صرف فرعونوں کا علم ہے اور وہی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ باقی دنیا کے لوگ تو دور کی بات۔ ہماری اپنی دنیا کے لوگ بھی خنوط نہیں کر سکتے۔''

''لیکن.....'' ریحان کچھ کہتے، کہتے خاموش سا ہوگیا پھر کسی عورت کی آواز آئی جو سائے کے روپ میں دوسرے سائے کے ساتھ تھی ظاہری بات ہے وہ شہزادی فرطانہ تھی۔ ''بولو رک کیوں گئے؟''

''اصل میں بات یہ ہے کہ ہمیں یہاں پر دھوکہ سے'' اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ہم جانتے ہیں تم بے فکر ہو جاؤ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں یہ بہ حفاظت جہاں سے لایا گیا ہے وہیں پر چھوڑ دیا جائے گا لیکن اس لڑکی کے غلط عمل کی وجہ سے ہم اور ہماری شہزادی فرطانہ دونوں اس قبرستان میں آ گئے اس دنیا میں، اور اب ہم واپس صرف اسی صورت میں جا سکتے ہیں کہ اگر تم تینوں کو میں اپنے ماضی میں پہنچا دوں اور وہاں سے تم ہماری خنوط شدہ ممیوں کے ایک، ایک دانت لے آؤ کیونکہ ہم ابدی نیند سو چکے ہیں اور ابدی نیند کی وجہ ہماری نسلوں میں دانتوں کی بیماری تھی جس کا علاج نہ مل سکا اور رفتہ رفتہ ہم جو خدائے مصر کہلاتے تھے اور ہماری شہزادی فرطانہ جو حسن میں پریوں کو بھی مات دیتی تھی نہ بچ سکی۔ لیکن مرنے سے پہلے ہم نے اپنی نسلوں کی لاشوں کو خنوط کر لیا تھا۔ اب تم تینوں ہمارے ماضی میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے جس کا ہم نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

وہ ایک بہت بڑا محل تھا۔ جس کے گرد جیل سے اونچی اور مضبوط فصیل تھی، فصیل کے ہر کونے پر مضبوط ترین دفاعی چبوترے بنائے گئے تھے محل کے چاروں طرف برآمدے تھے جن میں قدرتی روشنی کے علاوہ مصنوعی روشنی کا بھی انتظام تھا اس محل کی کرسی سطح زمین سے غیر معمولی طور پر بلند تھی اس میں رہنے والے افراد بھی محل کی طرح ہی لمبے چوڑے اور مضبوط سراپا کے مالک تھے۔ ہر طرف حسن کے جلوے بکھرے پڑے تھے۔ لیکن ہمیں اپنا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم خود بخود آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

اچانک ہمیں اپنے وجود محسوس ہونے لگے ہم نے اپنے چاروں طرف دیکھا ہم مکمل طور پر اس محل میں ایک بڑے کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اندر مختلف تابوت پڑے تھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا کیا جائے..... تابوت کے درمیان اور اوپر لکھا تھا اکیسویں خاندان کی خنوط شدہ ممی۔

پھر سامنے کی جانب دیکھا تو وہاں پر ایک بڑے سے تختے پر لکھا تھا تاریخ فرعون.....

اس پر بہت ساری تفصیل لکھی ہوئی تھی مگر ہم

تینوں وہ دوحنوط شدہ ممیوں کو تلاش کررہے تھے کہ آخر کون سے تابوت میں ہیں۔؟

ریحان کی نظر سامنے پڑے دو تابوتوں پر پڑی جو باقی سب تابوتوں سے بڑے اور اونچی جگہ پر تھے ہم تینوں سمجھ گئے کہ یہ تابوت فرعون اور شہزادی فرحانہ کے ہی ہوں گے۔ چنانچہ ہم ان تابوتوں کے قریب گئے جیسے ہی دونوں تابوت کھولے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی ان دونوں تابوتوں میں فرعون اور شہزادی فرحانہ ایسے سوئے ہوئے تھے کہ جیسے ابھی ابھی لیٹے ہوں ان دونوں کے جسم بالکل تندرست نظر آرہے تھے۔

بہرحال ہم نے ان دونوں کے ہونٹ کھولے اور ایک ایک دانت نکال لیا، ہم اچنبھے میں تھے کہ ہم نے جیسے ہی دانتوں کو ہلایا تو وہ دونوں دانت اپنی جگہ سے ہٹ کر ہمارے ہاتھوں میں خود بخود آ گئے تھے۔

پھر اچانک ایک دم جہاں، جس قبرستان سے آئے تھے اسی جگہ پہنچ گئے ہمارے سامنے فرعون اور شہزادی فرحانہ کی روحیں کھڑی تھیں۔ ہم نے فوراً دونوں دانت انہیں دے دیئے۔ اس کے بعد ایک دم طوفان سا آ گیا، جس سے زمین کانپنے لگی، قبریں زمین کے اندر دھنسنے لگیں اور اس دنیا کے لوگ خود بخود مرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب طوفان تھما تو ہمارے سامنے فرعون اور شہزادی فرحانہ بالکل اصلی حالت میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

پھر دونوں بلند آواز سے بولے۔ ”ہم نے اس دنیا کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ اب تم تینوں آمادہ ہو..... جاؤ اپنی دنیا میں، اپنی آنکھیں بند کرو، تم جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ جاؤ گے۔“

ہم نے ایسا ہی کیا تو چند لمحے بعد ہمارے کانوں میں سمندر کی لہروں کی آواز گونجی۔ ہم نے آنکھیں کھولیں تو ہم اپنی بوٹ میں موجود تھے، میں نے فوراً ریحان اور شہباز کو مخاطب کرکے کہا..... ”یار جلدی چلو واپس۔“

ہم نے واپسی کی راہ لی..... جو کچھ کھانے کے لئے ساتھ بوٹ میں لائے تھے وہ سب کچھ مکمل طور پر خراب ہوگیا تھا جانے کتنے دنوں سے ہم اس دنیا میں موجود تھے۔

ہم نے ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہماری بوٹ کا ڈیزل ختم یا اس کے انجن میں کوئی خرابی آ گئی ہم تینوں نے بہت کوشش کی مگر ناکام رہے ریحان اور شہباز کا ڈر کے مارے برا حال ہو رہا تھا، میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا۔ ”ڈرو نہیں ہم آخری دم تک کوشش کرتے رہیں گے مجھے پورا یقین ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔“

کچھ دیر بعد تھوڑے فاصلے پر ہمیں ایک اور بوٹ نظر آئی۔ میں نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ اور مدد کے لئے پکارو۔“ ہم نے بہت اشارے کئے اور اونچی اونچی آوازیں دیں مگر ناکام رہے۔ اب بوٹ ہمارے سامنے سے گزر رہی تھی۔

شہباز نے کہا۔ ”ایک ترکیب کہ ہم پانی میں چھلانگ لگاتے ہیں اور تیرتے ہوئے بوٹ تک پہنچ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہماری بوٹ کے بالکل قریب ہے۔“

ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی اور پھر چند منٹ میں بوٹ کی ایک سائیڈ کو پکڑ کر ہم بوٹ کے اندر قدم رکھ چکے تھے۔

لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بوٹ میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ”آخر یہ بوٹ خود بخود کیسے چل رہی ہے اور یہاں تک کیسے آئی ہے۔ لیکن بوٹ کے تہہ خانے میں کافی ساری لاشیں پڑی ہوئی تھیں جو بوسیدہ ہو چکی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان لوگوں کو مرے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ سامنے ہی ایک صندوق دکھائی دیا، اس پر بہت گرد و غبار پڑی تھی۔ ریحان نے صندوق کھولا تو ہم حیران رہ گئے کیونکہ اس صندوق کے اندر ہیرے جواہرات سونا چاندی موجود تھے۔ شہباز نے صندوق سے ایک ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور پہن لی پھر ریحان نے بھی ایک انگوٹھی پہن لی۔ میں نے کچھ نہ اٹھایا بلکہ سوچ رہا تھا کہ ”آخر یہ خزانہ ہمیں ہی کیوں ملا

اس کا مالک کون ہے؟ اس کے مالک نے خزانے سے بھری بوٹ بے یار و مددگار سمندر میں ڈال دی اس میں پڑی ہوئی بوسیدہ لاشیں، یہ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور لے جوآئے گی، کیونکہ پہلے بھی ہمارے ساتھ دھوکا ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم دوسری دنیا میں پہنچ گئے تھے۔“

اتنے میں ایک کرخت سی آواز ہمیں سنائی دی ۔ہم تینوں اس وقت خزانے کے صندوقوں سمیت تہہ خانے سے باہر آ چکے تھے جب ہم تینوں نے اس آواز کے تعاقب میں دوبارہ تہہ خانے میں پہنچے تو مارے خوف کے ہمارے چہرے زرد ہو گئے ایک مردہ زندہ ہو چکا تھا وہی مردہ جو بوسیدہ ہو گیا تھا وہ کہہ رہا تھا ”اٹھو میرے ساتھیو! ہمارا خزانہ خطرے میں ہے۔ اٹھو اکیسویں خاندان کی آخری پشت کے فرعونو..... اٹھو۔“

اس نے تین بار یہ بات دہرائی پھر اچانک سارے مردے اٹھ کھڑے ہوئے ہم تینوں سمجھ گئے کہ ان کا تعلق فرعون کے خاندان سے اور یہ بھی حنوط شدہ ممیز تھیں۔ مردے ہمیں دیکھتے ہی ہمارے پیچھے لپکے۔

ہم نیچے سے بھاگ نکلے اور اوپر آ کر چھپ گئے کیونکہ ہم بے بس تھے۔ ہماری جو اپنی ہم سے بہت دور جا چکی تھی اور بوٹ تھی بھی خراب اگر قریب ہوتی تب بھی ہم کچھ نہ کر پاتے۔ لیکن بوٹ کافی بڑی تھی اس لئے چھپنے کی جگہ کافی تھی وہ ہمارے تعاقب میں اوپر آ گئے اور بولے۔ ”جس نے فرعونوں کی آخری پشت کی حنوط شدہ ممیز کے خزانے کی طرف بری نگاہ سے دیکھا وہ زندہ نہیں رہے گا۔“

اور پھر انہوں نے ریحان کو پکڑ لیا اور تلوار کا وار کرکے اس کی گردن اڑا دی۔ ہم دونوں یہ دیکھ کر آخری انتہا تک خوف زدہ ہو گئے، وہ تعداد میں زیادہ اور ہم سے طاقت میں بھی زیادہ تھے۔

ہم چاہتے ہوئے بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ہم دونوں وہاں سے بھاگ نکلے اور دوسرے کونے میں چھپ گئے مگر وہ آہستہ آہستہ ہمارے قریب آنے لگے۔

ان کی نظر شہباز پر پڑ گئی اور انہوں نے شہباز کو دبوچ لیا شہباز کی چیخ و پکار میرے کانوں میں پڑ رہی تھی مگر میں بے بس تھا، لاچار اور مجبور تھا، مجھے پتا تھا کہ اگر میں سامنے آیا تو میرا حال ان دونوں سے بھی شاید بدتر ہو، چند منٹ میں ہی انہوں نے شہباز کو مردہ کرکے ڈال دیا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ ”اگر کوئی ہمارے خزانے پر بری نگاہ ڈالے گا تو اس کا یہی حشر ہوگا چلو ساتھیو! پھر سے سو جاؤ اور تب تک جب تک کوئی ہمارے خزانے کو ہاتھ نہیں لگاتا اور ہم میں شامل نہیں ہو جاتا انہوں نے ریحان اور شہباز کی لاش کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ تہہ خانے میں لے گئے اور ساتھ ہی خزانے کے صندوق کو بھی۔

میں تھوڑی دیر بعد جس کونے میں چھپا ہوا تھا وہاں سے باہر آ کر رونے لگا کہاں ہم تین دوست تھے اور اب میں اکیلا ہی زندہ ہوں۔

میں یہ بات سمجھنے کے لئے دوبارہ ڈرتے ڈرتے اسی تہہ خانے میں جا پہنچا دیکھا تو میرے دوست بھی ان کے ساتھ پڑے تھے ان کی لاشیں بھی اسی طرح ان میں شامل تھیں۔

میں غم میں ڈوبا ہوا تہہ خانے سے باہر نکلا اور دیکھا کہ جس بوٹ پر ہم پہلے سوار تھے وہ بوٹ اب لہروں کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے اس بوٹ کے قریب تھی۔ اور پھر چند منٹ میں ہی میں اپنی بوٹ میں تھا۔

آخر کار کوشش کے بعد بوٹ کو اسٹارٹ کیا، بوٹ ایک دم سے اسٹارٹ ہوگئی۔

خوشی کے مارے میری انتہا نہ رہی۔ میں نے ساحل سمندر کی طرف سفر شروع کر دیا۔ آخر کار پوری رات بھوکے پیاسے سفر کرتا رہا صبح ساحل تک پہنچا۔ گھر پہنچتے ہی گر پڑا۔ حالت بہت نازک ہوگئی تھی مگر بروقت علاج معالجے کی وجہ سے بچ گیا۔ میں نے گھر والوں کو سارا واقعہ سنایا اور آئندہ اپنے مشغلے، شوق اور سمندری سفر سے توبہ کر لی۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 97

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

پھر اچانک ایک آہٹ کی آواز سنتے ہی کامنی نے میرے ہونٹ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تاکہ میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکے۔ ''پرتاب..... پرتاب..... ارے یہ تو سویا پڑا ہے، یہ رام لال جی کی آواز تھی، وہ آواز دے کر کمرے سے نکل گئے پھر کامنی کی سرگوشی سنائی دی بابو جی۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے آپ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اگر آپ بول پڑتے تو ظلم ہوجاتا میری موجودگی کا رام لال جی کو پتہ چل جاتا۔ پھر میں نے سرگوشی کی، کامنی یہ تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جو آ گیا تو کامنی بولی۔ بابو جی! ابھی تو میں جارہی ہوں صبح کے وقت بتادوں گی کہ وہ کون ہے اور تر نت وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ صبح کے وقت معلوم ہوا کہ اس نے رات سے ایک شخص دھن راج کا خون کردیا تھا۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ایک خونی آتما ہے، اس کا نام گوپی تھا۔ گوپی اپنے وقت کا بہت شریف اور پیار منش آدمی تھا لیکن گاؤں کے ٹھاکر نے اسے موت سے ہمکنار کردیا تھا، اس کے پورے پریوار کو جلا کر راکھ کردیا تھا۔ اس کی ایک پتنی تھی سندری جو کہ واقعی بہت سندر تھی، ٹھاکر اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے سندری کے ساتھ ظلم کیا، اس کے بعد سندری کو بھی مار کر ایک گڑھا کھود کر گڑھے میں دبادیا تھا۔ اس کے بعد گوپی کی آتما نے ٹھاکر کے ساتھ ناقابل فراموش سلوک کیا، ٹھاکر کو موت سے تر ساتر سا کر موت سے دوچار کردیا، اس کے بعد ٹھاکر کے پورے پریوار کو بھی ٹھکانے لگادیا اور اب گاؤں والوں کو انتقام کا نشانہ بنا رہا تھا۔ پنڈت جی نے گاؤں کے داخلی راستے پر ترشول گاڑ کر کنڈل قائم کردیا تھا مگر کسی پاپی نے اپنا نشہ پورے کرنے کے لئے ان ترشولوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ اور جب کنڈل ختم ہوگیا تو گوپی کی آتما دندناتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئی اور کئی ڈھور ڈنگر کے ساتھ ساتھ دھن راج کا خون پی گئی۔ گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ مندر کے بڑے پنڈت جی بھی بہت بیاکل تھے کہ کسی طرح بھی گوپی کی آتما کا خاتمہ ضروری ہے اس لئے پنڈت جی اپنے گرو جی کے پاس رام لال جی کے ساتھ چلے گئے تاکہ گرو جی گوپی کی آتما کے خاتمے کے لئے کوئی تدبیر کردیں۔ رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا۔ کمرے میں بھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کامنی میرے پہلو میں لیٹی تھی کہ اچانک کسی گھوڑے کے ہنہنانے اور اس کے ٹاپوں کی آواز سن کر کامنی لرز کر رہ گئی، اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی اور جیسے اس پر سکتہ طاری ہوگیا وہ اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لائی اور میرے کان میں گھبرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ''پرتاب! بھگوان خیر کرے!''

(اب آگے پڑھیں)

''**پرتاب**..... اب..... کیا ہوگا۔'' کامنی کی آواز میں لرزش شامل تھی۔ اس کی حالت غیر ہوگئی تھی۔

''کامنی..... آخر ہوا کیا۔ بتاؤ تو سہی۔'' میں نے پوچھا۔ میں اس کے بالوں میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرنے لگا۔ ''گھبراؤ نہیں..... بتاؤ کہ یہ اچانک کیا ہوگیا؟''

''پ..... پ..... تاب۔''

اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی.....

''چلو! جلدی سے بتاؤ..... ہوا کیا؟''

کافی دیر تک وہ مجھ سے لپٹی رہی۔ ''میں برابر اسے ڈھارس دیتا رہا۔''

گھوڑے کے ہنہنانے اور ٹاپوں کی آوازیں اب قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھیں اور سے کے ساتھ ساتھ اس پر لرزش طاری ہورہی تھی۔ اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ میں نے اسے اپنا

پوری قوت سے بھینچ لیا تو اس کے منہ سے نکلا.....
"پرتاب....."

"ہاں! بولو..... کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ بے سدھ سی ہو رہی تھی..... خیر میرے پوچھنے پر وہ بڑی مشکل سے الفاظ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"پرتاب..... آج وہ پھر آ گیا۔"

"ارے بولو تو سہی کون آ گیا؟"

"اس نے بہت لمبا سانس کھینچا اور بولی۔

"گوپی..... آ گیا ہے۔"

"گوپی آ گیا..... کون گوپی آ گیا....." میں نے پوچھا۔

"ارے وہی..... گوپی کی آتما۔ جس نے دھن راج کا خون کر دیا تھا۔"

میں کامنی کی بات سن کر چونکا، کیونکہ اس وقت کامنی کی قربت اور پھر اس پر بدحواسی نے میرے دماغ سے بالکل بھی گوپی والی بات نکال چکی تھی۔

اچانک میں خود بھی اندرونی طور پر سہم کر رہ گیا۔ مگر پھر بجلی کا کوندا میرے ذہن میں لپکا، کہ اگر میں بھی ہمت ہار بیٹھا تو یہ کامنی گئی اپنے کام سے کیونکہ اس وقت جو اس کی حالت ہو رہی تھی جو بیان سے باہر ہے۔

"پرتاب..... پنڈت جی بھی نہیں ہیں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ادھر کا رخ کر بیٹھے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ابھی بھی بدستور، مجھ سے وہ لپٹی پڑی تھی۔

اچانک پھر ہم دونوں دہل کر رہ گئے کیونکہ ایسا لگا کہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ہمارے کمرے کی دیوار کے پاس سے آئی تھی۔ میں نے خود پر قابو پایا اور جھٹ سے کامنی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اگر اس وقت میں ایسا نہ کرتا تو دہشت کی وجہ سے کامنی کے منہ سے یقیناً فلک شگاف چیخ نکل گئی ہوتی۔

پھر ایسا لگا کہ باہر دیوار سے کوئی وزنی اور بھاری چیز ٹکرا رہی ہو۔ جس کی وجہ سے واضح طور پر دھمک اندر کی طرف محسوس ہو رہی تھی۔

کامنی کا خوف بری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ ٹس سے مس ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ بیرونی دیوار سے اس وزنی شے کے ٹکرانے کی دھمک اب بھی اندر محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک کان پھاڑ دینے والی ایک آواز سنائی دی جیسے گھوڑے کو کسی نے خنجر مار دیا ہو، گھوڑے کی ناقابل فراموش ڈکرانے اور ہنہنانے کی آواز نے پورے علاقے کو دہلا کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک کربناک انسانی آواز بھی سنائی دی۔ جیسے کسی انسان کو ناقابل برداشت حد تک اذیت سے دوچار کر دیا گیا ہو۔

گھوڑے کے ہنہنانے کی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ گھوڑا اب دور جا رہا ہو۔ اس کے ٹاپوں کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پھر گھوڑے کے دوڑنے اور ہنہنانے کی آوازیں بہت دور چلی گئیں بلکہ اب یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اب ہمارے کان بج رہے تھے کیونکہ دہشت نے ہم دونوں کو بری طرح دبوچ لیا تھا۔ جب تمام آوازیں معدوم ہو گئیں تو میرے حواس کچھ بحال ہوئے، اس وقت تک ہم دونوں بے سدھ ایک دوسرے کو دبوچے بیٹھے تھے۔

"کامنی..... ہوش کرو..... دیکھو..... اب کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی..... تم خود سن لو۔" میں نے کہا۔ اور ساتھ ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چونکہ پورے کمرے میں گھپ اندھیرا مسلط تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کو دیکھ تو نہیں سکتے تھے بلکہ صرف آواز کی سرگوشی اور ہاتھ کے لمس سے ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔

"کامنی..... کامنی..... وہ چلا گیا..... ہوش کرو....." میں نے کہا تو کامنی جیسے چونک گئی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔ "چلا گیا..... کدھر گیا۔ وہ پھر آ جائے گا۔"

"وہ اب نہیں آئے گا....." میں نے کہا۔

"نہیں آئے گا....." میں نے محسوس کیا کہ کامنی کے حواس بھی اب کچھ بحال ہو گئے تھے۔ بہرحال اب

بھی اس پر لرزش طاری تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑ دیا تو وہ چونک گئی۔ "کامنی ڈرو نہیں، میں ہوں ناں، ہوش کرو..... وہ جا چکا ہے اور میں تمہارے قریب ہوں، پھر بھی تم ڈر رہی ہو، ہم مندر میں ہیں..... اور کسی صورت بھی وہ مندر میں نہیں آ سکتا، اور اگر اس نے اس جگہ آنے کی کوشش کی تو..... دیوی ماں ہماری رکھشا کرے گی۔ چلو پانی پی لو۔" میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تو ایک ہی سانس میں اس نے پورا پانی پی لیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر میں نے گھڑے سے پانی نکالا تھا۔

پانی پینے کے بعد اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اسے اپنے برابر میں لٹا دیا۔ وہ بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔ تو میں بھی لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسمسائی اور اپنا ہاتھ میرے چہرے پر پھیرا، اور پھر بولی۔ "پرتاب آج اگر تم میرے پاس نہ ہوتے تو میں مر چکی ہوتی۔ مجھے ان خونی آتماؤں سے بہت ڈر لگتا ہے، میں کسی بھی صورت مرنا نہیں چاہتی، میں اپنے جیون کو ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی اچھا یہ ہے کہ مجھے کوئی بہت زیادہ چاہنے والا ہو۔"

اور میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کامنی! میں ہوں ناں، تمہیں سب سے زیادہ چاہنے والا۔ تمہیں میری چاہت پر شک ہے کیا۔ اب تم یہ چنتا چھوڑ دو۔ میں تمہیں اپنی جان سے بڑھ کر چاہنے لگا ہوں۔ تم فکر نہ کرو تمہاری تمام اچھائیں پوری ہوں گی۔ تم بہت جلد دلہن بنو گی اور پھر میرے دل پر راج کرو گی۔"

"سچ پرتاب۔" اور یہ بول کر اس نے میرے گال کو چوم لیا۔ بہرحال اس طرح کی باتیں آنے والے سمے کے متعلق ہوتی رہیں۔ پھر اچانک اس نے مجھے بھینچ لیا اور والہانہ انداز میں بولی۔ "پرتاب اب صبح ہونے والی ہے، کچھ دیر میں اجالا پھیل جائے گا۔ اب تم جلدی سے اٹھو اور اشنان کر لو، کیونکہ آج تمہیں مندر بھی کھولنا ہے، پنڈت جی بول کر گئے تھے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

بات تو کامنی کی ٹھیک تھی کیونکہ جاتے سے رام لال جی یہ ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال گئے تھے، کہ ان کی غیر موجودگی میں دو دن میں نے مندر کو کھولنا تھا۔

کامنی بولی۔ "پرتاب، اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دونوں اٹھ جائیں اور مجھے میرے کمرے میں نہ پا کر کسی شک میں پڑ جائیں، تم اشنان کر لو، میں بھی تھوڑی دیر میں اشنان کر کے تمہارے لئے ناشتہ لاؤں گی۔" یہ بول کر وہ اٹھی اور میرے گال تھپتھپاتی ہوئی انداز دلربائی سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ترنت میں بھی اٹھا۔ اپنے کپڑے لئے، اشنان کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں جب میں اشنان کر کے باہر نکلا تو دیکھا کہ واقعی صبح کا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اور گزرے حالات واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ کامنی گرما گرم ناشتہ لے کر آ گئی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ "پرتاب اب جلدی سے ناشتہ کرو، اور جا کر مندر کھول دو، لوگوں کے آنے کا سمے ہو رہا ہے، تھوڑی دیر میں ہم بھی آ جائیں گے۔

تمہیں یہ تو پتہ ہے ناں کہ مندر میں جاتے ہی سب سے پہلا کام کیا کرتے ہیں، میں بتائے دیتی ہوں، مندر کا دروازہ کھول کر اندر جانا، سب سے پہلے دیوی ماں کو پرنام کرنا اور مندر کی گھنٹیاں بجا دینا، گھنٹیوں کی آواز سنتے ہی ہم تینوں بھی آ جائیں گے، پھر باقی کا کام ہم خود سنبھال لیں گے۔"

"اچھا مہارانی، آپ چنتا نہ کریں! جو آپ کا حکم۔" جب میں نے یہ کہا تو وہ مسکراتی ہوئی برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے سے نکلا اور مندر کے پاس جا کر مندر کا تالا کھولا، اندر قدم

رکھا، دیوی ماں کو پرنام کیا اور گھنٹیاں بجانے لگا۔ اتنے میں وہ تینوں کامنی اور اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں بھی آ گئیں باقی کے کام وہ کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر میں سب سے پہلے ایک ضعیف شخص مندر میں آیا، اس نے ہاتھ جوڑ کر دیوی ماں کو پرنام کیا۔ وہ گنیش کاکا تھے۔ ان کے چہرے پر واضح طور پر ملال نظر آ رہا تھا، غم کی وجہ سے ان کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ وہ گردن جھکائے دیوی ماں کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک وہ اس حالت میں بیٹھے رہے۔

اتنے میں کامنی کی آواز سنائی دی۔ ''گنیش کاکا، سب خیریت تو ہے ناں، آج آپ کچھ زیادہ فکر مند لگ رہے ہیں، سب ٹھیک تو ہے ناں۔''

''کامنی کی آواز سن کر انہوں نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں واضح طور پر نمی نظر آ رہی تھی۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولے۔ ''پتر خیریت نہیں۔ رات سے گوپی کی آتما نے بہت زیادہ بربادی کر دی، پانچ لوگوں کا اس نے خون کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ کوئی درجن بھر ڈھور ڈنگر بھی مار دیئے ہیں۔ پورے گاؤں میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں، کوئی بھی سکھی نہیں۔ آج دونوں پنڈت جی بھی موجود نہیں ہیں۔

جس سے گوپی کی آتما آئی تھی، اس کے گھوڑے کے ہنہنانے اور ٹاپوں کی آواز سے جیسے پورے گاؤں والوں کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہئے تھا، کیونکہ بڑے پنڈت جی نے گاؤں میں آنے والے راستے پر کنڈل کر دیا تھا۔

اور جب کنڈل کر دیا تو ایسا کیوں ہوا، کنڈل کے ہوتے ہوئے کسی صورت بھی وہ اندر نہیں آ سکتا، لگتا ہے ضرور کوئی نہ کوئی درگھٹنا ہوئی ہے۔

گاؤں بھر میں سارے لوگ آنسو بہا رہے ہیں، لوگ غم سے چور چور ہیں۔ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے، سب لوگوں کا کریا کرم کرنا بھی ضروری ہے، خیر اب میں چلتا ہوں، آج مندر میں زیادہ لوگ نہیں آئیں گے، غم کی وجہ سے تو لوگوں سے چلنا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔ اچھا پتر، بھگوان کرپا کرے۔'' یہ بول کر گنیش کاکا اٹھے اور اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے مندر سے چلے گئے۔

گنیش کاکا کی باتیں سن کر ہم چاروں سکتے کی حالت میں آ چکے تھے۔ گنیش کاکا کے جانے کے بعد تین چار بوڑھے لوگ مندر میں آئے اور دیوی ماں کو پرنام کرنے کے بعد جلدی سے چلے گئے۔

غم کی وجہ سے پورے گاؤں میں ویرانی پھیلی تھی۔ ہر طرف اجاڑ اجاڑ لگتا تھا۔ جس گھر کے لوگ مر گئے تھے اور جن کے ڈھور ڈنگر ضائع ہو گئے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو سیلاب کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد کامنی کے کہنے پر میں نے مندر بند کر دیا۔ مندر سے نکل کر ہم چاروں گاؤں کے چوپال میں آ گئے۔

مرنے والے پانچوں لوگوں کو ایک ہی جگہ رکھا گیا تھا۔ اور پورا گاؤں اس جگہ موجود تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ ڈرے ڈرے اور سہمے نظر آ رہے تھے۔ کامنی اور اس کی دونوں ساتھی، عورتوں میں جا کر بیٹھ گئیں جبکہ میں مردوں میں بیٹھ گیا۔

دن کے ڈیڑھ بجے پانچوں ارتھی اٹھائی گئیں..... وہ سے بہت ہی غمزدہ تھا۔ لوگوں کا رونا اور بلکنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ہر کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ ''رام نام ست ہے، رام نام ست ہے۔'' کی صدا میں مرنے والوں کو لے کر سب لوگ شمشان کی طرف چلے۔ شمشان میں پہنچ کر پانچوں کو چتا پر لٹا دیا گیا اور پھر ان کی چتاؤں سے آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

دن کے تین بجے سارے لوگ شمشان سے واپس آئے اور چوپال میں بیٹھ گئے اور جانے والوں کے ذکر میں مصروف ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سورج اپنی آخری منزل پر پہنچنے کے لئے کوشاں ہو گیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہم چاروں مندر میں واپس آ گئے۔ باہر کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا۔ تینوں لڑکیاں رات کا کھانا پکانے میں جٹ گئیں

اور میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا، بھگوان نے انسان کے لئے بھوک کا عجیب چکر چلا دیا ہے۔ آندھی آئے، طوفان آئے، زلزلہ آئے، انسان شانتی میں بھی ہو یا پھر غم سے چور چور ہو، گھر میں ہو یا میدان جنگ میں، ہر جگہ بھوک انسان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔

اس سے میرا بھی حال یہی تھا۔ پوری طرح بھوک نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ بہر حال کھانا تیار ہونے میں جتنا سے لگتا تھا وہ تو لگنا تھا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور میں کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ کوئی پونے آٹھ بجے کامنی کا درشن ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ میں بھوجن کی تھالی تھامے ہوئے تھی۔

وہ اندر آئی اور میرے سامنے تھالی رکھ دی۔ اسے دیکھتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے گھڑے میں سے پانی نکالا اور گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ ''کامنی چلو تم بھی کھاؤ۔'' میں نے کہا اور ایک نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالا۔ مسکراتے ہوئے اس نے منہ کھول دیا۔ اور پھر نوالہ چبانے لگی۔ پھر بولی۔ ''اب تم کھاؤ، میں چلتی ہوں، وہ دونوں میرا انتظار کر رہی ہیں، میں نے کہا کہ میں پرتاب بابو کو بھوجن دے کر آتی ہوں، چونکہ یہ روز کا معمول ہے کہ ہم تینوں اکٹھا ہی بھوجن کرتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ کوئی زیادہ کھائے یا کوئی کم۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، تم آرام سکون سے بھوجن کرو، میں بعد میں آؤں گی، بھوجن کے بعد تھوڑی دیر ان کے پاس بھی بیٹھنا ہوگا، میں انہیں اطمینان دلانے کے بعد آؤں گی۔''

اور یہ بول کر تر نت کامنی کمرے سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بھوجن کیا، بس چند نوالے کھانے کے بعد گھڑے کا پانی پیا اور برتن ایک طرف رکھ کر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی سارے حالات واقعات فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔ گوپی کی آتما، اس کے سنگ بیتے حالات، اس پر ہونے والے ظلم اور جب اس کی آتما ظالم بنی تو بعد میں لوگ بلبلا اٹھے اور آج کے لوگ اسے ظالم، دشٹ، خونی اور نہ جانے کیسے کیسے القاب سے یاد کر رہے تھے۔

دنیا میں لوگوں کا عجیب حال ہے، جب ایک شخص یا پھر بہت سے لوگ اپنی طاقت، بل بوتے اور دھن دولت کے سبب ظالم و جابر بن جاتے ہیں، لوگوں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں، لوگوں پر ناقابل برداشت اور ناقابل یقین حد تک اپنی ذات سے لوگوں کو اذیت پہنچاتے ہیں تو ان کا فعل ان کی اپنی نظر میں اچھا ہوتا ہے اور جب کوئی دوسرا ان کے ساتھ سے بیتنے کے بعد اسی ظلم کا بازار گرم کر دیتا ہے تو وہی ظالم شخص دوسرے کو ظالم کہنا شروع کر دیتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو گوپی ظالم نہیں تھا، ظلم کو وہ بہت برا سمجھتا تھا، مگر جب ہوس پرست ٹھاکر نے اس کے ساتھ ظلم کیا، اس کی عزت برباد کر دی اور پھر اس کے پورے پریوار کو موت سے ہمکنار کر دیا۔ اگر گوپی کے ساتھ ناقابل برداشت ظلم نہ ہوتا تو آج گوپی کی آتما خونی نہ بنتی، کتابوں میں میں نے پڑھا تھا کہ زن، زمین زر کے چکر میں جو کچھ نہ ہونے کے وہ ہوتا ہے۔ ان تینوں چیزوں کے سبب دنیا میں انقلاب آتے ہیں، خونی جنگیں ہوتی ہیں جس سے خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ قبیلے کے قبیلے بلکہ ملک کے ملک خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

میں نے کالج کے وقتوں میں اپنے مسلمان دوستوں سے سن رکھا تھا کہ اس دنیا میں جب سب سے پہلے انسان نے قدم رکھا تو وہ بھی زن کا ہی چکر تھا یعنی مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق، دنیا اور آسمان بنانے والے اللہ نے سب سے پہلے اپنے فرشتوں کو پیدا کیا اور پھر مٹی کا ایک پتلا بنا کر ابلیس کو حکم دیا کہ وہ اس مٹی کے پتلے کو سجدہ کرے، مگر ابلیس نے اپنے مالک کا حکم نہ مانا تو اللہ نے ابلیس کو نافرمان کہہ کر اپنے دربار سے نکال دیا، پھر اللہ نے اس مٹی کے پتلے میں جان ڈالی اور اس طرح اس انسان جس کا نام آدم تھا اس کو سورگ میں رکھا، اکیلا انسان اپنے اکیلا پن سے اکتا گیا تو اللہ نے اس انسان کی پسلی سے ایک زن پیدا کیا، اور پھر وہ دونوں سورگ میں رہنے لگے اور پھر ان دونوں

نے ایک دن اپنے اللہ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کی۔
اللہ اپنے حکم کی خلاف ورزی پر ناراض ہوگیا اور پھر ان دونوں مرد و زن کو دنیا میں بھیج دیا۔ جب وہ دونوں زمین پر آئے اور اپنی ضرورتوں کے مطابق ہاتھ پیر چلانے شروع کردیئے اور اس طرح دنیا میں انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔

میرے مسلمان دوستوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ دنیا میں پہلا قتل عورت کی وجہ سے ہی ہوا، اور پھر آہستہ آہستہ دنیا میں آبادی بڑھتی گئی، انسان انسان پر اپنی برتری اور دھونس دھمکی سے ایک دوسرے کو زیر کرنے لگا۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایشور نے عورت میں مرد کے لئے ایک کشش رکھی ہے کہ اس کشش کے چکر میں عورت کے نزدیک کھنچتا چلا جاتا ہے۔ عورت اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اور اس اچھائی اور کشش کی وجہ سے عورت مرد کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اور پھر مرد اسے حاصل کرنے کے لئے سو جتن کر ڈالتا ہے اگر آسانی سے وہ عورت اسے مل جائے تو ٹھیک ورنہ پھر مرد اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے پروگرام در پروگرام بناتا چلا جاتا ہے۔ اگر مرد طاقتور ہے تو اپنی طاقت اور بل بوتے پر عورت کو زبردستی حاصل کرلیتا ہے۔

اور اگر مخالف لوگ بھی طاقت ور ہوتے ہیں تو پھر گروپ بندی کی جاتی ہے، دولت کے بل بوتے پر بہت سارے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر یا پھر جو لوگ اس کے زر خرید ہوتے ہیں ان کو ساتھ ملا کر اپنے مخالفین پر حملہ کردیا جاتا ہے اور اس طرح اپنی خواہش اور ہوس کے زیر اثر بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

حکومت بنائی جاتی ہے، راج دھانی بنائی جاتی ہے، کاروبار حکومت چلانے کے لئے پرانے وقتوں میں چمڑے پر اپنی حکومت کا چھاپ لگا کر زر بنائے جاتے تھے پھر وقت آیا کہ چاندی، سونا اور تانبہ پیتل کے سکے بنائے گئے، اس کے بعد وقت کاغذ کا آیا تو کاغذ پر اپنی حکومت اور ملک کا چھاپ لگا کر نوٹ بنائے گئے اور لوگوں کو زر کے عوض نوکر اور غلام بنانے کا رواج شروع ہوا، اور آج کل انہی نوٹوں کے عوض لوگوں کو نوکر بنایا جاتا ہے۔

دنیا میں بڑے بڑے ناقابل یقین انقلابات آئے، صرف اور صرف ایک بار پھر چند انسانوں کی خواہش کی تکمیل کے لئے، اپنی ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت کی بنا پر جن کے پاس زیادہ طاقت تھی وہ دندناتے ہوئے اپنی فوجیں بنائیں، اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اپنے سے کمزوروں پر چڑھ دوڑے، اپنے مخالفین کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور کٹوا دیا بلکہ اپنی فوجوں کا بھی صفایا کرادیا۔

بستی کی بستی اور بڑے بڑے شہروں کو جلا کر خاکستر کردیا گیا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی گردنیں کاٹ دی گئیں، یہی نہیں بلکہ تمام لوگوں کو بے گور و کفن سڑنے لگنے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو ایک بہت بڑا گڑھا کھود کر مرنے والوں کو ان گڑھوں میں ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی اور اس طرح طاقتور کی خواہش اور ضد پوری ہوگئی۔

انسان کی زندگی چند روزہ ہے، انسان کی زندگی کا ایک حصہ بچپنے میں گزر جاتا ہے دوسرا حصہ میں وہ طاقتور بن جاتا ہے اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر سب کچھ کرتا ہے، اور وہ عرصہ ایک انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس سال سے زیادہ نہیں ہوتا اور ان سالوں میں ایک طاقتور انسان لوگوں پر ظلم کا پہاڑ توڑتا ہے اور پھر جب اس کا وقت گرنے لگتا ہے اس کی جسمانی طاقت کم ہونے لگتی ہے تو اسے بوڑھا کہہ کر اسے حکمرانی سے الگ کردیا جاتا ہے، اور پھر وہ حاکم سے محکوم بن جاتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ وہ حاکم وقت کو ظالم اور جابر کہنے لگتا ہے۔

یہی انسانی فطرت ہے کہ خود ایک انسان اپنے آپ کو اچھا سمجھتا ہے اور دوسروں پر انگلی اٹھاتا ہے لیکن اسے نہیں پتہ ہوتا کہ کسی اور کی طرح ایک انگلی اٹھانے سے پہلے خود کی طرف اس کے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں

اٹھ جاتی ہیں۔

جب تک ایک انسان کمزور ہوتا ہے ان دنوں اپنی بھلائی، اپنی برتری، اپنے حالات کی آسودگی کے لئے اپنے آرام و سکون کے لئے اپنی بیوی بچوں کے سکھ کے لئے ایشور سے اٹھتے بیٹھتے پرارتھنا کرتا ہے کہ ''ایشور مجھ پر دیا کر، میری زندگی میں سکھ شانتی آجائے۔'' اور جب ایشور اس انسان کی پرارتھنا سن لیتا ہے اسے نواز دیتا ہے تو وہی کمزور انسان جو کہ رات دن ایشور کے آگے سکھ شانتی کے لئے ماتھا ٹیکتا تھا وہ اپنی طاقت اور بل بوتے پر دوسروں کا سکھ چین غارت کرکے رکھ دیتا ہے، لوگوں کی نیندیں اچاٹ کردیتا ہے، اور پھر لوگوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔'' میں انہی خیالوں کے تانے بانے میں الجھا پڑا تھا کہ۔

کامنی کمرے میں داخل ہوئی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی۔ ''ابھی تک لالٹین جل رہی ہے، لگتا ہے آپ کو لالٹین بجھانا یاد نہیں رہا۔ کن خیالوں میں گم تھے؟''

میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''بس میں ذرا انسانی فطرت کے خیالوں میں گم ہوگیا تھا اور اس لئے لالٹین جلتی رہی اور پھر یہ بھی سوچا کہ اندھیرے میں تم آؤ گی کہیں ٹھوکر لگ کر گر نہ جاؤ۔''

''اچھا تو میرے گرنے کی فکر تھی، بلکہ یہ کہو کہ تم انسانی فطرت کے چکروں میں چکراتے رہے اور میرا خیال دماغ سے دور رہا، کیوں یہی سچ ہے ناں۔''

''چلو۔ مان لیتا ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ارے کیا! کھڑی رہو گی، بیٹھ تو جاؤ، ورنہ کھڑے کھڑے پاؤں شل ہوجائیں گے۔''

''چلو تم کہتے ہو تو بیٹھ جاتی ہوں۔'' اور وہ میرے بہت قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ دونوں سو گئیں اور تم نے انہیں یقیناً ٹالا ہوگا، وہ تو کہہ رہی ہوں گی کہ ابھی اور بیٹھو، ویسے ہی پنڈت جی گئے ہوئے ہیں۔''

''اگر ان کا بس چلے تو رات بھر مجھے اپنے پاس بیٹھائے رکھتیں، میں بار بار ٹوکتی رہی، ارے بھئی، اب مجھے نیند آرہی ہے، ویسے بھی سارا دن چوپال میں بیٹھے بیٹھے کٹ گیا، لیکن مجال ہے کہ وہ دونوں کس سے مس ہو رہی ہوں۔ بڑی مشکل سے ان کے پاس سے اٹھ کر آئی ہوں، آتے ہوئے بول آئی کہ اپنے کمرے کے دروازے مضبوطی سے بند کرلیں اور پھر لاکھ کوئی کھٹکھٹائے دروازہ نہیں کھولنا اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آئی اور انہیں جتانے کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ میں نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ اس کے بعد میں کوئی آدھا گھنٹہ تک اپنے کمرے میں پڑی رہی، پھر بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے قدموں کمرے سے نکل کر آگئی۔ اور وہ دونوں دماغ کی بہت تیز ہیں۔ اگر انہیں یہ پتہ لگ جائے کہ میں رات سے تم سے ملتی ہوں تو وہ میرا جینا دوبھر کردیں۔'' وہ بولی اور مجھے یک ٹک دیکھنے لگی۔

میری نظریں بھی اس پر مرکوز تھیں، میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ کاش! وہ مجسم سمٹ کر میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں سما جائے اور میں پوری زندگی اسے دل میں چھپا کر رکھوں اور ایک پل کے لئے بھی مجھ سے اوجھل نہ ہو۔

پھر اس کی آواز پر میں جیسے چونک پڑا، وہ بولی! ''پرتاب اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو، تم ہر روز مجھے دیکھتے ہو مگر اس وقت تم جس انداز سے مجھے دیکھ رہے ہو، اس سے میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی رینگ رہی ہے۔''

''کامنی تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کیسے کیسے خیالات کے جوار بھاٹے اٹھ رہے ہیں۔ اس وقت تم مجھے دنیا کی سب سے مجسم حسین لگ رہی ہو، اور ایک کوبتا میرے ذہن کو تہہ و بالا کر رہی ہے۔ کاش! کہ میرا بس چلتا اور میں تمہیں مجسم سمیٹ کر اپنے دل میں چھپا لیتا تاکہ کسی اور کی نظر تم پر نہ پڑتی۔

''اچھا تو یہ بات ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کوبتا کیا ہے جو تمہیں.....'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"چلو میں تمہیں اپنے دماغ میں گردش کرتی کویتا سناتا ہوں۔ اور میرے دل میں اکثر آتا ہے۔ تم قدرت کا وہ حسین شاہکار ہو، جسے دل چاہتا ہے کہ ہیرے جڑے سونے کے فریم میں تمہیں سجا کر، اپنے لئے ابدی فتح بنالوں اور تمہارے حسن کی دل فریبیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جاؤں اور مجھے اپنا ہوش نہ رہے اور میرے دماغ میں صرف تم ہی تم رہو۔

کویتا ہے تمہارے حسن کی تعریف میں۔

چاند بولا تیرا محبوب کیسا ہے
میں بولا تیرے جیسا ہے
ہوا بولی وہ کھلتا کنول ہے
میں بولا وہ تو ہنس کا محل ہے
خوشبو بولی کیا وہ کوئی پھول ہے
میں بولا پھول تو پاؤں کی دھول ہے
ندی بولی کیا وہ پانی کی طرح ہے
میں بولا وہ تو میرے دل میں رہتا ہے
پری بولی کیا وہ جادو کی چھڑی ہے
میں بولا اس کی ہر ادا جادو بھری ہے
بادل بولا وہ مجھ سے بھی زیادہ نرم ہے
میں بولا ارے وہ تو میرا صنم ہے

یہ بول کر میں یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان نظر آئی اور پھر بولی۔

"پرتاب! میری تعریف زیادہ نہ کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی تعریف میں پاگل ہو جاؤں اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں۔ اور پھر ایسا نہ ہو کہ کسی وقت تم میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں اور میں اپنا جیون تیاگ دوں۔

تمہاری قربت سے پہلے پہلے میں اپنے آپ کو بہت زیادہ بدنصیب اور ابھاگن سمجھتی تھی۔ تمہارے ساتھ نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے، اب تو میں قدم کہیں رکھتی ہوں اور قدم کہیں پڑتے ہیں، ہر پل تمہاری صورت دل دماغ میں چھائی رہتی ہے، اب تو ایک پل کے لئے بھی میرا دل اس مندر اور مندر کے کمروں میں نہیں لگتا۔

تم سے پہلے میں اپنے جیون کو ایک بوجھ سمجھتی تھی، اور اکثر سوچتی رہتی تھی کہ کاش! کوئی بیماری یا پھر ایسا کوئی واقعہ رونما ہو جائے جس کی وجہ سے میرا جیون ختم ہو جائے، کیا میں اس طرح پورا جیون گھٹ گھٹ کر گزارتی رہوں گی؟ کیا میں در در کی ٹھوکریں کھاتی پھروں گی؟ کیا میں جوتیوں میں بھری دال کھاؤں گی..... کیا میرا جیون درخت سے گرے اس پتے جیسا ہو جائے گا جو کہ ہوا کے چلنے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ اور پھر نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا ہے۔

پرتاب! اب میں دل ہی دل میں ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ میں تمہارے بانہوں میں دم دے دوں۔ اگر ایک پل بھی ایسا آیا، تم سے دوری کا تو حقیقت میں، میں مر جاؤں گی، میرا دل میرا ساتھ چھوڑ جائے گا، کیونکہ اب میرا دل میرا نہیں رہا، بلکہ اب تو یہ ہر پل ہر لحہ تمہارے نام سے دھڑکتا رہتا ہے۔

اب تم خود ہی بتاؤ کہ جب میرا دل میرے بس میں نہیں، پل پل تمہارے نام کا مالا جپتا رہتا ہے اور اگر تم دور ہو گئے تو میں بھلا کیسے زندہ رہ سکوں گی، تمہاری دوری اور تمہاری جدائی اب میرے بس سے باہر ہے، تمہارے دور جانے کی اذیت، دکھ، تکلیف اور تڑپ مجھ سے برداشت نہیں ہو گی، لہذا میں تمہارے بغیر بن جل مچھلی بن کر تڑپ تڑپ کی شانت ہو جاؤں گی۔

اس لئے تو میں پرارتھنا کرتی ہوں کہ تمہاری نظروں کے سامنے اور تمہاری بانہوں میں میرا جیون ختم ہو جائے۔

اس کے علاوہ بھی میں بستر پر لیٹے لیٹے ایشور سے یہ بھی پرارتھنا کرنے لگی ہوں کہ ایشور مجھ پر دیا کر، میں جتنے بھی جنم لوں، ہر جنم میں میرا ساتھ پرتاب کے ساتھ ہو، ایشور! کسی اور جنم میں مجھے پرتاب سے الگ نہ کرنا۔"

اور اس نے ترنت میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا، میرے ہاتھوں پر اپنی

آنکھیں رگڑنا شروع کر دیں، پھر میرے ہاتھوں کو دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کامنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگ گئی، جسے دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔

"کامنی یہ کیا۔ ارے پگلی تم رو رہی ہو، اب بس کرو، نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔" یہ سننا تھا کہ اچانک اس کے آنسوؤں کو بریک لگ گئے اور اس نے سرخ ہوتی اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"کامنی آئندہ میرے سامنے کبھی رونا نہیں، یہ میرا حکم ہے کیونکہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، میں بس تمہیں ہر سے ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں بولا۔

"پرتاب تم میرے لئے بھگوان سمان ہو اور کوئی اپنے بھگوان کو ناراض کیسے کر سکتا ہے، تمہاری اچھا تو میرے دل کی دھڑکن ہے، تمہاری اچھا کے مطابق یہ میرا تم سے وچن ہے کہ میں آئندہ تمہارے سامنے آنسو نہیں بہاؤں گی۔"

ارے کیا اسی طرح رات بھر بیٹھی رہو گی اور لالٹین بھی جل رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دونوں ناریوں میں سے کوئی اس طرف روشنی دیکھ کر آن ٹپکے۔" میں نے کہا۔

"چلو! کوئی بات نہیں، اگر کوئی آ جائے گی تو کیا ہو گا، وہ خود دیکھ کر اور شرما کر بھاگ جائے گی اور وہ کون سا پوتر ہیں، میں بھی ان کے کرتوت جانتی ہوں، دیکھنے میں بہت نٹ کھٹ ہیں مگر اندر سے بہت زیادہ تیز ہیں۔

دو تین ہفتے بعد جب اپنے گھر جاتی ہیں تو پوری پوری رات گل چھرے اڑاتی ہیں اور جس روز بھی موقع لگا، یہاں سے اڑن چھو ہو جائیں گی۔" وہ روانی میں بولتی رہی۔

"خیر! چھوڑو ان باتوں کو، ہر پرش اور ناری کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے جیون کے مطابق سوچے سمجھے، انہیں بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی سکھ شانتی سے اپنا جیون بتائیں۔ اچھا مجھے ایک گلاس پانی پلاؤ اور لالٹین بجھا دو۔" میں نے کہا۔

"وہ اٹھی اور گھڑے سے پانی کا گلاس بھرا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے پانی پی کر گلاس اسے پکڑا دیا اور اپنی جگہ پر لیٹ گیا تو اس نے لالٹین بجھا دی اور میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ اور بولی۔" پرتاب میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میرے جیون میں بھگوان بن کر آؤ گے اور مجھے اتنا چاہنے لگو گے یہ سب بھگوان کی کرپا ہے۔" اور پھر اپنے ہاتھ کی انگلی میرے ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ آج وہ ہر دن سے زیادہ سندر لگ رہی تھی۔ گلابی چندری اور گلابی ہی چولی میں آج اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ اس کا حسین سراپا مجھے ویسے بھی متوالا کر رہا تھا۔

میں بولا۔" کامنی آج تم خوبصورتی اور حسن کی دیوی لگ رہی ہو، ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ایک اپسرا بھگوان نے زمین پر اتار دی ہو۔" اس کے بعد پھر نہ جانے ہم دونوں کیا کیا بولتے رہے۔ کچھ یاد نہیں۔ ہم دونوں کی سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ ندی میں موجود خاموش لہریں سر ابھارنے لگیں اور پھر بہت تیزی سے لہریں غضبناک ہو کر بپھرنے لگیں، ہم دونوں لہروں کی گرداب میں تھپیڑے کھانے لگے اور پھر کافی سے بیت گیا۔ ہم دونوں بے سدھ ہو گئے۔

کافی دیر تک ہم اس حالت میں رہے، ہماری سانسیں بے ربط تھیں اور ہم ایک دوسرے کے سانس لینے کی آواز واضح طور پر سن رہے تھے۔

پھر اور سے بیت گیا، میری سانسیں کچھ قابو میں آئیں تو میں بولا۔" کامنی!

"جی....." وہ بولی۔

اس کی آواز اتھاہ گہرائیوں میں سے آتی محسوس ہوئی۔

میں پھر بولا۔" کامنی!"

وہ بولی۔" جی....."

"کامنی..... میں اب اس قید نما زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ میرا من چاہ رہا ہے کہ صبح کا اجالا پھیلے اور میں

تمہارا ہاتھ پکڑ کر چلتا بنوں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں، کیا تم میرے فیصلے پر راضی ہو جاؤ گی۔"

"اب میرا دل دماغ میرے اپنے بس میں نہیں رہا، جو تم کرو گے، میں اس پر راضی ہوں۔ جیسی تمہاری مرضی، مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں صبح دیوی ماں کے چرنوں میں پرارتھنا کروں گی کہ ہماری اچھا جلد سے جلد پوری ہو۔

ارے یہ کیا؟ پرتاب! تم گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن رہے ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ آج پھر گوپی کی آتما آ جائے۔"

"ٹاپوں کی آواز تو میں بھی سن رہا ہوں۔" میرا یہ بولنا تھا کہ وہ جھٹ مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"پرتاب! اب کیا ہوگا؟" وہ بولی۔

"تم گھبراؤ نہیں، بھگوان اور دیوی ماں ہماری رکھشا کرے گی۔ تم صبر اور ہمت سے کام لو۔ تم میرے پاس ہو، میں ہوں ناں۔" میں بولا۔

"بھگوان کرپا کرے؟" اس کی آواز گھمبیر ہو گئی تھی اور پھر اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "پرتاب..... گوپی آج پھر آ گیا..... ٹاپوں کی آوازیں قریب آ رہی ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹ سے بستر پر لٹا دیا۔ آہستہ آہستہ اس پر لرزش طاری ہونے لگی تھی۔ میرے پہلو میں لیٹتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی سانسیں آہستہ چلنے لگی تھیں، اس پر خوف اور ڈر سوار ہو چکا تھا۔

آج میں گھبرایا نہیں، کل کے بہ نسبت میں حوصلہ نہیں ہارا، میرے من میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہم مندر کی چار دیواری میں موجود کمرے میں ہیں اور کسی صورت بھی کوئی بھٹکی ہوئی آتما مندر کے احاطہ میں نہیں آ سکتی۔

"کامنی۔ تم گھبراؤ نہیں، حوصلہ رکھو، کچھ بھی نہیں ہوگا، اگر کچھ ہوا بھی تو کل جیسا ہی ہوگا، مندر کے احاطہ میں وہ کسی صورت بھی نہیں آ سکتا۔" اور میں اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا تاکہ اس کا حوصلہ برقرار رہے۔

گھوڑے کے ٹاپوں کے علاوہ اب اس کی ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ آندھی اور طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ کیونکہ ہنہنانے اور ٹاپوں کی آوازیں زوردار آواز سے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔

کامنی کا سر میرے بازو پر تھا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے اسے دبوچ رکھا تھا اس لئے کہ کہیں وہ دہشت کی وجہ سے اٹھ بیٹھے اور چیخ پڑے۔

جوں جوں آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ کامنی کی گرفت مجھ پر بڑھتی جا رہی تھی اور پھر ایسا لگا کہ وہ مندر کے بالکل قریب پہنچ گیا ہو۔ گھوڑا اتنے زور سے ہنہنایا کہ میرا دل دہل کر رہ گیا۔ جب میرا دل دہل گیا تھا تو اندرونی طور پر کامنی کی حالت تو بھگوان ہی جانے۔

گھوڑے کے ہنہنانے اور ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ساتھ آج ہوا بھی اتنے زور سے چل رہی تھی کہ کیا بتاؤں، ایسا لگتا تھا کہ زوروں کی آندھی بھی ساتھ ہو، گو..... گوں..... گوں..... کی آوازیں اور بھی دہشت پھیلا رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وقفے وقفے سے الوؤں کے چیخنے اور چمگادڑوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں، اچانک آوازیں اتنی زور کی آنے لگیں کہ دل دہلنے لگا۔ کامنی بے سدھ مجھ سے چمٹی رہی تھی۔ پھر تمام آوازیں مندر کے پاس سے دور ہونے لگیں۔ اس کے بعد اچانک گاؤں میں موجود گائے اور بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں بھی کان پھاڑنے لگیں۔

پھر اچانک اتنے زور کی آسمانی بجلی چمکی کہ ہمارے کمرے میں بھی اس بجلی کی چمکنے کی روشنی نظر آئی، اس کے بعد بجلی اتنے زور کی گرجی کہ دیواریں تک لرز کر رہ گئیں۔

اس کے بعد تو بجلی چمکنے اور بجلی کی گرجدار آواز مسلسل آنے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ پورے گاؤں پر متواتر بجلی گر رہی ہو۔

خوف وحشت اور دہشت کی وجہ سے میں اور کامنی ایک دوسرے کو بھینچے ہوئے بے سدھ پڑے تھے۔ ہم دونوں میں بالکل بھی ہمت نہیں تھی کہ ہم اپنی آوازیں نکالتے، اب تو ہم دونوں جیسے لرزنے لگے تھے۔ ہماری سانسوں کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

اسی اثناء میں پھر بجلی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جو کہ ناقابل بیان حد تک کان پھاڑ دینے والی تھی۔ ایسا لگا کہ پورے گاؤں پر بجلی گر پڑی ہو جس سے سارا گاؤں جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد سمے کے ساتھ ساتھ ہر طرف سکوت چھاتا گیا۔ اور کافی سمے بیت گیا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ کامنی کا شریر شانت ہو گیا ہے۔ جب کامنی بالکل شانت ہو گئی اور میں مطمئن ہو گیا تو میں نے ہاتھ سے کامنی کے گال پکڑ کر ہلایا تو جیسے کہ وہ گہری نیند سے چونک پڑی ہو۔ "آ..... آ..... ہ..... ہاں" اس کی آواز نکلی..... پھر میں بولا۔ "کامنی! کیسی ہو؟"

"ج..... جی..... میں ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔

"کامنی ہوش کرو، وہ چلا گیا۔ اب کسی قسم کی بھی آواز نہیں آ رہی، چلو اٹھو۔" میں نے کہا۔

"جی....."

"میں بول رہا ہوں کہ گوپی کی آتما چلی گئی۔ سب کچھ شانت ہو گیا ہے۔"

"چلی گئی۔" وہ بولی۔

"ہاں چلی گئی۔ میں نے کہا، تو اس نے ایک بہت لمبی سانس کھینچی۔ ایسا لگتا تھا اس کے سانس کھینچنے سے کہ کئی گھنٹوں سے اس کی سانس اس کے سینے میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ اس کے بعد اس نے ایک اور لمبی سی سانس کھینچی اور بولی۔ "چلی گئی..... اچھا ہوا۔" اور پھر والہانہ طور پر مجھے چومنے لگی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خوف سے بالکل آزاد ہو گئی تھی۔

پھر وہ بولی۔ "پرتاب..... اگر وہ ادھر آ جاتا تو کیا ہوتا؟ آج ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا، یہ تو اچھا ہوا کہ بھگوان نے ہم پر کرپا کی۔"

میں بولا۔ "تم حوصلہ رکھو، ایسا کچھ بھی نہ ہوتا، اور نہ ہی کبھی ایسا ہوگا۔ ہم لوگ دیوی ماں کی شرن میں ہیں۔ کوئی بھی بھٹکی ہوئی آتما مندر کے احاطہ میں نہیں آ سکتی۔ آنے والی آتما مندر کے باہر سے ڈرا تو سکتی ہے مگر اندر نہیں آ سکتی۔"

اس نے ایک اور لمبی سانس کھینچی اور بولی۔ "پرتاب میرا من کہہ رہا ہے کہ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے اور جلدی سے اجالا ہر طرف پھیل جائے گا۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم اٹھ کر جلدی سے اشنان کر لو۔ تمہیں مندر بھی کھولنا ہے۔ آج ویسے بھی دونوں پنڈت مہاراج آ جائیں گے۔"

یہ بول کر وہ اٹھ بیٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "چلو جلدی سے اچھے بچے کی طرح اٹھ جاؤ۔" اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ اٹھی اور مجھے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اٹھا اور اپنے کپڑے لے کر اشنان کرنے چلا گیا۔ کامنی کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ جب میں اشنان سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو واقعی صبح کا سپیدہ پھیل رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر بیٹھ کر رات سے بیتے ہوئے واقعات کے متعلق سوچنے لگا، پھر دل میں آیا کہ یقیناً آج بھی اس دشٹ خوئی آتما نے کچھ نہ کچھ کیا ضرور ہوگا۔

ٹھیک ساڑھے سات بجے کامنی ناشتہ کی تھالی لے کر آ گئی۔ اس نے تھالی میرے سامنے رکھی اور بولی۔ "تم ناشتہ کر لو، میں بھی ابھی ابھی نہانے سے فارغ ہوئی ہوں، ان دونوں نے ناشتہ تیار کر لیا تھا اس لئے لے کر آ گئی، ابھی بھی میرے بال گیلے ہیں، اب میں جا کر بال سکھاؤں گی، تم اتنی دیر میں ناشتہ کرو اور ناشتہ کے بعد جا کر مندر کا دروازہ کھول دو۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی ہم تینوں مندر میں موجود ہوں گی۔" یہ بول کر مسکراتی ہوئی وہ چلی گئی۔

میں نے ناشتہ کیا اور پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ ایک مخصوص جگہ تھی جہاں پر مندر کے تالے کی

چابیاں ہوتی ہیں۔ میں نے چابی اٹھائی اور باہر جا کر مندر کا دروازہ کھول دیا۔ دیوی ماں کو پرنام کیا اور مندر کی گھنٹیاں بجانے لگا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کامنی اور اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں آئیں اور روز کے مطابق اپنا کام کرنے لگیں۔

آج بھی سب سے پہلے گنیش کاکا مندر میں آئے اور دیوی ماں کو جھک کر پرنام کیا۔ وہ سامنے بیٹھ گئے۔ آج بھی ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ افسردہ اور غمگین نظر آرہے تھے۔ میں نے ان پر بھرپور نظر ڈالی اور بولا۔ ''گنیش کاکا، خیریت تو ہے ناں۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے انہوں نے جواب دیا۔ ''پتر! آج تو بہت زیادہ گاؤں میں بربادی ہوئی ہے، گاؤں میں موجود سارے جانور مردہ پڑے ہیں اور آج آٹھ لوگوں کی اس خونی آتما نے ہتھیا کر ڈالی ہے۔ پورا گاؤں مصیبت کے پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ ہر طرف وحشت پھیلی ہوئی ہے اور چوپال کے سامنے جو سب سے بڑا درخت ہے اس پر نہ جانے کیسے بجلی گری کہ پورے کا پورا درخت جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔ رات سے نہ تو آسمان پر بادل تھے، نہ بارش کا موسم ہے تو پھر نہ جانے اچانک بجلی کیسے چمکتی اور کڑکتی رہی۔ بجلی کے چمکنے سے سارا گاؤں روشنی میں نہایا پڑا تھا اور پھر گڑگڑاہٹ ایسی تھی کہ جیسے کان پھٹ جائیں۔

''رات سے کا یہ رام لیلا سب کی سمجھ سے باہر ہے۔ پنڈت جی بھی نہیں ہیں کہ اس کے متعلق کچھ بتاتے کہ ایسا کیوں ہوا، اور اچانک بجلی درخت پر کیسے گری۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ گوپی کی آتمارات سے آئی ضرور تھی، اور اسی نے گاؤں کے سارے جانور مار ڈالے اور ساتھ ہی آٹھ آدمیوں کو بھی مار ڈالا۔

سارا گاؤں چوپال میں جمع ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مرنے والوں کی کریا کرم کے لئے بھی پریشان ہیں۔ سارے گاؤں والے اپنے اپنے جو گوسوکھی لکڑیاں اپنے اپنے گھروں سے لاکر ایک جگہ جمع کر رہے ہیں تاکہ ان سے چتا بنائی جائے۔ اگر اس طرح ہر روز لوگ مارے جاتے رہے تو اتنی لکڑیاں چتا کے لئے کہاں سے آئیں گی۔''

''گنیش کاکا! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، پنڈت جی نے تو کہا تھا کہ آج وہ ضرور آئیں گے، اب دیکھئے کہ پنڈت جی اور رام لال جی کب تک آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں پتر! گاؤں والے بھی یہی کہہ رہے ہیں، گیارہ بجے تک پنڈت جی کا ہم انتظار کریں گے، اگر وہ نہ آئے تو اس کے بعد ہی آخری قدم اٹھائیں گے۔ اچھا پتر، اب میں چلتا ہوں، تم نے آنا ہو تو مندر بند کرنے کے بعد آجانا، سارے لوگ چوپال میں جمع ہیں۔'' یہ بول کر گنیش کاکا اٹھے اور نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے چلے گئے۔

آج مندر کی ہر شے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ سے بیت رہا تھا۔ میں اپنی جگہ اور تینوں ناریاں اپنی اپنی جگہ اداس بیٹھی تھیں۔

ٹھیک پونے دس بجے بڑے پنڈت جی، ان کے گرو اور رام لال جی مندر میں پدھارے، انہیں دیکھ کر میں ترنت اپنی جگہ سے اٹھا اور ان تینوں کے چرن چھوئے، تینوں ناریوں نے بھی آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے۔

تینوں پنڈت جی اندر آکر دیوی ماں کو پرنام کیا اور پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ مندر کے دروازے کے باہر بہت سارے لوگ آکر کھڑے ہو گئے۔ چونکہ گاؤں میں داخل ہو کر مندر کی طرف آتے ہوئے دو چار لوگوں نے ان تینوں کو دیکھ لیا تھا کہ پھر یہ خبر کہ پنڈت جی اپنے گرو جی کے ساتھ آگئے ہیں، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ آگئے۔

کچھ لوگ اپنی مصیبت اور بپتا کے تحت زار و قطار رو بھی رہے تھے۔ لوگوں کی ہوتی غیر حالت کو دیکھتے ہوئے پنڈت جی کے گرو اپنی جگہ سے اٹھے۔

گرو جی کو اٹھتے دیکھ کر بڑے پنڈت اور رام

لال جی بھی اٹھے اور پھر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پیچھے ہو لیا۔ گرو جی، مندر کے دروازے پر آئے اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ ''شانت رہو'' پھر گرو جی کی آواز سنائی دی۔

''سجنو! جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا، مگر آپ لوگ میرا یقین کرو کہ اب اس گاؤں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ گوپی کی خونی آتما کا خاتمہ ہو گیا ہے۔'' یہ سننا تھا کہ کئی لوگ ایک دوسرے کو اچنبھے کی حالت میں دیکھنے لگے۔

پھر گرو جی کی آواز سنائی دی۔ ''سجنو! یہ دونوں میرے پاس لمبا سفر طے کر کے آئے، آپ لوگوں کی محبت اور سکھ شانتی کے لئے۔

پرسوں جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی خبر مجھے مل گئی تھی، اس واقعہ کو جان کر میں بالکل بیاکل ہو گیا، میں نے اس کا ذکر گوپال اور رام لال سے نہیں کیا کیونکہ یہ دونوں بہت زیادہ گھبرا جاتے۔

کل رات سے یہ دونوں اپنے کمرے میں تھے اور میں اپنے استھان پر موجود گیان دھیان میں لگا پڑا تھا۔ میرا دھیان اسی گاؤں میں تھا کہ اچانک مجھے جانکاری ملی کہ گوپی کی آتما دندناتی ہوئی آج پھر آرہی ہے، یہ جان کر میرا چین ختم ہو گیا۔ میں جان گیا کہ یہ خونی آتما آج کچھ زیادہ ہی بربادی کرے گی، لہٰذا میں گیان دھیان کی حالت میں ترنت اپنی جگہ سے یہاں پہنچا مگر میرے پہنچنے سے پہلے پہلے اس دشٹ نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

خیر میں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ پورے گاؤں کے گرد ایک مضبوط کنڈل قائم کر دیا کہ کسی بھی صورت گوپی کی آتما اب اس گاؤں سے نکلنے نہ پائے، اور اپنے گرد کنڈل دیکھ کر وہ بہت زیادہ بپھر گئی، زیادہ اچھلنے کودنے لگی۔ وہ خود کو بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگی۔ وہ جہاں بھی جاتی اس پر بجلی گرتی اور وہ گرتے پڑتے بھاگ جاتا۔

پھر آخری ٹائم وہ اس بڑے درخت پر جا کر چھپ گیا، وہ سمجھا کہ درخت اتنا بڑا ہے کہ اس پر بجلی زیادہ اثر نہیں کرے گی یہ اس کی بھول تھی۔ میرے اشارے پر بجلی زوردار طریقے سے درخت پر گری اور اس طرح گوپی کی آتما کا خاتمہ ہو گیا اور درخت بھی جل کر کوئلہ بن گیا۔

میں نے رات سے گوپال اور رام لال کو بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی آتے سے تک انہیں کچھ بتایا تھا اور اب ساری کتھا آپ لوگوں کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ یہ گاؤں گوپی کی آتما سے مکتی پا چکا ہے اب کسی قسم کا خوف نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اگر گوپی کی آتما آزاد رہتی تو آئے دن ایسا ہوتا رہتا۔

گوپال نے پہلے ترشولوں سے کنڈل قائم کیا تو کسی پاپی نے ان ترشولوں کو اپنی ضرورت کے تحت اکھاڑ کر پھینک ڈالا، اس کے بعد گوپال نے میرے پاس جاتے سے دھاگے سے عارضی کنڈل قائم کیا، اس کنڈل کو بھی کسی دشٹ نے دھاگہ توڑ کر کنڈل ختم کر دیا۔

بار بار کنڈل کے لئے اپائے کرنا ٹھیک نہیں تھا اور کسی نہ کسی بہانے یا کسی بھی ذریعہ سے کنڈل ختم ہو سکتا تھا جیسے کہ پچھلے کنڈل ختم ہو گئے، اس کا صرف اور صرف ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپائے یہی تھا کہ اس خونی آتما کا خاتمہ کر دیا جائے۔

یہ ایشور کی سہائتا ہے کہ ایشور نے میرے ہاتھ سے یہ کام کروایا، اور آئندہ کے لئے پورے گاؤں والوں کو بچا لیا۔

سجنو! اگر دیکھا جائے تو گوپی ایسا نہ تھا۔ آپ لوگ تو گوپی اور اس کے پریوار کو جانتے ہیں گوپی کے ساتھ ٹھاکر نے بہت زیادہ ظلم کیا۔ اس کی معصوم پتری کو ہوس کا بھینٹ چڑھایا اور پھر اسے ختم کر ڈالا، اس کے بعد اپنی چال سے گوپی اور اس کے پورے پریوار کو اگنی میں جلا کر ختم کر دیا۔

گوپی کی آتما ضد میں آ گئی اور اس نے اپنی جان سے پیاری پتری اور اپنے پریوار کا انتقام لینے لگا۔ گوپی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ بھلائے نہیں بھولتا، خیر جب ظلم بڑھتا ہے تو اس کا خاتمہ زور زیادتی کے

ساتھ کیا جاتا ہے۔

سجنو! آپ لوگوں کا دکھ بہت بڑا ہے، میرا من بھی خون کے آنسو رو رہا ہے، اب آپ لوگ اپنے غم کو بھولنے کی کوشش کریں اور آنے والے سمے پر نظر رکھیں، بھگوان آپ سب پر کرپا کرے، آپ لوگ جائیں اور مرنے والوں کی کریا کرم کا بندوبست کریں۔

ہم بہت لمبا سفر کر کے آئے ہیں تھوڑا جل پانی کر لیں، پھر ہم آپ لوگوں کے پاس آتے ہیں، میں آج اور کل آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گا، پھر مل بیٹھ کر ایک دوسرے کا دکھ بانٹیں گے۔" اس وقت ایک شخص نے نعرہ لگایا۔ "گرو مہاراج کی جئے ہو، گرو مہاراج کی جئے ہو۔" وہاں پر موجود سب نے گرو جی کے جئے ہو، کا نعرہ لگایا، پھر سب واپس چلے گئے، تو گرو جی واپس مندر میں دیوی ماں کے سامنے بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر تک گرو جی بیٹھے رہے، سر جھکائے اور جب گرو جی نے سر اٹھایا تو بڑے پنڈت جی نے کہا۔ "گرو جی، آپ نے رات سے ہمیں کچھ بتایا نہیں، اور گیان دھیان میں ہوتے ہوئے اتنا بڑا کام کر دیا۔"

"گوپال اگر میں تم دونوں کو بتا دیتا تو تم دونوں کچھ زیادہ ہی بیاکل ہو جاتے، اس لئے میں خاموش رہا اور تمہارے ساتھ چلا آیا اور اب میں نے سب کے سامنے سب کچھ صاف صاف بتا دیا، یہ بھی اچھا ہوا کہ بھگوان کی کرپا سے اس خونی کھیل کا خاتمہ ہو گیا۔"

یہ سن کر بڑے پنڈت جی بولے۔ "گرو جی چلیں اٹھیں، لمبے سفر سے آئے ہیں، آپ تھک گئے ہوں گے، آپ چل کر اشنان کر لیں پھر جل پانی بھی لے لیں، دوپہر تک ان لوگوں کی کریا کرم میں بھی جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے گوپال چلو اٹھو! میں سب سے پہلے اشنان کرتا ہوں، ویسے بھی آج گرمی کچھ زیادہ ہے۔ بھوجن میں زیادہ کچھ بھاری نہ کرنا، ہلکا پھلکا کر لو، اور تمہیں تو پتہ ہے ہی کہ میں کھانے کے لئے زندہ نہیں ہوں بلکہ زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہوں۔

اس سنسار میں زیادہ تر لوگ کھانے کے لئے زندہ ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ جو کہ زندہ رہنے کے لئے کھاتے ہیں اور ویسے بھی سنسار میں زیادہ لوگ زیادہ کھا کر مرتے ہیں، بھوک اور کم کھا کر بہت لوگ مرتے ہیں۔"

"جی گرو جی! آپ صحیح کہہ رہے ہیں، تمام مہان اور گیان دھیان والے، بلکہ دیوی دیوتا بھی یہی پسند کرتے ہیں جو کہ آپ کا خیال ہے۔"

اور گرو جی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ ہی دونوں پنڈت جی ایک منٹ کو پلٹے اور بولے۔ "پرتاب، اب تم مندر بند کر دو اس کے بعد بڑے ہال میں آ جانا، ہم اس جگہ ملیں گے۔"

"جی! آپ لوگ چلیں، میں مندر بند کر کے آتا ہوں۔" ان کے پیچھے ہی کامنی اور اس کی دونوں ساتھی لڑکیاں بھی چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مندر بند کیا اور چابی لے کر مندر کے بڑے ہال کی طرف بڑھ گیا۔

میں جب ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ گرو جی اشنان کرنے کے لئے جا چکے تھے اور بڑے پنڈت جی بھوجن وغیرہ کے انتظام میں ناریوں کو بتا رہے تھے جبکہ رام لال جی ہال میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ "پرتاب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں رام لال جی کے پاس بیٹھ گیا۔

جب میں رام لال جی کے پاس بیٹھ گیا تو وہ بولے۔ "پرتاب ہمارے پیچھے دو دنوں میں اتنا بڑا خونی کھیل ہو گیا، تمہیں خوف تو نہیں لگا، اور ان تینوں ناریوں کا کیا حال تھا؟"

رام لال جی کی بات سن کر میں بولا۔ "آپ لوگوں کا آشیرواد ہمارے ساتھ تھا۔ دیوی ماں نے رکھشا کی، اور بھگوان کی کرپا نے ہم چاروں کو بچائے رکھا۔"

"شاباش! بہت خوب، تم نے بہت اچھا کیا، تم واقعی بہت نڈر اور بہادر ہو ورنہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو بہت زیادہ خوف کھا کر ہمت چھوڑ چکا ہوتا۔"

خیر تھوڑی دیر میں گرو جی نہا کر آ گئے اور آرام

سے بیٹھ گیا۔ انہیں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ان کے آگے جل پانی اور بھوجن لگا دیا گیا۔ گرو جی کے ساتھ ہی دونوں پنڈت جی اور میں بھوجن کے لئے بیٹھ گئے۔ گرو جی نے واقعی برائے نام بھوجن لیا اور بہت جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم تینوں نے زیادہ کھایا پیا۔

اس سے فارغ ہو کر گرو جی دیگر باتیں کرنے لگے، پھر اچانک انہوں نے پوچھا۔ "گوپال یہ بالک کون ہے؟ میں پہلی بار اسے یہاں دیکھ رہا ہوں اور اس سے پہلے کئی مرتبہ میں گاؤں میں آیا ہوں، مگر اس بالک پر میری نظر نہیں پڑی۔"

گرو جی کی بات سن کر بڑے پنڈت جی نے میری پوری کتھا سنا دی تو گرو جی اپنی آنکھیں بند کر کے گردن جھکا کر بیٹھ گئے اور جب دوبارہ گرو جی نے آنکھیں کھولیں تو یک ٹک مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔ "گوپال اس بالک کو کوئی کشٹ نہ ہونے پائے، تقدیر کی دیوی اس پر مہربان ہے، یہ کوئی عام بالک نہیں لیکن سمے کے گھٹنا نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا ہے، تم اس کی اچھا اور خوشیوں کا پورا پورا خیال رکھنا، یہ جائے گا مگر پھر دوبارہ بہت جلد تمہارے چرن چھونے آئے گا اور جب یہ دوبارہ آئے گا تو اس کی اچھا کا خیال رکھنا۔

پرتاب پتر! ابھی تمہیں ایک مہینہ اور اس مندر میں رہنا ہے، ایک مہینہ بعد خود بخود تمہارے لئے راستہ بن جائے گا اور تم اپنے پریوار میں چلے جانا، تمہاری قسمت میں سکھ شانتی تو بہت ہے مگر ایک پھانس ہے جو کہ تمہیں دکھ پہنچاتا رہے گا، مگر تم ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا، اگر تم ہمت ہار گئے تو وہ تم پر بھاری پڑے گا۔

دیوی، دیوتاؤں، مہان لوگوں اور گیانی دھیانی لوگوں کا خیال رکھنا، سمے سے گھبرانا نہیں، دل چھوٹا نہیں کرنا، اپنے پریوار سے تمہیں بہت سکھ ملے گا، لیکن تمہیں حالات اور گھٹنائیوں سے سمجھوتا کرنا پڑے گا، ایک بہت بڑا کشٹ ہے تمہاری قسمت میں جسے جھیلنا ہے۔"

گرو جی مزید باتیں کرتے کہ ایک شخص آیا اور بولا۔ "مہاراج سب لوگوں کی ارتھی تیار ہے، گنیش کاکا نے سندیسہ بھیجا ہے کہ میں آپ لوگوں کو بلا لاؤں۔"

"اچھا ہوا تم آ گئے، نہیں تو ہم یہاں بیٹھے باتوں میں لگے رہتے، خیر اب میں اٹھتا ہوں، گوپال اور رام لال تم بھی اٹھ جاؤ۔" یہ بول کر گرو جی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہال سے باہر نکلنے کے لئے آگے بڑھ گئے، ان کے پیچھے پیچھے ہم بھی چلنے لگے۔

چند منٹ میں ہی ہم لوگ چوپال میں پہنچ گئے، آٹھوں ارتھیاں موجود تھیں، گرو جی کو دیکھتے ہی اس جگہ موجود سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر گرو جی کے آگے کھڑے ہو گئے تو گرو جی نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر اس جگہ بیٹھنے رہنے کے بعد اچانک گرو جی اٹھے اور چلتے ہوئے اس درخت کے پاس پہنچ گئے جو کہ رات میں بجلی گرنے کی وجہ سے جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔

گرو جی کے پیچھے دونوں پنڈت جی، میں اور بھی کئی لوگ تھے۔ گرو جی درخت کے پاس پہنچ کر اپنی آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے رہے، پھر اپنی آنکھیں کھول کر لوگوں کو دیکھا اور بولے۔ "گنیش کاکا، کل صبح دس گیارہ بجے اس درخت کو کٹوا دینا، اور جب درخت کٹ جائے تو مجھے بلا لینا، میں اپنے سامنے اس کا بھی کریا کرم کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے گرو مہاراج! ایسا ہی ہو گا۔" گنیش کاکا نے کہا۔ اس کے بعد گرو جی اس جگہ سے واپس پلٹ آئے اور پھر لوگوں سے بولے۔ "بھائیو! اب آپ لوگ ارتھی اٹھائیں، سمے ہو گیا ہے۔" گرو جی کی بات سنتے ہی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور آٹھوں ارتھیوں کو کندھے پر اٹھا کر "رام نام ست ہے، رام نام ست ہے" کی آواز نکالتے ہوئے شمشان کی طرف چلے۔

جب ارتھی اٹھی تو جن لوگوں کے لوگ مرے تھے ان لوگوں کا رونا اور چیخ و پکار سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا، لوگ پچھاڑیں کھانے لگے تھے۔ اور خاص طور پر عورتوں کا جو حال تھا وہ تو اور بھی دل دہلا رہا تھا، ہر آنکھ میں آنسو تھے۔

مگر ہوتا تو وہی ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، رونے اور چیخنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور جانے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں، ہر مذہب کے عقیدے کے مطابق مرنے والوں کو آخری منزل تک پہنچادیا جاتا ہے۔

خیر ارتھی کو لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لوگ شمشان میں پہنچ گئے۔ چتائیں تیار تھیں سب کو چتا پر لٹادیا گیا اور تھوڑی دیر میں ہی آگ کے شعلوں نے سب کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔ شمشان میں بھی بہت سارے لوگ زاروقطار روتے رہے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد لوگوں کی شمشان سے واپسی ہوئی اس کے بعد تھوڑی دیر تک لوگ چوپال میں بیٹھے رہے، پھر گرو جی بولے۔ ''بھائیو! اب ہم بھی چلتے ہیں۔ کل مندر میں آپ لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہوگی، آج رات میں مرنے والوں کے حق میں ایشور سے پرارتھنا کروں گا کہ ایشور مرنے والوں کو شانتی دے اور انہیں سورگ میں رکھے۔''

اور یہ بول کر گرو جی نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو شانت رہنے کی تلقین کی اور واپس مندر میں آگئے، ہم بھی گرو جی کے پیچھے پیچھے مندر میں آگئے۔ بڑے پنڈت جی نے مجھ سے کہا۔ ''پرتاب تم اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔'' ''میں گرو جی کے ساتھ اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔''

''جی بہت اچھا۔'' میں نے کہا اور نڈھال قدموں سے چلتا ہوا، اپنے کمرے میں آکر بستر پر بیٹھ گیا۔ تھکن سے جسم چور چور ہورہا تھا۔ پھر اچانک پیاس محسوس ہوئی تو اٹھا اور گھڑے سے ایک گلاس پانی پیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا، کب میری آنکھ لگی مجھے پتہ نہ چلا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب میرے کمرے میں کامنی نے آکر مجھے ہلایا، جب میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کامنی میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اور برابر میں بھوجن کی تھالی پڑی تھی۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔ ''تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر بھوجن کھالو، میں زیادہ دیر رک نہیں سکتی، کیوں؟ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے۔''

''لیکن تمہیں تو میرے دل کا بھی پتہ ہے کہ تمہارے بغیر میرا دل بن جل مچھلی بنا رہتا ہے، خیر تمہاری خوشی کے لئے میں اپنے دل پر پتھر رکھ لیتا ہوں اور دل کو سمجھالوں گا کہ ''اے دل بہت بڑی مجبوری ہے تو دو دن کے لئے شانت رہ، صرف اپنے میت کو ایک نظر دیکھ لینے پر ہی اکتفا کر.....''

''پرتاب! جو تمہاری حالت ہے وہی حالت میری بھی ہے، مگر ہم کیا کرسکتے ہیں اور یہ کٹھن وقت تو واقعی بن جل مچھلی بن کر کاٹنا پڑے گا۔ اچھا میں چلتی ہوں تم بھوجن کے بعد برتن ایک طرف رکھ دینا، میں بعد میں آکر لے جاؤں گی۔'' اور یہ بول کر کامنی ترنت کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بھوجن کیا اور پانی پی کر برتن ایک طرف رکھا اور بستر پر لیٹ کر وقت کے تانے بانے اور گرو جی کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ گرو جی نے بہت ہی معنی خیز اور اہم باتیں کی تھیں۔ یہ بات بھی اہم تھی کہ میں نے مزید ایک مہینہ تک اور اس مندر میں رہنا تھا۔ لیکن میرا دل تو اندر سے یہی چاہتا تھا کہ میں پوری زندگی یہاں سے نہ جاؤں اور اگر جاؤں تو کامنی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو۔

مگر جب قسمت میں ہی کشٹ اور دکھ ہو تو انسان کیا کرسکتا ہے، میرے ذہن پر سوچوں کا وزن بڑھتا جارہا تھا، جس کی وجہ سے میں کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ لیکن مہان لوگوں کا تجربہ ہے کہ انسانوں کو سولی پر بھی نیند آجاتی ہے تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، میں بھی نیند میں چلا گیا اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے کامنی نے مجھے اٹھایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ''جلدی سے اٹھ جاؤ، تھوڑی دیر میں اجالا پھیلنے والا ہے اور آج ویسے بھی دونوں پنڈت مہاراج جلدی اپنے کمرے سے نکلیں گے کیونکہ گرو جی موجود

ہیں اور جب بھی گرو جی یہاں آتے ہیں تو دونوں بہت جلد اپنے اپنے کمرے سے نکل پڑتے ہیں، اب میں جارہی ہوں، گرو جی کل واپس چلے جائیں گے تو تھوڑا بہت موقع ملے گا کہ تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کروں، اچھا اب جلدی سے اٹھ جاؤ اور اشنان کرلو، اشنان کے بعد میں ناشتہ لے کر آؤں گی۔'' اور یہ بول کر وہ چلی گئی۔

میں اٹھا اپنے کپڑے سنبھالے اور اشنان کے لئے چلا گیا۔ اشنان کے بعد اپنے کمرے میں آیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کامنی ناشتہ لے کر آگئی اور پوری کا ایک نوالہ میرے منہ میں رکھ کر بولی۔

''اب خوش ہوجاؤ کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ سے نوالہ تمہارے منہ میں رکھ دیا، یہ بھی خوشی کی بات ہے، اب میں جارہی ہوں، ناشتہ کے بعد ترنت مندر میں پہنچ جانا۔''

وہ چلی گئی اور میں ناشتہ کرنے کے بعد مندر میں پہنچ گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ آج مندر میں گرو جی بھی بیٹھے تھے۔ گرو جی کی وجہ سے آج زیادہ لوگ مندر میں آرہے تھے۔

گنیش کاکا بھی مندر میں موجود تھے، گرو جی ان سے بولے۔ ''گنیش تم اپنے سامنے جلے ہوئے درخت کو کٹوانا، اور اتنا درخت کٹے کہ وہ گرنے نہ پائے، میں ترنت آتا ہوں اور اپنے سامنے درخت کو گرتا دیکھوں گا، دراصل ایک وجہ ہے جو تمہیں خود معلوم ہوجائے گا۔''

''جی بہت اچھا گرو جی! اب میں چلتا ہوں، آپ ایک گھنٹہ تک پدھاریئے گا۔'' اور یہ بول کر گنیش کاکا چلے گئے۔

مندر میں لوگ آتے رہے اور دیوی ماں کے پرنام کے بعد گرو جی کے چرن چھوتے اور آشیرواد لے کر چلے جاتے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے تک لوگوں کا آنا بند ہوگیا تو گرو جی بولے۔ ''گوپال اب چوپال کی طرف چلنا ہے اور یہ کام زیادہ اہم ہے، درخت کو زمین

موت

حضرت خالد بن ولید نے فرمایا۔ ''موت لکھی ہوئی نہ ہو تو موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے اور جب موت مقدر میں ہو تو زندگی خود جاکر موت سے لپٹ جاتی ہے۔

دنیا کے بزدلوں کو میرا یہ پیغام سنا دو اگر میدانِ جنگ میں موت ہوتی تو 100 جنگوں میں شریک ہونے والا خالد کبھی بستر پر نہ مرتا۔

(شہریار-حیدرآباد)

پر گرنے سے پہلے میرا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔''

بڑے پنڈت جی بولے۔ ''گرو جی کیا کوئی اہم کام ہے؟''

''ہاں گوپال، کام ٹھیک ٹھاک اہم ہے، وہاں چلو، تمہیں بھی معلوم ہوجائے گا۔ اب مندر بند کرادو، اب کوئی مندر میں نہیں آئے گا۔''

اور ہم مندر سے نکل کر چوپال کی طرف بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہم چوپال کے قریب پہنچ گئے۔ جلے ہوئے درخت کو کئی ہٹے کٹے جوان کلہاڑیوں سے کاٹ رہے تھے۔ ابھی تک درخت کی جڑ آدھے سے زیادہ کٹ چکی تھی۔ پنڈت جی قریب گئے۔ وہاں گنیش کاکا موجود تھے۔

گرو جی مندر سے چلتے وقت اپنے ہاتھ میں پیتل کا ایک لوٹا بھی لائے تھے۔ اس لوٹے میں پانی تھا۔ گرو جی نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر لوٹے کے پانی پر پھونک ماری اور پھر اس لوٹے کے پانی کو درخت کے چاروں اور پتلی دھاری میں گرانا شروع کردیا۔ یعنی گرو جی پانی سے درخت کے گرد ایک کنڈل قائم کردیا۔

تھوڑی دیر میں ہی جوانوں نے درخت کو کاٹ

دیا اور پھر درخت دھڑام سے زمین بوس ہوگیا تو گرو جی آگے بڑھے اور درخت کی جڑ کے پاس جا کر رک گئے۔ درخت کی جڑ میں ایک بڑا سا بل موجود تھا، گرو جی نے لوٹے میں بچا ہوا پانی، ٹوٹی کے ذریعہ اس بل میں ڈال دیا، پانی ڈالنے کے بعد چند قدم ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔

اچانک بل کے اندر سے ''شوں.....شوں۔'' کی آوازیں باہر کو نکلنے لگیں۔

''شوں.....شوں۔'' کی آوازوں کے بعد پھر زور دار طریقے سے پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ اور پھر اچانک ایک کالا بھجنگ بپھرا ہوا غضبناک صورت اختیار کئے سانپ نکلا، اس کی آنکھوں سے جیسے انگارے نکلتے نظر آرہے تھے اور پھر وقفے وقفے سے وہ پھنکارتا تو حقیقت میں اس کے منہ سے شعلہ کی جھلک نظر آتی تھی۔

بل سے وہ پورے کا پورا نکل چکا تھا اور درخت کی جڑ میں بہت بے چینی اور غصے کی حالت میں بل کھا رہا تھا۔ اس کی نظریں گرو جی پر مرکوز تھیں۔ اور یک ٹک گرو جی کو پھنکارتے ہوئے دیکھے جا رہا تھا۔

اس قدر زبردست اور خطرناک سانپ تھا کہ اسے دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے، بہت سارے لوگ تو سہم کر رہ گئے تھے کیونکہ سب نے ابھی تک اپنی پوری زندگی میں ایسا خطرناک اور دہشت ناک سانپ نہ دیکھا تھا۔

اس جگہ موجود گاؤں کے سارے لوگ دہشت کی وجہ سے جیسے سکتے کے عالم میں تھے، سانپ کے تیور بہت خراب تھے، وہ کینہ توز اور کھا جانے والی نظروں سے گرو جی کو دیکھ رہا تھا اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر کچھ زیادہ ہی بے چینی محسوس کر رہا ہو، وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنی جگہ چکر دار طریقے سے گھوم رہا تھا۔

اس کا نہ جانے کیوں بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اڑتا ہوا آتا اور گرو جی کی گردن سے لپٹ کر آن واحد میں ڈس کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا، وہ بار بار کوشش کر رہا تھا کہ اپنی جگہ سے آگے کو بڑھے مگر جونہی وہ پانی سے بنے لکیر کے پاس آتا تو ایک جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹ جاتا۔

اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی ان دیکھی شکتی جو کہ کنڈل پر معمور تھی وہ سانپ کو اذیت دیتی ہے کی وجہ سے وہ جھٹکا کھا کر پیچھے کو ہٹ جاتا۔

اب اس کی پھنکاریں کافی دہشت ناک بن چکی تھیں، اگر اس جگہ گرو جی موجود نہ ہوتے تو اب تک سارے گاؤں والے دہشت زدہ ہو کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ چکے ہوتے، وہ گرو جی ہی تھے جنہوں نے گاؤں والوں کی ڈھارس بندھائے رکھی تھی، وہ بار بار ہاتھ اشارہ کرتے کہ سارے لوگ شانت رہیں اور اس سانپ کی اصلیت جانیں اور انہیں یہ پتہ لگے کہ سانپ کون ہے اور کیوں اور کیسے یہاں آیا، اور اب کیا چاہتا ہے؟

اتنے میں گرو جی کی آواز سنائی دی۔ ''بھائیو سانپ کوئی عام سانپ نہیں، دراصل یہ گوپی کی آتما سہائتا کے لئے یہاں آیا تھا، یہ اپنا خطرناک اور خو کھیل کھیلنے کے لئے اس جگہ موجود ہے۔ اگر مجھے اس کا علم نہ ہوتا تو یہ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ لوگوں کے بدن میں اپنا ناقابل علاج زہر ڈالتا اور پھر اس بل میں چھپ جاتا، یہ گوپی کا ساتھی ہے، گوپی نے اسے راضی کیا کہ گوپی کی مدد کرے۔

چونکہ گوپی کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن گاؤں میں اس کی آمد رک جائے گی اور پھر گاؤں والے سکھ شانتی سے رہنے لگیں گے۔ لہٰذا یہ کالی، رات کے اندھیرے میں لوگوں کو مارتا رہے گا۔ اس کا زہر اتنا مہلک اور تیز ہے کہ اس کے ڈستے ہی چند منٹ میں لوگوں کا ناطہ زندگی سے ختم ہو جاتا ہے۔

جب گوپی کی آتما رات سے ہر طرف سے گھر گئی تو وہ اس درخت پر چھپ گئی، اور پھر یہ دشٹ موذی کو بھی فرار کا راستہ نظر نہیں آیا تو یہ بھی یہاں بل میں گھس کر چھپ گیا اور جب گوپی کی آتما کا خاتمہ ہو گیا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ اب مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی، مگر اسے شاید یہ

پتہ نہیں تھا کہ جو گوپی کی خونی آتما کا خاتمہ کر سکتا ہے وہ اس پر بھی نظر رکھے گا، اس کا نام کالیا ہے۔

یہ اپنے وقت کا بہت ظالم اور خونی آدمی تھا۔

جب یہ زندہ تھا تو اس نے ایک بہت خطرناک جاپ کیا تھا۔ اس جاپ کو کرنے کا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ یہ اپنے علاقے اور قرب و جوار پر حاکم بن بیٹھے، کوئی اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکے، علاقے کے سارے گیانی دھیانی یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں یا پھر سب کے سب اس کا غلام بن کر رہیں۔ اس کا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ اپنے جاپ کے دوران اس نے غلام آتماؤں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ روزانہ رات کے وقت علاقے سے ایک کم عمر بچہ اٹھا کر لائیں اور جاپ کے غلام آتما کو بھینٹ دیں۔ اور یہ کام بلا ناغہ ہو رہا تھا۔ بھینٹ کے بعد اس بچے کا سارا ماس وہ آتمائیں نوچ لیتی تھیں اور یہی نہیں بلکہ اس کی ہڈی تک چبا جاتی تھیں۔

اس کا جاپ چالیس راتوں کا تھا، اس نے چھتیس راتوں کا جاپ مکمل کر لیا تھا۔ صرف چار راتوں کا جاپ رہتا تھا کہ اچانک ایک بہت بڑے گیانی دھیانی مہاراج کو اس کا اور اس کے ارادے کا علم ہو گیا کہ اگر اس کا جاپ مکمل ہو گیا تو یہ اپنے علاقے میں ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا بلکہ آہستہ آہستہ سب کو نیست و نابود کر کے اس علاقے کا حکمران بن بیٹھے تھے۔

وہ مہاراج اس کے اچھا جان کر بہت بیاکل ہوئے ان کا سکھ چین ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔ وہ ہر صورت علاقے کے لوگوں کو بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے بھگوان سے اپنے سہائتا کی درخواست کی، وہ کئی روز سے نہ کچھ کھایا اور نہ پیا تھا۔ بس ان کے من میں ایک چنتا تھی کہ کسی طرح بھی اس دشٹ اور خونی کا خاتمہ ہو جائے۔

ان تمام حالات کو جانتے ہوئے دیوی اور دیوتاؤں کی ایک بیٹھک ہوئی اور سب نے متفقہ طور پر یہ اچھا ظاہر کی کہ اب کالیا کا جیوت رہنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس کے ارادے بہت خونی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اپنے علاقے کے لوگوں کا صفایا کرے گا۔ اس کے بعد یہ اپنے علاقے کے جو قریب کے گاؤں ہیں ان کا جینا دوبھر کر کے ان کا خاتمہ کر دے گا۔

لہٰذا سب نے ملکہ مہاراج کو ایک منتر بتایا اور بولے۔ ''ترنت اس پر عمل کرنا ہے کیونکہ یہ چھتیس دن کا جاپ مکمل کر چکا ہے اور اب صرف چار راتوں کا جاپ رہتا ہے اور آخری رات سے پہلے پہلے اس کا خاتمہ ضروری ہے۔''

مہاراج نے دیوی دیوتاؤں کے آگے ہاتھ جوڑا اور بولے۔ ''آپ سب کا بہت بہت دھنے واد کہ آپ لوگوں نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی اور میں آپ لوگوں کی اچھا کے آگے اپنا سر جھکاتا ہوں اور لوگوں کی رکھشا کے لئے اگر ضرورت پڑی تو میں اپنا جیون بھی تیاگ دوں گا۔ اگر میرے ایک جیون کے خاتمہ سے بے شمار لوگوں کا جیون بچتا ہے تو یہ میرے لئے بہت خوشی کا مقام ہوگا۔'' یہ بول کر مہاراج نے سب کو جھک کر پرنام کیا اور منتر کی پڑھائی کے لئے گیان دھیان میں لگ گئے۔

پورے دو دن اور دو رات اس منتر کا مہاراج جاپ کرتے رہے اور تیسری رات اس کالیا کو نشٹ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ دشٹ اپنے آپ میں بہت مست تھا اور اسے یقین تھا کہ کوئی بھی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

اب میری کامیابی یقینی ہے صرف دو راتوں کی بات ہے یعنی آج کی رات اور کل کی آخری رات بعد میں مہان شکتی شالی بن جاؤں گا۔ سب میرے غلام ہوں گے۔ سب میرا حکم مانیں گے۔ میں منتروں اور جنتروں کا راجا بن جاؤں گا۔ بڑی بڑی آتمائیں اور بڑے بڑے بیر میرے قبضے میں ہوں گے، اور میرے سامنے ہاتھ باندھے میرے حکم کے منتظر ہوں گے، ایک اشارے سے میں جو چاہوں گا کروں گا۔'' اس قسم کی

باتیں یہ دشٹ سوچنے لگا تھا۔

اور پھر اس رات جب یہ آدھے جاپ پر پہنچا تھا کہ مہاراج آندھی اور طوفان کی مانند اس کے قریب پہنچے، اچانک کان پھاڑ دینے والے طریقے سے بجلی چمکی اور پھر وہ بجلی اس کے استھان پر گر گئی اور یہ جل کر بھسم ہو گیا مگر اس کی آتما ترنت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

سالوں سال سے اس کی آتما بھٹکتی پھر رہی ہے، اسے کہیں بھی شانتی نہیں ملتی، اور یہ اپنی فطرت سے مجبور ہے، یہ ہر وہ کام کرتا ہے جس سے لوگ پریشان ہوں، کئی مہینہ پہلے اس کی ملاقات گوپی سے ہوئی اور یہ گوپی کا مددگار بن گیا، اس نے گوپی سے کہا کہ ''تم فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ مل کر گاؤں والوں کو ملیا میٹ کر دوں گا۔'' اور اس طرح یہ گوپی کے ساتھ یہاں تک پہنچا لیکن یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ میری نظر اس پر پڑ گئی، اور اگر یہ میری نظر سے بچ جاتا تو بہت زیادہ خونی کھیل کھیلتا۔

گرو جی نے اپنی انگلی کا اس کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔ ''کالیا اب بتا تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، تو نے اپنے آپ کو اب بھی بہت مہان سمجھا ہے، ارے دشٹ تجھے یہ نہیں معلوم کہ مارنے والے سے بچانے والا بہت مہان ہوتا ہے، ایشور کبھی بھی منش کے ساتھ انیائے نہیں ہونے دیتا، سنسار میں بہت بڑے بڑے خود کو مہان اور شکتی شالی سمجھنے والے آئے اور ملیا میٹ ہو گئے، کالیا تو بھگوان کو بھول گیا تھا، ارے بھگوان کی مرضی اور سہائتا سے جب کوئی شکتی شالی اور مہان بنتا ہے تو لوگ اسے پرنام کرتے ہیں، اس کا نام اچھے دل سے لوگ لیتے ہیں، اب تیرا بچنا بہت مشکل ہے۔'' گرو جی ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ

وہ سانپ اپنی جگہ سے پھنکارتے ہوئے زور دار طریقے سے اوپر کو اچھلا۔ اس کی اچھال کئی فٹ اوپر تھی، مگر پھر اچانک ایسا لگا کہ جیسے اوپر سے آگ کے شعلے اس پر لپکے تو ترنت وہ دھپ سے نیچے اپنی جگہ پر گر پڑا۔ کوئی نادیدہ طاقت نے اس کے ساتھ ایسا کیا تھا، پھر وہ اچانک بل میں گھسنے لگا مگر اس مرتبہ بھی اسے ناکامی ہوئی، وہ فوراً بل کے اندر سے کھسکتا ہوا باہر کو نکلا اور غضبناک طریقے سے پھنکارنے لگا۔ اب وہ زیادہ خطرناک طریقے سے اس جگہ چکرانے لگا تھا۔

اتنے میں گرو جی نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو اچانک کسی بین کی سریلی آواز فضا میں سنائی دینے لگی۔ جس طرف سے بین کی آواز آئی تھی اس طرف وہ سانپ اپنا منہ کر کے پھنکارنے لگا۔

پھر بین کی آواز اس کی پشت پر سنائی دینے لگی تو وہ تیزی سے اس طرف گھوم گیا۔ جب وہ پشت کی طرف گھوما تو پھر بین کی آواز اس کے دائیں طرف سے سنائی دینے لگی، وہ فوراً تیزی سے دائیں جانب گھوما، اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وقفے وقفے سے بین کی آواز کبھی کسی طرف سے تو کبھی کسی طرف سے سنائی دینے لگی۔ جس طرف سے بھی بین کی آواز سنائی دیتی وہ اسی طرف تیزی سے گھوم جاتا۔

چاروں طرف گھومتے گھومتے وہ نڈھال ہونے لگا، اب اس کی پھنکار سست پڑنے لگی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کا کس بل دھیرے دھیرے نکلنے لگا تھا، ایک وقت آیا کہ بین کی آواز پر وہ تیزی سے چکرانے لگا، بین کی آواز ایک سمت نہیں ٹھہر رہی تھی بلکہ چاروں سمت چکرا رہی تھی، پھر ایسا ہوا کہ جیسے وہ نشہ میں جھومنے لگا تھا، اور پھر جھومتے جھومتے اس نے اپنا پھن زمین پر رکھ دیا، اس کے بعد وہ بالکل بے سدھ ہو گیا، مگر ابھی تک بین کی آواز سنائی دیتی رہی، جب اس میں بالکل بھی اٹھنے کی طاقت نہ رہی تو زمین پر بل کھانے لگا اور زور زور سے اپنا سر زمین پر مارنے لگا۔

پھر اچانک بل کے اندر سے شعلے کی ایک پتلی سی لکیر نکلی اور اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں وہ دہشت ناک سانپ جل کر کوئلہ بن گیا۔

گرو جی کے منہ سے نکلا۔ ''اچھا ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہو گیا، اس کا وجود ملیا میٹ ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ بھگوان کی کرپا سے ہوا۔

بھائیو! اب آپ لوگ اور یہ گاؤں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکھی ہو گیا، نہ گوپی کی آتما رہی اور نہ ہی کالیا کی آتما، اب آپ لوگ سکھ شانتی سے رہیں۔ کسی قسم کا بھی خوف دل میں نہ لائیں آپ، لوگ اپنے اپنے گھر جائیں، میں بھی ذرا جا کر آرام کرتا ہوں۔''

اور یہ بول کر گرو جی بڑے پنڈت جی سے بولے۔ ''گوپال اب چلو، کچھ تھکن سی لگ رہی ہے، اس کالیا کے چکر میں کافی سمے ہو گیا۔''

''جی گرو جی! چلیں۔'' پنڈت جی نے کہا تو گرو جی نے اپنے قدم مندر کی اور بڑھا دیئے۔ مندر میں پہنچ کر گرو جی نے پہلے اشنان کیا، اس کے بعد ان کے سامنے بھوجن چن دیا گیا تو تھوڑا بہت انہوں نے کھایا، اور اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

میں بھی اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا، تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کامنی تھالی میں کھانا لے کر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھانے کی تھالی میرے سامنے رکھی اور بولی۔ ''پرتاب تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو، چلو جلدی سے کھانا کھاؤ اور پھر آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں مجبور ہوں ورنہ تمہارے ہاتھ پاؤں دبا دیتی۔''

''چلو! خیر کوئی بات نہیں، تم میرے لئے زیادہ چنتا نہ کیا کرو، میں ٹھیک ہوں، بس تم کھاؤ، پیو اور خوش رہا کرو، ہنستی مسکراتی تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تم خوشی خوشی جاؤ، میں کھانا کھا لوں گا۔''

''ٹھیک طرح کھانا کھا لینا، یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ رام لال جی ادھر آ جائیں، اب میں چلتی ہوں، برتن بعد میں لے جاؤں گی، کھانا کھا کر آرام سکون سے سو جانا، کہیں ایسا نہ ہو کہ رات بھر کروٹیں بدلنے میں گزارو، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔'' اور پھر وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا، اس کے بعد ایک گلاس پانی پی کر بستر پر لیٹ کر آنے والے سمے کے متعلق سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند سے واسطہ پڑ گیا، اور پھر نیند کی دیوی نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ کر ہوش سے بیگانہ کر دیا۔

''پرتاب جلدی اٹھو صبح ہونے والی ہے، جلدی سے آٹھ کر اشنان کر لو، میں تمہیں اٹھانے کے لئے آ گئی، گرو جی بھی اٹھ کر اشنان کے لئے جا چکے ہیں اور ساتھ ہی دونوں پنڈت جی بھی اٹھ گئے ہیں، میں جلدی سے جا رہی ہوں، میں صرف تمہیں اٹھانے کے لئے آ گئی، جلدی جاؤ۔'' اور پھر اس نے رات کے کھانے کے برتن اٹھائے اور کمرے سے ترنت نکل گئی۔ میں جلدی سے اٹھا اپنے کپڑے لئے اور اشنان کے لئے چلا گیا۔ مندر میں یہ بھی ضروری تھا کہ صبح ہونے سے پہلے اشنان کرنا پڑتا تھا ورنہ اپنے گھر میں کوئی پوچھتا کہ کب نہاؤ گے اور نہ ہی صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے یہ کام ضروری تھا۔ میں اشنان کرنے نکلا تو صبح کا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا اور پھر تھوڑی دیر میں کامنی ناشتہ لے کر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں ترنت اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

وہ میرے سامنے بیٹھی یک ٹک مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتی رہی پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ''رات کیسی گزری؟''

ارے رات گزری تو نہیں بلکہ کروٹیں بدل بدل کر گزار دیں۔ نیند کو بلاتے بلاتے سے گزر تا رہا اور پھر نہ جانے نیند نے کب مجھے جکڑ لیا۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''اچھا چلو! باتیں زیادہ نہیں بلکہ ناشتہ ضروری ہے، اس نے ایک نوالہ بنا کر میرے منہ میں رکھا تو میں نے بھی پوری کا ایک نوالہ بنا کر اس کے منہ میں رکھ دیا۔ جلدی سے اس نے نوالہ کو چبا کر اٹھ گئی اور بولی۔ ''گرو جی اور دونوں پنڈت مہاراج مندر جا چکے ہیں تم جلدی سے ناشتہ کرو اور مندر میں پہنچو، میں جا رہی ہوں مندر بھی جانا ہے، اب مندر میں ملاقات ہو گی۔'' اور یہ بول کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ناشتہ کیا اور

مندر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، میں کمرے سے نکل کر مندر میں پہنچا، اس وقت تک مندر کی گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ مندر میں جا کر میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ گرو جی اشلوک پڑھنے میں مصروف تھے اور پنڈت جی گردن جھکائے بیٹھے تھے۔

سب سے پہلے مندر میں گنیش کا کا آئے۔ دیوی ماں کو پرنام کیا اور پھر گرو جی کے چرن چھوئے اس کے بعد باری باری بڑے پنڈت جی اس کے بعد رام لال جی کے بھی چرن چھو کر ایک طرف بیٹھ گئے، اس کے بعد تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگ آتے رہے اور چڑھاوا چڑھا کر جاتے رہے۔ جانے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جو کہ اپنے کھیت کھلیانوں میں کام کے لئے جاتے تھے اور جو لوگ کام پر نہیں جاتے تھے۔ وہ مندر میں ہی بیٹھ جاتے تھے۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے گرو جی کی آواز سنائی دی۔ ''گوپال اب مجھے بھی چلنا چاہئے۔ سمے ہو رہا ہے، میں نے استھان پر پہنچنا ہے کیونکہ دوپہر سمے کئی لوگ استھان پر آئیں گے، اب تم گاڑی کا جلدی سے بندوبست کرو۔'' اور پھر گرو جی لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''بھائیو! اب میرے جانے کا سمے ہو گیا ہے، آپ لوگ کسی قسم کی کوئی چنتا نہ کرنا، کھاؤ پیو اور شانتی سے رہو، ویسے بھی میں کوئی زیادہ دور نہیں، اکثر آپ لوگوں کے پاس آتا رہتا ہوں، اور پھر گوپال کی لگن مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے، ویسے گوپال بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔'' اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''پرتاب پتر، تم کسی قسم کی چنتا نہ کرنا، بہت جلد تمہاری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی، مگر قسمت کی ریکھا کو کوئی بھی نہیں مٹا سکتا، جو کچھ بھی جیون کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے اسے تو بھوگنا ضروری ہے، ہر انسان کے جیون میں کوئی نہ کوئی کشٹ ضرور ہے، تم کشٹ سے گھبرانا نہیں، سکھ شانتی اور کشٹ بھی تمہارے جیون میں ہیں۔'' اور پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اتنی دیر میں بڑے پنڈت جی گھوڑا گاڑی والے کو بلوا چکے تھے۔ گھوڑا گاڑی کو دیکھ کر گرو جی اٹھ کھڑے ہوئے اور مندر سے نکلتے چلے گئے۔ بڑے پنڈت جی گرو جی کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بڑے پنڈت جی نے رام لال جی سے کہا۔ ''رام لال میں گرو جی کے ساتھ انہیں چھوڑنے جا رہا ہوں، میں کل صبح سمے آؤں گا، تم سب کا خیال رکھنا۔'' اور پھر گرو جی نے اپنا ہاتھ ہلا کر سب کو سکھ شانتی کا اشارہ کیا، اس کے بعد کوچوان نے گھوڑے کو چابک کا اشارہ دیا تو گھوڑا آگے کو بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اپنے سمے پر مندر کے دروازے بند ہو گئے، رام لال جی اپنے کمرے میں اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا، دن کے دو بجے کامنی کھانا لے کر آ گئی، میں نے کھانا کھایا اس درمیان وہ باتیں کرتی رہی، کھانے کے بعد اس نے برتن اٹھائے اور چلی گئی، یہ بول کر کہ ''رات سمے پھر ملاقات ہو گی۔'' کھانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا، اور پھر تھوڑی دیر میں ہی نیند مجھ پر حاوی ہو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں ترنت اٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا۔ ''ارے میں آج اتنی دیر تک سوتا رہا اور کامنی نے بھی مجھے نہیں جگایا، خیر کامنی نے سوچا ہو گا کہ سونے دو۔''

ٹھیک رات کے آٹھ بجے میرے کمرے میں کھانے کی تھالی اٹھائے تلسی حاضر ہوئی۔ تلسی ان دونوں میں سے ایک تھی جو کہ کامنی کے ساتھ تھیں۔ میں تلسی کو دیکھ کر چکرا گیا۔ تلسی نے کھانے کی تھالی میرے سامنے رکھی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں اچانک مندر میں موجود تمام گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ ''مگر یہ کیا رات سمے تو مندر بند ہوتا ہے، پھر یہ گھنٹیاں خود بخود کیسے بج رہی ہیں؟''

(جاری ہے)

نیو ولی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
بازار ہری پور

پراسرار ماسی

شفق شیکی۔ سیالکوٹ

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے یا پھر گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے، یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے یا پھر یہ کہنا بھی درست ہے کہ چور کو محافظ بنادینا، اس حقیقت کا پتہ کہانی میں موجود ہے۔

جادو ٹونے کے لبادے میں لپٹی ہوئی اور خوف و ہراس پھیلاتی دہشت ناک کہانی

حویلی کے پرانے نوکروں میں سب سے زیادہ اہمیت ہمیشہ سے ''ماسی منی'' کو ہی حاصل رہی تھی۔ ماسی منی، سرخ و سفید رنگت اور خوبصورت نین و نقش کی حامل تھی...... اور ماسی منی کو اپنے آپ پر بڑا غرور تھا، اس کا بل کھاتا ہوا چھریرا جسم اور پھر اکڑ کر چلنا اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا شعور، اسے کہیں چین نہ لینے دیتا تھا حالانکہ اب اس کی عمر ڈھل رہی تھی۔ لیکن پھر بھی ایسے ظاہر کرتی تھی جیسے ابھی ابھی نوجوانی کے دور میں داخل ہوئی ہو...... وہ بے حد چرب زبان، مکار اور عیار فطرت کی حامل عورت تھی...... اور شاید اسی لئے حویلی میں تمام دیگر نوکر اس سے بہت ڈرتے تھے۔ ماسی حویلی میں بہت پہلے سے یعنی برسوں سے موجود تھی...... وہ بیوہ تھی...... اور اکلوتے جوان وفات پائے بیٹے کی ماں بھی تھی...... لیکن پھر بھی اس میں حد سے زیادہ اکڑ اور غرور

تھا۔ جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

حویلی کے تمام چھوٹے اور بڑے بچوں کے اکثر پیچھے پڑی رہتی تھی۔ اگر جواب میں ہم بچے اسے کچھ کہہ دیتے تو تو بس..... پھر ماسی اپنا شکایت نامہ لے کر حویلی کے کرتا دھرتا بڑوں کے آگے جا کر کھڑی ہو جاتی تھی..... اور پھر ہم سب کی ایسی شامت آتی اور ایسے چھترول ہوتی..... کہ بس.....

ماسی منی، کے نام پر ایک لمبا سبق بھی سننے کو ملتا تھا کہ "وہ بے چاری دکھی عورت، حویلی کی پرانی نمک حلال، پرانی خدمت گار وغیرہ وغیرہ۔"

لیکن اس کے خلاف شکایت کی صورت میں ہم منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتے اس وجہ سے ہمارے سارے بڑے جذبات میں آ کر ہم سب کی خوب شامت لگاتے تھے..... اور آخر میں یہ کہتے کہ "ماسی منی، تم بچوں پر اگر غصہ کرتی ہے تو صرف اوپری غصہ کرتی ہے ورنہ وہ تم لوگوں سے بڑا پیار بھی کرتی ہے.....

تم لوگ ماسی منی کی عزت کرنا سیکھو..... دیکھو..... اس نے کیا کچھ کھویا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔"

خیر..... عزت تو ہم سب ماسی منی کی کرتے ہی تھے..... لیکن شاید اس کو عزت راس نہیں آتی تھی اور وہ شاید کوئی موقع ہمیں ڈانٹ پھٹکار پڑوانے کا ضائع نہیں کرتی تھی۔

ماسی نے اگر بہت کچھ کھویا تھا..... تو کیا اس میں ہمارا قصور تھا؟

ماسی کا اپنا بیٹا..... جو کہ کچھ عرصہ پہلے ہی حویلی کے پاس ہماری زمین کے ایک جھگڑے میں قتل ہو گیا تھا..... اس کی جوان موت پر ہماری حویلی میں بڑے دنوں تک ماتم رہا تھا..... ماسی کا یہ دکھ بہت بڑا تھا..... لیکن ماسی تو نجانے کیسی عورت تھی اسے تو جیسے ان سب باتوں اور جو دکھ اس کو ملے تھے..... اس سے شاید کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ تو اور زیادہ ہم تمام کزنز سے خار کھانے لگی تھی.....

ماسی اکثر حویلی کے بڑوں سے اپنی فرمائشی پروگرام کا جا بجا بتاتی نظر آتی تھی..... اور بڑوں پر نجانے کیسی جادو کی پٹی بندھی ہوئی تھی..... کہ سب ماسی کا ہی دم بھرتے رہتے تھے۔

کچھ دنوں سے ہم سب کزنز نے اس بات کا کافی مشاہدہ کیا تھا..... کہ ماسی کی بڑی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم سب نے غور کیا تھا کہ وہ کچھ دنوں سے کچھ الگ الگ اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔

تو ہم سب کزنز نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ..... ماسی کی ان سرگرمیوں کی خفیہ جاسوسی شروع کی جائے۔ اس بات کے لئے ہم سب راضی تھے..... اب ہم سب مختلف طریقے سے اس کی نگرانی کرنے لگے تھے..... ہمیں صرف اس بات کا خاص خیال رکھنا تھا کہ کسی بڑے کو اور ماسی کو اور دیگر نوکروں کو ہمارے منصوبے کی بالکل بھی بھنک نہ لگے..... ورنہ بڑی مشکل ہو سکتی تھی.....

بہر حال ہم سب کزنز نے جو جاسوسی کرنی تھی..... اس کے لئے ہماری ینگ پارٹی میں چار لوگ تھے جبکہ چھوٹے بچوں میں تقریباً تین شامل تھے۔

ہم سب بھی بڑے چالاک تھے۔ ماسی کی ایسے نگرانی کر رہے تھے..... کہ اس مکار کو کچھ معلوم نہ پڑا تھا۔ ماسی کی کچھ سرگرمیاں جو بڑے جوش و خروش سے جاری تھیں۔ وہ کچھ یوں تھیں۔

اکثر مغرب کے وقت عقبی صحن جو کہ صحن کم اور کھنڈر زیادہ تھا۔ وہاں پر پرانے برگد کے درخت کے نیچے وہ بیٹھ کر موٹے دھاگے میں بل دے کر اس میں گرہ لگاتی جاتی، اسی طرح موٹے دھاگے میں بہت سی گرہ ڈال کر اس کو درخت کے گرد ہار کی طرح لٹکا دیتی..... پھر اسی درخت کی جڑ میں تازہ ہلکا گرم دودھ جس کا رنگ کچھ زیادہ ہی عجیب سا پیلاہٹ لئے ہوتا تھا..... وہ دودھ برگد کی جڑ میں بہا دیتی تھی۔ اور کبھی درخت کی جڑ کی مٹی میں چھوٹے گہرے برتن میں نمک بھرا ہوتا۔ جس کے اندر تعویز رکھ کر دبا دیتی تھی۔

ایک دن میری کزن رباطہ نے ہماری خفیہ پارٹی

کو بتایا کہ "ماسی دوبارہ عقبی کھنڈر زدہ صحن میں سہ پہر کے وقت گئی تھی۔ حالانکہ شدید گرمی بھرے دن تھے اور اس وقت سب بڑے آرام فرما رہے تھے اور اپنی نیک بی بی یعنی ماسی کے کارنامے سے انجان تھے۔ کہ وہ اپنے اندر کیسے یہ عزائم چھپائے، کون سے کھیل کھیلنے کی تیاری میں مشغول تھی۔

"نجانے ماسی ہماری حویلی میں ہم سب کے لئے کیسے خطرناک عزائم کا ارادہ رکھتی تھی۔

نہ جانے اسے ہم حویلی والوں سے کیسی دشمنی تھی؟"

اس بات کو ہم سب نے بہت بار سوچا تھا لیکن جواب تلاش نہ کر سکے تھے۔

ہماری حویلی بہت پرانی اور خوبصورت تھی اس حویلی میں ہم سب کزنز بڑے مزے اور ٹھاٹ سے رہتے تھے..... ہمارے دادا کی نزدیکی گاؤں میں کافی اراضی تھی اور کچھ پھلوں کے باغات بھی تھے..... چھٹیوں میں ہم سب وہاں لازمی مزے کرنے جاتے تھے لیکن وہاں ہمارے سامنے وہ بلا یعنی ماسی بھی اکثر ہی ہوتی تھی..... اس کی ہڈی میں چین نام کی کوئی چیز نہ تھی، اسی نزدیکی گاؤں میں ہمارے دادا کا ایک واقف کار ہوتا تھا..... جس کا نام شاید رحیم دین تھا، وہ ایک غریب کسان تھا۔ اس کا ایک بیٹا اشرف دین تھا۔ اس نے بندر پالا ہوا تھا۔ جب اس کا باپ مرا تو اشرف دین عرف شرفو نے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس بندر کا گاؤں میں اور کبھی شہر میں آ کر تماشہ دکھانے لگا۔ وہ ہر جمعہ کو ہماری حویلی میں اپنے بندر کو اور اپنے سامان کی پوٹلی رکھ کر جاتا اور پھر جمعہ پڑھ کر واپس آتا اپنی پوٹلی اور بندر لے جاتا تھا۔ وہ بہت غریب تھا اس کے کئی بچے تھے.....

وہ جب بھی جمعہ کو حویلی آتا۔ اکثر ہماری ضد پر ہمیں بندر کا تماشہ ضرور دکھاتا پھر بدلے میں حویلی سے اسے راشن پانی مل جاتا تھا۔

شرفو جیسے ہی اپنے بندر کو اندر لاتا، منی ماسی شرفو کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی۔ "اوئے شرفو، اپنے اس گندے مندے بندر کو یہاں نہیں لایا کر، بلکہ وہ۔ سامنے نکڑ میں باندھ دیا کر..... تیرا بندر میری نماز اور تسبیح کرے گا۔"

"شرفو چاچا..... بے چارگی سے اپنے بندر کی رسی پکڑتے اور جہاں ماسی کہتی وہی پر باندھ دیتے تھے۔

ایک بات بتا دوں کہ شرفو چاچا کا بڑا بندر کچھ دنوں پہلے اچانک مر گیا تھا اور اب وہ اپنے چھوٹے بندر سے تماشہ دکھلانے کا کام لیتے تھے۔

ایک دن جمعہ کے روز شرفو چاچا آئے اور اپنے چھوٹے بندر کو باندھ کر چلے گئے۔ ماسی اندر سے برآمد ہوئی، اس کے ہاتھ میں سلائی کا ڈبہ تھا..... وہ بندر کے پاس بیٹھی پتہ نہیں اس بندر کا شاید ناپ لے رہی تھی۔

ہماری بڑی ہنسی نکل رہی تھی۔ اس کی یہ عجیب سی حرکت دیکھ کر..... کیونکہ وہ بندر کو کچھ کھلا کر..... اس کی لمبی دم پر ہاتھ پھیرتی جاتی تھی.....

"ماسی، تجھے آج بڑا پیار آ رہا ہے اس گندے بندر پر..... بتا..... ناں ماسی کیا ہوا ہے..... یہ صاف ہو گیا کیا؟"

چھوٹے شایان نے شرارتی انداز میں ماسی کو تنگ کرتے ہوئے کہا، باقی ہم سب بھی پیچھے کھڑے ہنس رہے تھے..... ماسی تو جیسے آگ بگولہ سی ہو گئی اور بولی۔

"دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے ہر ویلے میرے سر وتے اتے ناچن دا بڑا شوق اے تانوں لوگانوں..... مصیبت مارے..... مروجا کے کدھرلے....." منی ماسی نے زہر خند لہجے میں ہم سب کو مخاطب کیا تھا۔

ہم سب حیرت سے ایک دوسروں کو تکنے لگے کہ "یہ ماسی شاید مزید پاگل ہو چکی ہے۔" یہ سوچتے ہوئے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور وہاں سے ہٹ گئے۔

جانے سے پہلے شرفو چاچا بتا کر گئے تھے کہ وہ آج کچھ کام سے شہر جا رہے ہیں، اس لئے لوٹنے میں کافی دیر لگے گی، مطلب شاید وہ شام میں واپس آ کر اپنا بندر اور سامان یہاں سے لے جائیں گے۔

جیسے ہی شام کا اندھیرا گہرا ہوا۔ شرفو چاچا کی حویلی میں واپسی ہوئی۔ وہ اپنے بندر کو کھولنے کے لئے صحن کی

نکڑ کی طرف گئے۔لیکن ان کا بندر وہاں موجود نہ تھا۔تو وہ حیران و پریشان ہوکر ہم سب سے پوچھنے لگے۔لیکن ہم سب نے دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے دیکھا تھا،اس کے بعد تو ہم اس طرف نہیں گئے تھے۔ہم سب سے پوچھنے کے بعد چاچا نے حویلی کے بڑوں اور منی ماسی سے اپنے بندر کے بابت پوچھا۔

سب نے لاعلمی ظاہر کی ...... ہم سب بہت پریشان تھے کہ ان کا بندر کہاں غائب ہوگیا تھا...... کیونکہ شرفو چاچا نے خود اسے صحن کی نکڑ والی جگہ پر رسی سے باندھا تھا۔

اس لئے بندر خود سے کہیں جا نہیں سکتا تھا۔خیر شرفو چاچا نے باہر جاکر حویلی کے نزدیک لوگوں سے پوچھا اور کافی دیر تک بندر کو تلاش کرتے رہے۔لیکن افسوس کہ بندر نہ مل سکا، شرفو چاچا۔تھک ہار کر...... اپنا سامان اٹھا کر واپس چلے گئے۔

لیکن نجانے کیوں......اس سارے معاملے میں ماسی منی کے چہرے پر ہمیں خوشی کی لہریں آتی محسوس ہوئی تھیں۔

یہ کچھ دن گزرنے کے بعد کی بات ہے اس دن بڑی سخت گرمی تھی سہہ پہر کے وقت میں رباطہ اور احمد ہم تینوں ماسی منی کی جاسوسی کرر ہے تھے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ حویلی کی دوسری منزل پر گئی ہے۔کچھ دیر بعد ہم تینوں بھی اس کے پیچھے دوسری منزل پر بنے آخری اسٹور نما کمرے کے سامنے پہنچ چکے تھے......ہم میں سے احمد نے پچھلی طرف کی کھڑکی سے چھپ کر دیکھا کہ ماسی ایک بڑی چھری سے کچھ کاٹ رہی تھی...... جس کی آواز کھچر ......کھچر ......جیسی آرہی تھی......

اس کے اردگرد کچھ دوسرا سامان بھی بکھرا پڑا تھا جس میں سیاہ کوئلے ،نمک ،آم کی گٹھلیاں،ٹوٹا ہوا آئینہ،سوئی دھاگہ اور چھوٹے کنکر ایک چھوٹی پتیلی جس میں رکھا ہوا تھا۔

جس چیز کو وہ کاٹ رہی تھی وہ احمد کو نظر نہ آسکی تھی۔ احمد جلدی سے خوف زدہ ہوکر ہماری طرف آیا۔اور ہمیں نیچے چلنے کا اشارہ کیا...... ہم سمجھ گئے اور وہاں سے زینہ اتر کر نیچے آگئے۔پھر احمد نے ہمیں سب کچھ جو اس نے دیکھا تھا بتادیا اس کی تمام باتیں سننے کے بعد ہمیں بھی خوف سے پسینے آنے لگے تھے......

اب ہماری خفیہ ینگ پارٹی کو پکا یقین ہوگیا تھا کہ ماسی خفیہ طریقے سے وہ سب کرر ہی تھی وہ ضرور جادو ٹونہ اور کالے سفلی علم میں لگی پڑی تھی۔

لیکن وہ سب کیوں اور کس لئے کرر ہی تھی؟ اس کے سب کچھ کرنے کے پیچھے کیا مقاصد تھے؟

جسے ہم سب جاننے سے قاصر تھے۔

لیکن حویلی کے تمام بڑوں پر جانے منی ماسی نے کیسا جادو چلا رکھا تھا کہ سب کچھ سامنے ہوتے ہوئے بھی جانے کیوں......تمام بڑوں کو کچھ نظر کیوں نہیں آتا تھا؟

بہر حال...... جو کچھ بھی تھا......لیکن ہم سب کزنز نے یہ ارادہ پکا کرلیا تھا...... کہ اس کے ان کرتوت اور چکروں کی لگاتار جاسوسی کرنی ہے اور موقع دیکھ کر ماسی کا پول بڑوں کے سامنے کھولنا ہے......اب تو یہ ہمارے لئے ایک اہم مشن کی طرح تھا۔جسے ہمیں مل جل کر مکمل انجام تک پہنچانا تھا۔

خیر...... کچھ دن بڑی خاموشی سے گزر گئے لیکن ایک دن ،ہم سب حویلی کے چھت پر شام کے وقت ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہورہے تھے۔چونکہ گرمی بھرے دنوں میں شام کے وقت کچھ موسم ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو ہم سارے کزنز چھوٹے ،بڑے سب موسم کا بھرپور مزہ لینے کے لئے چھت پر موجود تھے کہ اچانک ہی رباطہ اور شہنی نے زور سے چلا کر ہم سب کو چھت کی دیوار کی طرف اشارے سے بلایا وہ دونوں چھت کی جس دیوار سے لٹک کر نیچے کی جانب دیکھ رہی تھیں اس دیوار کے ساتھ عقبی صحن کی دیوار ملی ہوئی تھی اور عقبی صحن جو کہ کھنڈر کی مانند تھا وہاں سے بالکل صاف نظر آتا تھا......ہم سب نے بھی چھت کی دیوار سے جھانک کر نیچے دیکھا تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ اس کھنڈر زدہ صحن میں ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا سا تندور ہوتا تھا، وہ بہت عرصے پہلے سے خراب ہوچکا تھا

اس پرانے تندور کے اندر،شرفو چاچا کا بندر مردہ حالت میں مرا پڑا تھا۔پھر بعد میں ہم سب نے نیچے آکر جب قریب سے دیکھا تو ہم سب چکرا کر رہ گئے کیونکہ اس بندر کی دم کسی نے بے رحمی سے کاٹی ہوئی تھی۔

جب حویلی کے بڑوں میں بات پہنچی تو وہ بھی بے حد حیران ہوئے اور پھر شرفو چاچا کو کسی طرح اطلاع کی گئی، دوسرے دن شرفو چاچا آئے اور اپنے بندر کی دم کٹی لاش لے گئے وہ بہت روئے اپنے بندر کی ایسی دردناک موت پر......

گرمی بھرے دن اپنے جوبن پر تھے۔اس دن ہمیں دوسری منزل کے آخری کمرے میں چھپ کر چھاپہ مارنا تھا کہ آخر وہاں ماسی منی جا کر کیا کیا کرتی رہتی ہے اس بات کا اندازہ کرلینے کے بعد کے ماسی نیچے کے حصے میں سوئی پڑی ہے۔دبے قدموں سے ہم اوپر کی دوسری منزل کے آخری کمرے کے قریب پہنچے۔اس وقت ہم میں سے صرف میں ،رباطہ ،ثمر اور شہنی اس طرف خفیہ کارروائی کرنے آئے تھے۔

اس کمرے کی پچھلی جانب جو بڑی سی کھڑکی تھی اس کھڑکی سے باری باری کود کر ہمیں اندر جا کر ماسی کے کالے کاموں کا جائزہ لینا تھا کیونکہ کمرے کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا،شہنی نے کمرے کے سامنے کی طرف رہ کر پہرے داری کی ذمہ داری سنبھال لی اور باقی ہم تینوں کمرے کے اندر کود گئے۔وہ کمرہ چونکہ اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس لئے اس میں دوتین صندوق اور دیگر فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔

چونکہ باہر سے روشنی نہ ہونے کے برابر آرہی تھی اس لئے ہم اپنے ساتھ ٹارچ بھی لائے تھے ثمر نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں ادھر ادھر مارنا شروع کی، جیسے ہی روشنی کمرے کے وسط میں پڑی تو ہماری زبان دانتوں تلے آگئی۔جانوروں کی کچھ ہڈیوں کے ساتھ جانور کی غلاظت بھی ڈھیر کی صورت میں پڑی دکھائی دے رہی تھی۔اس جانور کی غلاظت کے ڈھیر کے اندر ادھ جلی اگربتی بھی دبی ہوئی تھی۔ایک عجیب سی، گندگی بدبو کا بھبھکا پورے کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا تھا۔حیرت تو اس بات کی تھی کہ کمرے کے اندر جب ہم کودے تھے تب ہمیں ایسی کوئی بدبو محسوس نہیں ہوئی تھی اس گندے ڈھیر کے کچھ آگے ٹارچ ماری تو ہم نے دیکھا ایک گول حصار کی صورت میں چھوٹے چھوٹے کنکر رکھے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی ایک پیتل کا برتن بھی پڑا تھا جس کے منہ پر ڈھکن موجود تھا اور سرخ رنگ کا کپڑا اس پر پڑا ہوا تھا۔

ثمر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا "مانو، اس ڈھکن کو اٹھا کر دیکھنا چاہئے۔؟"

اس نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھ کر پوچھا جواباً میں نے کہا "ثمر کوئی چیز ایسی ضرور ہوگی اس میں...... لیکن تم ہاتھ سے ڈھکن کو مت ہٹانا......" میں نے ادھر ادھر دیکھا...... رباطہ نے وہاں پڑا پرانا ٹوٹا ہوا شاید ہینگر تھا...... ثمر کو تھمایا۔

گرمی سے ہمارا برا حال تھا بار بار ان ہڈیوں اور غلاظت پر نظر جاتی تھی تو ہماری حالت عجیب ہوکر جی متلانے لگا تھا۔ہماری ٹانگیں ہلکی ہلکی لرز بھی رہی تھیں،ثمر نے کلام الٰہی کا ورد کرتے ہوئے ڈھکن پلٹ دیا......اور پھر ہم تینوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے اندر کی چیز کو تکنے لگے تھے۔اس کے اندر گاڑھا گاڑھا سا لہو بھرا ہوا تھا۔جبکہ اندر ایک عجیب سا چھپکلی نما جانور اس شے کو رغبت سے کھا رہا تھا۔

ہم تینوں خوف زدہ ہوکر کچھ قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اچانک ہی وہ لہو بھرا برتن کچھ اوپر کی طرف اچھلا۔ہماری تو جیسی جان ہی نکل گئی ۔ ہم تینوں جلدی سے پلٹے اور کھڑکی کی طرف لپکے۔اور باہر کی جانب کود کر جلدی جلدی، شہنی کے پاس آئے اور اسے بھی ساتھ لے کر فوراً ہی نیچے بھاگ کھڑے ہوئے ۔ہم سب کی سانس کافی حد تک پھول گئی تھی۔

کچھ دن مزید گزر گئے۔شان وشوکت سے کھڑی ہماری خوبصورت حویلی ہمیں اب بوجھل بوجھل سی، گہری تاریکی میں ڈوبی تھکن زدہ اداس اداس نظر آتی تھی۔

حویلی کے مویشی جو باڑے میں موجود رہتے تھے کافی زیادہ تعداد میں بیمار پڑ گئے تھے۔ اور کچھ پالتو

جانور اچانک ہی مردہ حالت میں پڑے ملے تھے۔

کچھ کے تو سر، گردن بھی غائب تھی۔ یہ کٹے پھٹے پالتو جانور مردہ حالت میں باڑے کے اندر کی جانب مرے پڑے تھے۔ حویلی کے نوکروں اور بڑوں نے مختلف قیاس اور اندازے لگائے مگر اصل حقیقت کو نہ جان سکے۔

بہر حال حویلی میں مزید پراسرار واقعات ہونے لگے۔

اکثر شام کے بعد کسی بڑے یا چھوٹے کو لمبے اور عجیب الخلقت سفید سائے دکھائی دینے لگے اور کبھی رات کے کسی پہر، عجیب سا شور ہونے لگتا جیسے کوئی بڑے زور ،زور سے فرش کی صفائی دھلائی کر رہا ہو۔ اور پھر اس کے بعد ایسا لگتا کہ جیسے کسی کو زبردستی ذبح کیا جا رہا ہو۔ ایک عجیب خوف تھا جو ہر طرف پھیلا ہوا محسوس ہونے لگا تھا رات ہوتے ہی حویلی کے تمام مکین سہم کر رہ جاتے کہ جانے کیا کچھ ہو جائے، بچوں کے لئے تو خاص طور پر سخت آرڈر تھا کہ مغرب کی اذان سے پہلے حویلی کے صحن یا پھر حویلی کے باہر بالکل نہ نکلیں۔

ماسی منی، ہر جمعرات کو کسی مزار پر حاضری دینے جاتی تھی، حویلی میں تو وہ یہی کہہ کر جاتی تھی لیکن جانے وہ کہاں جاتی تھی۔ اس کی حرکتیں پہلے سے زیادہ پراسرار ہونے لگی تھیں۔

ایک رات حویلی کے سارے مکین گہری نیند سوئے ہوئے تھے چاند کی معلوم نہیں چودہ یا شاید پندرہ تاریخ تھی ساری حویلی گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک کچھ شور سا اٹھا، جیسے کوئی کمروں کے آگے بنے کھلے دالان میں بہت سا پانی گرا رہا ہو۔ اس عجیب شور سے مجاہد بھائی (تایا کے سب سے بڑے بیٹے) کی آنکھ کھل گئی وہ بے چین سے ہو کر اپنے کمرے سے باہر آئے وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ دالان مکمل طور پر گیلا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے پانی ڈال کر گیلا کیا ہے۔ اور اس سے بھی حیرت اور جھٹکے کی بات یہ تھی کہ دالان کے ایک جانب رکھے پھولوں والے گملوں کے نزدیک ماسی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں کھرپی تھی۔ جس سے وہ ایک گملے کی مٹی کو کھود کر نجانے کیا کر رہی تھی، وہ مزے سے نئے فرش پر بیٹھی تھی اور اپنے عجیب و غریب کام میں بری طرح مگن تھی۔

مجاہد بھائی پہلے تو اچانک اتنی رات کو یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ لیکن پھر تیز قدموں سے ماسی کے قریب آئے، مجاہد بھائی کو اس وقت ماسی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ماسی کو زور سے آواز دی۔ تو ماسی نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا..... وہ ہڑبڑا سی گئی، مجاہد بھائی نے ماسی سے سوال کیا..... ”آدھی رات کو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

جواباً ماسی ہونقوں کی مانند مجاہد بھائی کو تکنے لگی ..... مجاہد بھائی نے ماسی کو خوب غصے میں کھری کھری سنائی۔ اور کہا کہ ”اب اس حرکت کی باقی خبر وہ صبح سویرے لیں گے۔“

مجاہد بھائی غصے میں یہ سب کہہ کر اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔

حویلی کی وہ صبح واقعی بہت شاندار ثابت ہوئی تھی مجاہد بھائی سمیت حویلی کے تمام بڑوں نے ماسی کی بڑی اچھی طرح خبر لی لیکن ماسی بھی بڑی ہی چالاک چیز تھی۔ پہلے ہی سے مختلف بہانے تیار کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لئے بڑی چھترول سے بچ گئی۔

لیکن ڈانٹ پھٹکار بھی خوب مزے کی پڑی تھی۔

خیر موقع دیکھ کر ہماری ینگ پارٹی نے مجاہد بھائی کو ماسی کے کچھ پراسرار احوال کہہ سنائے اور عقبی صحن میں لے جا کر ماسی پر مزید کچھ روشنی ڈالی۔

مجاہد بھائی گھنڈر زدہ عقبی صحن جو کالے اور پراسرار عامل کے آستانے کی طرح نظر آ رہا تھا..... وہ مزید طیش میں آ گئے۔ وہ واپس پلٹے حویلی کے اندر جا کر سختی سے ماسی سے اس بابت پوچھا۔ پہلے تو ماسی کچھ گھبرا گئی۔ لیکن پھر مکاری اور عیاری سے بولی کہ ”یہ سب تو اس نے حویلی کی بھلائی کے لئے کیا ہے اور یہ نوری علم ہے ایک بزرگ سے کروایا ہے۔“ نجانے اتنی بڑی اور جھوٹی بات ماسی نے کیسے اپنی زبان سے آسانی کے ساتھ کہہ دی اور روتے روتے کہنے لگی۔ ”وہ جس مزار پر جاتی ہے وہاں وہ حاضری لگواتی ہے۔ اور حویلی کے لئے خاص دعا

کرواتی ہے۔“ اور بھی بہت سی جذباتی باتیں کر کے بھدی آواز میں رونے بیٹھ گئی۔

مجاہد بھائی..... عجیب سی کشمکش میں گرفتار تھے کہ وہ گویا اس کی بات پر یقین کریں یا نہ کریں..... مجاہد بھائی جواباً چپ رہے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

ہماری ینگ پارٹی بہت خوش ہو رہی تھی کہ اس بار تو پکا ماسی منی کا پول کھل جائے گا سر عام اس کی تمام تکبر اور غرور سے تنی گردن ضرور جھک جائے گی اور یہ کہ حویلی کے سب بڑے جی بھر کر اس کی چھترول کریں گے۔ لیکن اس مرتبہ بھی وہ اپنی عیاری کی وجہ سے بچ نکلی تھی۔

ہماری بچہ پارٹی سخت افسوس اور افسردہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دل دہلا رہی تھی کہ اب کسی بھی وقت ماسی اپنا بدلہ ہم سے ضرور لے گی۔

ایک دن شام کے وقت ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے خوشگوار ماحول بنا رہے تھے ہم سب حویلی کے دالان میں اکٹھے تھے۔ اور کچھ دیر سے چھوٹے شایان کو تلاش کر رہے تھے۔ ہر جگہ تلاش کر لیا تھا۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر ہم سب دوسری منزل پر تلاش کرنے لگے اچانک ہی شایان کی ہلکی سی چیخ ہم نے سنی وہ اس راہداری سے آ رہی تھی جہاں پر کونے والا اسٹور کمرہ تھا۔

ہم سب چپ چاپ تیزی سے اس کمرے کی طرف لپکے، احمد نے آگے ہو کر دروازہ ہولے سے تھوڑا سا کھولا۔ کمرہ کے باہر تالا نہیں تھا۔ شایان کو ماسی نے سختی سے پکڑا ہوا تھا اور گھسیٹ کر ایک طرف رکھی چوکی پر بیٹھانے کی کوشش میں لگی پڑی تھی۔

احمد نے جھٹ اندر گھس کر شایان کو پکڑا کھلے دروازے کی طرف کیا۔ رباطہ اور میں نے لپک کر شایان کو پکڑ لیا تھا۔ جبکہ ماسی آناً فاناً ہماری مداخلت سے گویا پاگل سی ہو گئی وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح احمد کی طرف لپکی..... ماسی کے بال کھلے ہوئے تھے جبکہ چہرہ کافی بھیانک اور سیاہ معلوم ہو رہا تھا..... ماسی جیسے ہی احمد کو پکڑنے کے لئے آگے آئی..... کہ اچانک اس کا پیر کسی چیز سے الجھ گیا..... بس اس موقع سے فائدہ اٹھا کر احمد نے ماسی کو زوردار دھکا دیا اور جلدی سے باہر آ کر دروازے کی کنڈی لرزتے ہاتھوں سے جلدی سے بند کر دی اور پھر کنڈی میں پڑا ہوا تالا بھی لگا دیا۔ جبکہ اندر سے بڑی بھیانک اور زوردار آواز آئی تھی۔ ماسی شاید..... وہاں پڑی مٹی کی دو ہانڈیوں پر جا گری تھی جس پر شاید وہ کوئی بھیانک عمل کر رہی تھی۔

جب احمد اندر تھا..... تو ہم سب باہر کھڑے خوف سے کانپ رہے تھے۔

شایان ڈر اور خوف سے رو رہا تھا۔ ہم سب وہاں سے شایان کو لے کر ایسے بھاگے جیسے ماسی کسی آدم خور کی طرح دروازہ توڑ کر ہم سب کا خون پی جائے گی لیکن دروازے کی کنڈی میں تالا مضبوطی سے قائم تھا۔

ہم میں سے نیچے آ کر کسی نے بھی کسی بڑے کو کچھ بھی نہیں بتایا ہم سب خوف سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی کچھ بولنے اور کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ سب خاموشی سے بالکل چپ چاپ بیٹھے کانپ رہے تھے۔ شاید اس وقت ہم نے خاموشی اختیار کر کے ٹھیک ہی کیا تھا۔

ساری رات ہم سب کو ڈر کے مارے نیند نہ آئی تھی، کہ اگر ہماری یہ حرکت اگر کسی بڑے کے علم میں آ گئی ،تو ہماری خیر نہ ہوگی۔

ماسی منی کو ہم اس کمرے میں قفل چڑھا کر بند تو کر آئے تھے، لیکن اب خوف سے ہم تھر تھر کانپ بھی رہے تھے..... کہ جانے اب وہ جب بھی باہر آئے گی..... تب ہم سب کا کیا حشر کرے گی..... اور کروائے گی..... لیکن حیرت کی اک بات یہ تھی کہ شام سے ماسی دوسری منزل کے اسٹور کمرے میں بند تھی۔ اور اب رات ہونے کو تھی..... تو اس وقت سے ایک مرتبہ بھی دروازہ بجانے، شور مچانے کی آوازیں یا کسی بھی طرح کی آوازیں بالکل بھی نہ آئی تھیں۔ ہم تو سمجھے رہے تھے کہ آواز اب آئی کہ تب آئی..... لیکن ماسی منی اور شور نہ مچائے..... یہ ناممکن تھا۔

لیکن ہم سب نے قیاس کیا کہ شاید وہ گر کر بے

ہوش ہوگئی ہوگی (لیکن اصل بات تو شاید کچھ اور ہی تھی)

چونکہ ماسی منی سرِشام ہی سونے کی عادی تھی۔ اسی لئے کسی بڑے نے ماسی کی غیر موجودگی پر خاص دھیان نہ دیا تھا۔

رات ہوچکی تھی حویلی کے سب بڑے سوچکے تھے۔

لیکن ہماری پارٹی کے تمام افراد کھلی آنکھوں سے جاگ رہے تھے۔

خوف سے کہ کہیں ”ماسی منی دروازہ توڑکر آ گئی تو......“ بس اگر کسی کو آنکھ لگ بھی جاتی تو خوف سے دوبارہ چونک کر کھل جاتی تھی۔

خیر خوف زدہ رات کے اندھیرے کے بعد آخرکار صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا چونکہ صبح سویرے ماسی منی کچن میں دیگر نوکروں پر حکم چلاتی یا پھر دالان میں بیٹھی ملتی تھی آج چونکہ ماسی کسی بھی جگہ موجود نہ تھی اس لئے ماسی کی غیر موجودگی ظاہر ہوگئی تھی اتنی دیر گزرنے کے بعد یعنی اجالا کافی پھیل چکا تھا۔ حویلی کے سب بڑے کھٹک گئے۔ خیر سب نے مل کر ماسی منی کی تلاش شروع کردی۔

ہماری خفیہ پارٹی نے بھی یہی ظاہر کیا تھا کہ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ سارے لوگ اردگرد پھیل کر حویلی اور حویلی کے باہر بڑی شدومد سے ماسی منی کی تلاش میں مصروف ہوگئے تھے۔

کہ اچانک ہی دوسری منزل سے شور اٹھا ”ماسی منی مل گئی۔“

بس یہ سننا تھا کہ ہماری پارٹی میں موجود ہم سب کا رنگ فوراً اڑ گیا، دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا......

لیکن پھر اچانک ہی حویلی میں پھیلا شور تھم گیا بس دوسری منزل کے زینے سے اترتے بہت سے قدموں کی آوازیں تیزی سے اترنے لگی تھیں۔ لہٰذا ہم سب نے یک دم ہی اس زینہ کی جانب مڑ کر دیکھا تو ہم سب کی آنکھیں سامنے کا منظر دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کیونکہ زینہ پر سے ماسی منی کی بدحال لاش لائی جارہی تھی۔

ہم سب کی سانسیں جو معلوم نہیں کتنی دیر سے رکی ہوئی تھی یک دم سے بحال ہونے لگیں حویلی میں یک دم گھمبیر خاموشی پھیل گئی اور تمام بڑے حیرت کی مورت بنے کھڑے تھے۔ اور ماسی منی کی لاش کو صدمے کی حالت میں یک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ماسی کی لاش کچھ عجیب سی حالت میں تھی۔ بال بکھرے ہوئے چہرہ سیاہ، ہونٹوں پر لہو جما ہوا جبکہ مٹھیوں میں کئی تعویز موجود تھے۔ اس کی لاش سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی، اس کی لاش سب بڑوں پر بہت سے چھپے بھید عیاں کررہی تھی۔

کچھ دیر بعد، اوپری زینے سے مجاہد بھائی، چچا وجاہت اور بڑے ابو اتر کر نیچے آرہے تھے۔

ان تینوں نے شاید دوسری منزل کے اسٹور والے کمرے میں ماسی منی کے ناقابل برداشت کالے کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔ لہٰذا منظر واضح طور پر چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ ”دیکھو کالے جادو کا انجام۔“

ہر شخص کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں، ماسی منی کی ریاکاری اور مکاری سب کے سامنے کھل چکی تھی۔

اگر وہ زندہ حالت میں ہوتی......تو شاید کہ منظر کچھ اور ہی ہوتا......سب بڑوں کی آنکھوں میں ماسی منی کے لئے اب نفرت ہی نفرت تھی جو کہ حد سے زیادہ نظر آرہی تھی۔

خیر وقت پھر آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔

حویلی پر چھائے اندھیرے بادل چھٹ گئے تھے۔ بوجھل اور اداس حویلی میں دوبارہ خوشیاں رقصاں کرنے لگی تھیں ماسی منی کا کالا اور منحوس عمل اس پر ہی پلٹ گیا تھا۔

وہ ایسی زہریلی ناگن ہوگی کسی نے سوچا بھی نہ تھا......لیکن ایک خاص بات تھی جو کہ حویلی کے ہر بڑے نے اکثر سوچی تھی کہ ”آخر ماسی منی کے اسٹور کمرے کے باہر تالا کس نے لگایا تھا؟؟؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ان کو آج تک نہیں ملا ہے۔

بلکہ یہ راز ابھی تک برقرار ہے۔

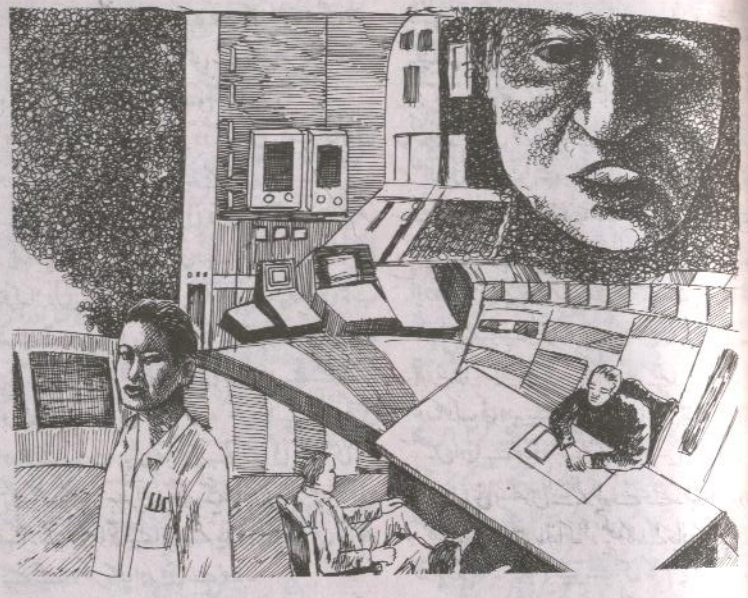

نیوو کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

ایوارڈ

فائزہ رحمٰن۔ سالار اٹک

اچانک کمرے میں ایک اژدھا نمودار ہوا، اس کی پھنکار سے جسم پر لرزا طاری ہوگیا، اور جب اژدھے نے سانس کھینچا تو نوجوان اڑتا ہوا اس کے منہ میں جاگھسا پھر آناً فاناً اژدھا نے نوجوان کو مسلم نگل لیا۔

عجیب و غریب دل دہلاتی خوف وہراس پھیلاتی خونی روشتوں کو پامال کرتی سبق آموز کہانی

سنیل کے ماتا پتا دونوں ایک حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو چونکہ ان کی فیملی میں کوئی نہیں تھا لہٰذا سنیل اپنے چچا کے گھر رہنے لگا، اول دن سے ہی وہ اپنی چچی کو نہ بھایا مگر جیسے تیسے وقت کا دھارا چلتا رہا، گھر میں کوئی بھی چیز ٹوٹ پھوٹ جاتی تو نقصان کا سارا ذمہ دار سنیل ہوتا، چاہے سارے کام ان کے اپنے بچے راہول اور امول کرتے۔ پھر کیا سنیل کی لاتوں اور جوتوں سے خوب درگت بنائی جاتی۔ سنیل سوتا تو ان کے کمرے میں ہی تھا مگر کہاں وہ نرم و گداز بیڈ پر اور سنیل فرش پر چٹائی یا پھر خستہ حال بستر جو کہ حالات کے پیش نظر اسے دے دیا گیا تھا۔

مگر سنیل اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سب کام بڑے اچھے طریقے سے کرتا۔ راہول اور امول سے چھوٹا ہونے کی نسبت انکی پھٹی پرانی کتابیں کاپیاں وہ اپنے

استعمال میں لاتا اور شکر ادا کرتا گھر کے اکثر کام بھی اس کے ذمہ ہوتے لیکن جب اس کے چچا گھر میں موجود ہوتے تو تھوڑا بہت سکون اسے ملتا تھا۔

گرمیوں کی تپتی دوپہر تھی جب راہول اور امول سنیل کا انتظار کیے بغیر ہی گھر آ گئے۔ سنیل اپنے اسکول سے نکلا اور کافی دیر تک انہیں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس کا جوتا جو کہ امول پہلے استعمال کر چکا تھا اپنی خستہ حالی کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹوٹ گیا۔ دوپہر کا وقت گرمی سے پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں جا دبکے تھے زمین لوہے کی طرح تپی ہوئی تھی، سنیل کا پہلے ہی گرمی اور خوف سے برا حال تھا مگر اب تو اس کی رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ جب اس کے ننھے پاؤں نے بغیر جوتوں کے زمین کو چھوا تو جیسے اس کے پاؤں کی جلد جھلس گئی پھر جیسے تیسے وہ گھر پہنچا اور چچی سے بولا۔

''میں بہت مشکل سے گھر پہنچا ہوں اور جوتا بھی ٹوٹ گیا۔'' مگر چچی تو پہلے سے ہی بپھری کھڑی تھیں۔ ''کہاں تھے تم، راہول اور امول کافی دیر تک تمہارا انتظار کرتے رہے؟''

مگر حقیقت تو صرف وہی جانتا تھا یا پھر راہول اور امول کیونکہ گرمی کی وجہ سے وہ چھٹی ہوتے ہی گھر روانہ ہو گئے بغیر یہ سوچے کہ اس ننھی جان راہول کا کیا ہوگا۔

سنیل نے منہ دھویا اور کمرے کی طرف جانے لگا مگر دروازہ بند تھا امول اور راہول سو چکے تھے اور باقی لوگ بھی اپنے اپنے کمروں مین چلے گئے تو اس نے اپنے لئے کوئی جگہ تلاش کی، وہ اسٹور روم میں گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ ''ماتا کہاں ہیں آپ، کیوں چھوڑ گئیں مجھے۔'' اس کی ہچکی بندھ گئی اور نہ جانے کب اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شام کے وقت گھر میں کہرام مچا ہوا تھا کیونکہ سنیل کے متعلق اس کے چچا اپنی پتنی اور بچوں سے پوچھ رہے تھے، آخر سنیل کی آنکھ کھلی اور وہ باہر آیا۔ ''کیا ہوا چچا؟''

''کچھ نہیں بیٹا! ادھر آؤ تم اسٹور میں کیوں.....؟'' اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتے ''ان کی پتنی نے اسے سنانی شروع کر دیں۔ مفت کا مال ہے آئے دن جوتا توڑ دیتا ہے۔ اسکول سے اتنی دیر بعد نکلتا ہے، بچے انتظار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور ویسے بھی پڑھ کر کرے گا کیا، میرے بچوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسے کسی کام پر لگا دو، کوئی کام سیکھ لے گا تو زندگی گزارے گا۔'' سنیل خاموش کھڑا سن رہا تھا اور بھوک کی وجہ سے بار بار اس کی آنکھیں دھندلا جاتی تھیں اور اسے لگتا وہ اب گر پڑے گا۔

چچا نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا جو رکنے نہ پا رہا تھا۔ ''چچا آپ مجھے کسی کام پر لگا دیں۔ میں دوسروں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔''

چچا اس معصوم کا لہجہ برداشت نہ کر پائے۔ ''نہیں بیٹا ایسا نہ بولو، میری دعا ہے کہ تم بھگوان کی کرپا سے پڑھ لکھ کر آفیسر بنو گے اور دنیا تم پر رشک کرے گی جاؤ اور کھانا کھاؤ، مجھے لگ رہا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔'' انہوں نے اپنی پتنی اور بچوں کو سمجھایا۔ ''آئندہ مجھے ایسی کوئی بات سننے کو نہ ملے کس چیز کی کمی ہے تم لوگوں کو۔''

مگر ان کے سامنے تو سب لوگ خاموش ہو گئے مگر صبح اسکول جانے کی بجائے سنیل کو کام پر جانا تھا اور یہ اس کی چچی کا فیصلہ تھا۔

دن بھر وہ ٹریفک کے اشارے پر رکنے والی گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا اور شام ہونے سے پہلے گھر لوٹ آتا۔

دن گزرتے گئے اور زرلٹ کا دن آ پہنچا راہول اور امول اپنے ہاتھوں میں رزلٹ کارڈ لئے اپنے پتا کا انتظار کر رہے تھے نمبر جیسے بھی تھے مگر وہ پاس ہو گئے تھے رات کے کھانے پر سب موجود تھے مگر سنیل نہ تھا دونوں

کے رزلٹ کارڈ دیکھنے کے بعد پتا نے سنیل کو آواز دی۔ ''سنیل بیٹا تمہارا رزلٹ کارڈ کہاں ہے؟'' سنیل نڈھال قدموں سے آیا مگر اس کے قدم وہیں جم گئے جب چچا نے اس کے رزلٹ کارڈ کا پوچھا۔ سنیل نگاہیں فرش پر جمائے کھڑا رہا۔ ''سنیل بولو کیا ہوا؟'' جواباً سنیل نے وہ کپڑا اور برش ان کے آگے کر دیا جن سے وہ گاڑیوں کے شیشے چمکاتا اور اجرت میں ملنے والے روپے چچی کے حوالے کر دیتا۔ اب بھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں چچا جان گئے کہ حقیقت کیا ہے انہوں نے تڑپ کر سنیل کو گلے لگا لیا۔ ''معاف کرنا بیٹے! میں شرمندہ ہوں تم سے۔''

اب تو گاڑیوں کے شیشے صاف کرنا اس کا معمول بن گیا کئی لوگ اس سے پوچھتے۔ ''تم پڑھتے کیوں نہیں؟'' اس طرح کے سوالات کئے جاتے مگر جواباً وہ ایک مسکراہٹ ان کے نذر کر دیتا۔ ''صاحب! سب لوگ پڑھنے لگ جائیں تو کام کون کرے گا۔''

ایک دن ایک چمکتی دمکتی لینڈ کروزر شان سے چلتی آ رہی تھی اور سنیل تیار ہو گیا کیونکہ ایسے لوگ اجرت زیادہ دیتے تھے وہ اس کی طرف لپکا مگر وہ رکنے کی بجائے سنیل کو ایک زبردست ٹکر مارتی ہوئی آگے نکل گئی۔ سنیل سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے ایک بیڈ پر تھا سامنے ہی ایک نرس، ڈاکٹر اور شاید وہ شخصیت جو اسے یہاں لائی وہ موجود تھی مگر وہ پہچان نہ سکا۔

نرس آگے بڑھی۔ ''ہارون صاحب بچے کو ہوش آ گیا ہے۔''

ہارون صاحب وہی تھے جن کی لینڈ کروزر سے سنیل ٹکرایا تھا۔ ''بیٹا کیا نام ہے آپ کا؟''

''سنیل، میرے ماتا پتا مجھے اکیلا چھوڑ کر دنیا سے جا چکے ہیں اور کوئی بھی نہیں ہے میرا، وہ تو راہو اور امول کا گھر ہے۔ میرا نہیں ہے۔'' سنیل نے سسکنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر آگے بڑھا۔ ''بچے کی حالت ٹھیک نہیں اس کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کریں، آپ لوگ مزید کسی قسم کی کوئی گفتگو نہ کریں۔''

رات گئے تک جب سنیل گھر نہ لوٹا تو اس کے چچا اپنی پتنی کے منع کرنے کے باوجود گھر سے نکل پڑے مگر سنیل ہوتا تو ملتا سڑک پر ٹریفک بھی اس وقت برائے نام ہی تھی۔ بے بس ہو کر وہ گھر چل پڑے نیند کوسوں دور تھی۔ ''بھگوان کیا ہوگا میں اپنے بھائی کی اولاد کی حفاظت نہ کر سکا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگا؟''

''سنیل مکمل طور پر ہوش میں آ چکا تھا اور اس نے ایک ایک لفظ ہارون صاحب کو بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں جائے گا۔ چاہے فٹ پاتھ پر ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔''

ہارون صاحب آگے بڑھے۔ ''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے، اللہ بہت رحیم و کریم ہے، وہ آپ پر رحم کرے گا۔''

''انکل، یہ اللہ کون ہے؟''

ہارون صاحب نے نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بیٹا اللہ نے ہر چیز پیدا کی ہے۔ اور سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے اب تم بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔؟ میرے ساتھ رہو گے یا اپنے چچا کے گھر؟''

سنیل سوچ میں پڑ گیا۔ ''صاحب جی! آپ بھی مجھ سے کام کروائیں گے یا پڑھائیں گے۔''

''نہیں بیٹا! تم پڑھو گے اور اچھے انسان بنو گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' سنیل بولا۔

سنیل کے چچا رمیش صبح ہوتے ہی گھر سے نکلے اور کئی لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر اسپتال تک پہنچ گئے۔

''سنیل بیٹا کیا ہوا تمہیں؟'' سنیل خاموش نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا تو ہارون صاحب بولے۔ ''رمیش صاحب سنیل نے مجھے آپ کے متعلق

بتایا ہے دراصل انجانے میں سنیل گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔"

سنیل کافی دیر تک ان سے لپٹا رہا، آخر وہی تو تھے اس کے اپنے۔

رمیش نے ہارون کا شکریہ ادا کیا اور سنیل کو گھر جانے کا کہنے لگے ہارون صاحب خاموش کھڑے تھے وہ کر بھی کیا سکتے تھے مگر سنیل نے جانے سے انکار کر دیا "چچا یہ بابو جی کہتے ہیں اگر میں ان کے ساتھ رہا تو میں پڑھ لکھ کر اچھا اور بڑا آدمی بن جاؤں گا اور مجھے کام پر بھی نہیں بھیجیں گے۔" سنیل آنسو بہاتے ہوئے بولا۔

چچا کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ "ٹھیک کہا بیٹا! وہ گھر تو تمہارے قابل بھی نہ تھا، بھگوان نے تو تمہارے لئے کہیں اچھا انتظام کر دیا ہے۔" پھر وہ ہارون صاحب سے گویا ہوئے۔

"کیا سنیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔؟"

"ہاں رمیش صاحب میں اس بچے کو حالات کی چکی میں پستے ہوئے نہیں دیکھ سکتا میں کوشش کروں گا کہ اس کی خواہش کی تکمیل ہو اللہ تعالیٰ بہت بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب! میں سنیل سے ملنے آتا رہوں گا آپ اپنے گھر کا پتہ بتا دیجیے۔"

ہارون صاحب کے گھر سنیل خوش تھا جیسے اسے اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم خوابوں کی تعبیر مل گئی ہو۔

ہارون صاحب بہت بڑے تاجر تھے۔ محل نما گھر اللہ کا دیا سب کچھ تھا، بس ایک ہی بیٹی تھی جو کہ اپنے گھر کی ہو چکی تھی، اتنی دولت نے بھی انہیں مغرور نہ بنایا تھا خدا ترس اور دل میں دوسروں کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے انسان تھے۔

سنیل شہر کے ایک اچھے اسکول میں جانے لگا تھا۔

دن گزرتے گئے اور سنیل اول نمبر لے کر ہر جماعت پاس ہوتا گیا اب سنیل کو اعلیٰ پڑھائی کے لئے کسی بڑے کالج جانا تھا ہارون صاحب نے اس کے لئے ہاسٹل میں کمرہ لے دیا تھا، جہاں سنیل نے رہنا تھا۔ "بیٹا وہاں اس روم میں تمہارا ایک اور روم میٹ بھی ہوگا۔ محب نام ہے، اچھا ہے اور شریف گھرانے کا، بالکل تمہارے جیسا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابو۔"

ہارون صاحب نے ہی سنیل کو کہا تھا کہ وہ انہیں ابو کہا کرے کئی عرصہ ہوا سنیل کے چچا رمیش نے آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ بھی مجبور تھے۔۔

صبح سنیل کو جانا تھا رات گئے تک وہ بے مقصد لان میں بیٹھا رہا، دل بوجھل سا ہو رہا تھا اس کا دل کر رہا تھا کہ کسی سے لپٹ کر روئے مگر کون تھا سوائے اس ہستی کہ جو اس کی محسن بھی تھی نگہبان بھی۔ دل کا رشتہ بھی اور شاید روح کا بھی۔ مگر وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا وہ ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس نے عجیب سا نظارہ دیکھا ہارون صحب زمین پر سر ٹیکے رو رہے تھے۔

وہ بھاگ کر ان کے پاس گیا۔ "ابو آپ رو رہے ہیں ابو انھیں کیا ہوا۔"

"نہیں بیٹا رو نہیں رہا، اپنے رب کے سامنے شکر گزاری کر رہا ہوں، مجھے اتنا اچھا بیٹا عطا کر دیا۔"

"ابو آپ سچ میں مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔"

"میں اکثر اللہ کے بارے میں سوچتا ہوں یہ بھی سوچتا ہوں کہ آپ کی طرح میں بھی نماز پڑھوں۔ مگر میرے ماتا پتا تو ایسا نہ کرتے تھے پھر میں کیوں کروں، بس یہی سوچ کر رک جاتا ہوں۔"

"بیٹا! اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے تو کوئی وسیلہ بنا دیتا ہے۔ آگے تمہاری مرضی، میں زبردستی نہیں کروں گا مگر التجا ضرور کروں گا اپنے اصل کو پہچانو، اللہ نے تمہارا وسیلہ بنا دیا ہے۔"

سنیل دیر تک بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح تیاری مکمل کرنے کے بعد وہ ہارون صاحب کے پاس آ گیا ابو آئیں۔"

"سنیل میں تمہارا کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"ابو آپ میرے ساتھ چلیں پھر واپس آ جایئے گا۔"

"نہیں بیٹا! میں نہیں جاؤں گا! اب تم بڑے ہو گئے، اب میری انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"

سنیل ہاسٹل کے کمرے میں پہنچا تو ایک معصوم اور خوبرو نوجوان جو تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا اس کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ "آیئے سنیل صاحب۔"

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ محب ہیں۔"

"جی جناب۔" اپنے نام کی طرح دوسروں سے پیار کرنے والا ہوں، بعد میں پتہ چلے گا آزما کر دیکھ لیجیے گا سنیل صاحب۔"

"ارے ہم کن تکلفات میں پڑ گئے، جب دوستی ہی کرنی ہے تو آپ جناب سے کیا۔" اور دونوں آپس میں گھل مل گئے۔

دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ سنیل یہاں بھی اپنی ذہانت سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا کالج اور پھر یونیورسٹی میں مقبول تر ہوتا چلا گیا۔ محب کئی بار اس کے ساتھ گیا اور وہ بھی کئی بار محب کے گاؤں جا چکا تھا۔

CSS کرنے کے بعد دونوں ہی بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔

سنیل کی طرف کئی لڑکوں لڑکیوں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ سنیل بھی جانچ پڑتال کر کے اپنے جیسے ذہین اور قابل اعتماد ساتھیوں سے دوستی کر چکا تھا۔ ایک رات وہ اپنے دوستوں سے Chatting کرنے میں محو تھا، اسے اپنا موبائل بجنے کا احساس تک نہ ہوا جب وہ اٹھا اور سونے سے پہلے اپنے موبائل کو چیک کرنے کے لئے اٹھایا تو وہاں ہارون صاحب کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"سنیل بیٹا کہیں دیر نہ کر دینا۔" سنیل کے تو ہوش اڑ گئے کیونکہ ان کا ایسا لہجہ اسے کبھی یاد نہ تھا۔ وہ روتے بھی تھے تسلی بھی دیتے، دعا بھی کرتے مگر اتنا افسردہ لہجہ۔ فوراً اس نے نمبر ڈائل کیا مگر جواب موصول نہ ہوا۔

صبح ہی صبح سنیل نے Packing کی اور گھر روانہ ہو گیا اور پھر وہ گھر پہنچ گیا۔ "ابو، ابو کہاں ہیں آپ۔" مگر کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ان کے کمرے تک گیا، ہارون صاحب کمرے میں بے سدھ پڑے تھے۔ انہیں کچھ دن پہلے ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا مگر سنیل کو نہ بتایا کہ پریشان ہوگا۔

"ابو۔ آپ۔" اس کی آواز حلق میں دب گئی۔ "کیا بات ہے ابو کیا ہوا آپ کو اور مجھے بتایا تک نہیں، آپ عظیم ہیں۔" سنیل ان کے پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں لئے کافی دیر تک روتا رہا۔

کافی دیر بعد ہارون صاحب کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں بتا کر تمہیں پریشان کروں، بیٹا! اس ملک کو ضرورت ہے تم جیسے لوگوں کی اور تمہارا وقت کتنا قیمتی ہے، اس کا اندازہ ہے مجھے۔"

"مگر ابو آپ سے بڑھ کر کچھ بھی قیمتی نہیں ہے۔"

"بس بیٹا اس وطن کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ کرنا۔"

"جی! مگر اب آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔"

کئی دن رہنے کے بعد سنیل ہاسٹل آ گیا اب ہارون صاحب کی طبیعت ٹھیک تھی۔

ایک صبح جب وہ دونوں اپنی ڈیوٹی پر پہنچے تو سنیل اور محب کو ایک علاقے کا سروے کرنے کو کہا گیا۔ اس جگہ سے قیمتی نوادرات کے علاوہ دیگر معلومات کا ثبوت ملا تھا۔ جو کہ حکومت اور وطن کے لئے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔

سنیل خوش تھا کہ اس کے دوست کو ہی اس کے ساتھ جانے کی پیشکش کی گئی تھی۔ ادھر محب کی حالت بھی قابل دید تھی۔

اس کے ساتھ انہیں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ

وہاں کچھ لوگوں نے زبردستی اپنا تسلط جمایا ہوا ہے اور ہر ناجائز کام کرنا اور وطن کو نقصان پہچانا ان کا کام ہے۔ لہٰذا انہیں بھی اپنے انجام تک پہنچانا ہے۔

"راستہ نہ معلوم ہونے سے سنیل اور محب دونوں ہچکچائے مگر نقشہ پاس تھا وہ نکل پڑے۔ دن بھر سفر کرتے رہے اور رات کا نہ جانے کتنا حصہ بیت چکا تھا ان کی گاڑی کا انجن گرگراہٹ کے ساتھ رک گیا۔

"ارے یہ کیا ہوگیا، نزدیک کوئی آبادی بھی نہیں۔"

دونوں نیچے اترے اور گاڑی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

ان کا خیال تھا کہ وہ شام تک وہاں پہنچ جائیں گے اور رہائش اور خوراک کا بندوبست بھی کرلیں گے مگر اب تقریباً رات کا ایک بجنے کو تھا اور گاڑی تھی کہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

تھک ہار کر وہ بے مقصد ادھر ادھر گھومنے لگے۔ "محب تمہیں وحشت نہیں ہوتی ایسی جگہوں سے۔"

"ہاں ہوتی تو ہے مگر اب نہیں ہو رہی۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔"

"تم سناؤ تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔"

"محب میری وحشتوں کے دن ختم ہوگئے۔ میں نے اتنی اذیت اور اتنی تکلیف برداشت کی ہے کہ اب مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

"اچھا۔ بڑے تیس مار خان بن رہے ہو۔"

محب اس کی زندگی کے ایک ایک پل سے واقف تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا اور سنیل بھی مجال ہے جو کوئی بات چھپائے مگر اس وقت وہ کچھ چھپا رہا تھا شاید اپنا ڈر چھپانے کی ناکام کوشش۔

رات کے اس پر تاحد نگاہ گھنا جنگل اور گھپ اندھیرا ان کے دل میں کئی طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے مگر وہ ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے۔

وہ پناہ لینے کی خاطر چلتے چلتے کافی دور نکل گئے مگر بے سود تھک ہار کر وہ واپس پلٹنے لگے تو سنیل کے قدم رک گئے۔ "محب یار دائیں طرف دیکھو اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کوئی عمارت ہے بوسیدہ ہی سہی مگر رات گزاری جاسکتی ہے ورنہ جنگلی جانور ہماری تکہ بوٹی سے دعوت اڑا سکتے ہیں۔" سنیل بولا۔

"ہاں چلو دیکھتے ہیں۔" محب بولا۔

وہ ایک پرانی کھنڈر نما حویلی تھی مگر ایک کمرہ باہر سے مقفل تھا اور دروازہ بھی کافی مضبوط تھا۔ "چلو اس دروازے کو کھولتے ہیں رات پرسکون طریقے سے گزاری جاسکتی ہے۔" یہ محب کا مشورہ تھا دروازہ کھولنے میں وہ دونوں لگ گئے مگر تالا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ "چلو کوئی بھاری پتھر یا کوئی اور ایسی چیز تلاش کرتے ہیں جس سے تالا توڑا جاسکے۔"

جلد ہی انہیں مطلوبہ چیز مل گئی اب باری باری وہ تالے پر ضربیں لگا رہے تھے۔

اچانک تالا کھل کر ان کے پاؤں میں گرا اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ کمرے سے عجیب سی غراہٹوں اور چیخوں کی آواز آنے لگی۔ "یہ کیا ہوگیا محب بھاگ یہاں سے۔" دونوں بھاگنے والے تھے کہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"ڈرو نہیں محسن ہو میرے، میں کئی سالوں سے انتظار کر رہا تھا کہ کوئی آئے اور مجھے اس قید سے آزاد کرائے، آج تم لوگوں نے مجھے آزاد کر کے اس قید سے نجات دی ہے، گھبراؤ نہیں اندر آجاؤ۔"

دونوں ہچکچاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئے اندر کا منظر باقی حویلی سے جدا تھا۔

خوبصورت سجا ہوا کمرہ ہلکی نیلی روشنی میں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ "گھبراؤ نہیں میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" کھانا کہاں سے آیا یہ سوچے بغیر دونوں نے ڈٹ کر کھایا اور اس نادیدہ شخص سے پوچھا تو آواز سنائی دی۔

"میں ایک سادھو تھا۔ مگر ایک ظالم نے مجھے قید کردیا۔"

"مگر کیوں؟" دونوں نے بیک وقت کہا۔

"یہ لمبی کہانی ہے اب تم لوگ آرام کرو۔"

"دونوں شدید تھکے ہوئے تھے سو مزے سے لمبی تان کر سو گئے صبح سورج کی کرنوں نے ان کا استقبال کیا تو جاگے۔"

"محب وہ سادھو کہاں ہے؟ یار کچھ کھانے کو مل جائے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔" سنیل بولا تو محب اٹھ کر دروازہ کھولنے لگا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ "سنیل دروازہ باہر سے لاک ہے۔"

"مگر کیوں؟ کہیں ہمیں قید تو نہیں کردیا گیا؟" سنیل بولا۔

اب وہ سادھو کا انتظار کئے بغیر کر بھی کیا سکتے تھے۔ اور انہوں نے آج دن کو ساری معلومات اپنے ادارے کو بھیجنی تھی تاکہ کھدائی والے کارکن بھیجے جاسکیں اور اب وہ یہاں بیٹھے کچھ بھی نہ کرسکتے تھے۔

دن کافی چڑھ گیا تو دروازہ کھٹاک کی آواز سے کھلا، اب سادھو اپنی اصلیت میں آگیا تھا۔ دونوں نے ایک آواز میں کہا۔ "ہمیں قید کیوں کیا گیا ہے؟"

سادھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ایک مقصد کے لئے۔"

"کیسا مقصد؟"

"مجھے جس نے قید کیا تھا اسے مار دو کیونکہ کافی عرصہ قید میں رہتے ہوئے میری طاقتیں کمزور پڑ گئی ہیں تم لوگ بس یہ کام کردو اور پھر تم آزاد ہو، ورنہ پہلے میں اس کمرے میں قید تھا اور اب تم لوگ قید رہو گے اس سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں اس کی دیواروں پر طلسم ہے، تم لوگ باہر نکلنے کے خواب کے علاوہ کچھ بھی نہ کرپاؤ گے۔"

"ہرگز ہم کسی کو نہیں مار سکتے تمہیں جو کرنا ہے کرلو۔" سنیل طیش سے بولا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی سوچ لو! میں اتنا جلد باز نہیں ہوں! میں پھر آؤں گا۔" سادھو نے کہا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔"

فرشتے ہنستے ہیں

دو موقع پر اللہ کے فرشتے ہنستے ہیں۔

1- جب بے پردہ عورت کو "کفن" دیا جائے تو فرشتے ہیں کہ جب پردے کی ضرورت تھی تو اس وقت کیا نہیں اب پردہ کیسا۔

2- جب بے نمازی کا جنازہ پڑھا جائے تو فرشتے کہتے ہیں ساری زندگی نماز کے قریب نہیں آیا اب کیسی "نماز"

(دانش- کراچی)

محب نے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کیا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ "اللہ تو قادر ہے تو قدرت رکھتا ہے اس مصیبت سے نکال دے، اللہ تو نے ایک قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے ہم بے بس ہو چکے ہیں ہماری مدد فرما۔"

محب کی آنکھیں اشکبار تھیں، وہ رو رو کر خدا سے مدد مانگ رہا تھا۔ جبکہ سنیل کی آنکھیں بھی نمدار ہو چکی تھیں اور وہ خاموش بیٹھا محب کو دیکھے جا رہا تھا۔

محب نے اللہ کا نام لے کر دروازے کو جھٹکے دینا شروع کئے مگر دروازے پر طلسم ہونے کی وجہ سے ہر بار محب ایک گیند کی مانند پیچھے اچھل جاتا۔ سنیل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بھوک پیاس سے ان کا برا حال تھا وہ دونوں لیٹ گئے۔

سنیل کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی، محب نے اسے تسلی دی۔ "ایسے کیوں روتے ہو دیکھنا کوئی وسیلہ ضرور بنے گا، مجھے اپنے اللہ پر مکمل بھروسہ ہے ناامیدی گناہ ہے۔"

"محب مجھے موت سے ڈر نہیں لگ رہا، بس اپنی

زندگی کے گزرے پل رلا رہے ہیں۔'' کیسے میری پرورش ہوئی ہارون صاحب فرشتہ بن کر میری زندگی میں آئے اور اب یہ بے بسی۔

تمہیں اپنے اللہ پر کتنا بھروسہ ہے اور میں بدقسمت ہوں کہ میں تو ابھی اس ذات کو پہچان بھی نہ سکا جو کہ مجھے تاریک دنوں سے نکال کر روشنی میں لایا۔ ہمت دی۔ عزت دی۔ ہمدردوں کا ساتھ دلایا، میری تاریک زندگی میں اجالا بھر دیا۔ اعلیٰ مقام دیا۔''

اچانک ان کے کمرے کو شدید جھٹکے لگنے لگے اور وہ ایسے ہلنے لگا جیسے ابھی زمین بوس ہو جائے گا اور کانوں کو پھاڑ دینے والی چیخ و پکار جیسے ہزاروں لوگ مل کر چیخ رہے ہوں ایک کونے سے ایک بہت بڑا اژدھا نمودار ہوا اور ان کے گرد دائرے میں پھرنے لگا اور پلک جھپکتے ہی اس نے سنیل کو نگل لیا۔

محبّ کا حیرت اور پریشانی سے برا حال تھا، وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ ''اوہ میرے خدا یہ سب کیا ہے اس مشکل وقت میں ہماری مدد فرما۔''

مگر قدرت کو شاید ابھی اور امتحان مقصود تھا۔ سادھو اندر آیا اور آتے ہی غراتے ہوئے محبّ کو پکڑ کر دیوار کی طرف اچھال دیا۔

محبّ درد سے کراہنے لگا کم بخت تیرے ایسے ہی کاموں سے تجھے قید کیا گیا ہوگا اور یقیناً وہ قید کرنے والی ہستی بہت ہی عظیم ہوگی، میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر کسی دوسرے کو مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، اور مجھے موقع ملا تو میں تجھے ضرور مار دوں گا۔''

سادھو نے قہقہہ لگایا! ''اب تو اپنی فکر کر میرے ایک اشارے سے تیری تکہ بوٹی ہو سکتی ہے مگر نہیں! تو مانے گا میری بات ضرور مانے گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اژدھا اور سادھو غائب ہو گئے محبّ نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔

اور بس ایک ہی آرزو تھی اس کے لبوں پر کلمہ اللہ تعالیٰ سنیل سنیل کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا، بے شک وہ دین اسلام کا ماننے والا نہیں مگر اس کی نیت میں کھوٹ نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ دل سے ایمان لانا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے موقع دے کہ وہ تیرے نام کا کلمہ پڑھ لے۔'' اس کے ساتھ ہی محبّ تاریک وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

ادھر ہارون صاحب کے پاس شیشے کی ایک بوتل میں سرخ رنگ کا مادہ تھا جس کا رنگ اچانک سیاہ ہو گیا۔ ہارون صاحب کسی گہری سوچ میں تھے اس مادے کا رنگ سیاہ ہو جانے کا مطلب وہ خوب جانتے تھے انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا اور کچھ ضروری سامان لینے کے بعد انہوں نے پہاڑی علاقے کا رخ کیا ان کی منزل شاہ پور تھی۔

شاہ پور کی مین سڑک پر گاڑی روکی اس سے آگے انہیں پیدل جانا تھا دل کا مریض ہونے کی وجہ سے ان کا پہاڑی علاقہ کا پیدل سفر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا مگر اپنی پرواہ کئے بغیر وہ چلتے گئے کیونکہ یہاں صرف ان کی اپنی زندگی کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف انسانیت خطرے میں تھی۔

وہ شاہ صاحب کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ ایک نظر اس بوتل پر ڈالی اور اندر داخل ہو گئے شاہ صاحب تلاوت میں مصروف تھے۔ انہوں نے نظر اٹھائی اور ہارون سے گویا ہوئے۔ ''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ وہ سادھو آزاد ہو چکا ہے اور وہ تمہیں مارنے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ خود تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن وہ کسی اور کی مدد لینے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے چلو۔''

حویلی میں ہارون صاحب اور شاہ صاحب داخل ہوئے وہ اس طلسم والے کمرے میں داخل ہوئے۔

ایک نوجوان بے ہوش پڑا تھا اس کے سر سے نکلنے والا خون اس کے ہونٹوں پر جم چکا تھا۔ ہارون صاحب بھاگ کر اس کے پاس گئے اسے سیدھا کیا اور حیرت سے بولے۔ ''محبّ بیٹا اٹھو اور سنیل کہاں ہے؟''

مگر یہ ساری باتیں محبّ کب سنتا وہ تو بے ہوش تھا۔ شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو محبّ ہوش میں آنے لگا پانی کی بوتل شاہ صاحب نے محبّ کے منہ سے لگائی اور تھوڑی دیر میں محبّ کی حالت سنبھلنے لگی۔

آنکھوں کے سامنے ہارون صاحب کا چہرہ پاتے ہی محبّ ان سے لپٹ گیا۔ ''انکل سنیل کو وہ.....''

''بولو بیٹا کیا ہوا اور تم لوگ کیسے یہاں پہنچے، کہاں ہے سنیل؟''

''انکل۔ سنیل کو ایک اژدھا جو کہ سادھو کے ساتھ تھا۔''

اس کے ساتھ ہی محبّ زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ ''بتاؤ کیا ہوا سنیل کو؟''

''اژدھا نے نگل لیا ہے۔'' اتنے میں شاہ صاحب کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگیں۔ ''گھبراؤ نہیں تم لوگوں نے بہت بڑی آفت کو آزاد کر دیا ہے تھوڑا وقت لگے گا اسے قابو کرنے میں۔''

''اور ہاں نکل! یہ سب اس نے اس لئے کیا کہ وہ کسی کو مروانا چاہتا تھا اور ہم نے انکار کر دیا اور انکل آپ کو کیسے پتہ چلا۔''

''بیٹا یہ باتیں اس وقت مناسب نہیں مگر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ تم لوگ یہاں ہو۔''

اچانک ایک دم سے کمرہ لرزنے لگا، سادھو اور اژدھا نمودار ہوئے مگر شاہ جی اور ہارون صاحب کو دیکھتے ہی سادھو کے اوسان خطا ہو گئے۔ ''رک جا.....''

یہ شاہ صاحب کے الفاظ تھے۔ مگر سادھو فرار ہو گیا مگر اژدھا بپھرا ہوا ادھر سے ادھر پھنکار رہا تھا، شاہ صاحب نے بوتل میں سے تھوڑا سا سیاہ مادہ اس کی طرف اچھال دیا۔ جس سے اژدھا بے جان ہو گیا وہ جادوئی اژدھا تھا بے جان ہوتے ہی راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ اور راکھ کے ڈھیر پر اب سنیل پڑا تھا۔

سنیل محبّ اس کی طرف بڑھا سنیل مکمل طور پر اب ہوش میں تھا وہ بھی محبّ اور ہارون صاحب کی طرف لپکا۔

''ابو آپ کیسے ہیں؟ محبّ تم کیسے ہو؟''

ہم ٹھیک ہیں تم بتاؤ ٹھیک تو ہو نا؟''

''ہاں.....اب میں بالکل ٹھیک ہوں یہ کون؟''

ہارون صاحب نے شاہ صاحب کے متعلق بتایا۔ سنیل روتے ہوئے شاہ صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''شاہ صاب مجھے کلمہ پڑھا دیں، اب میں اس ہستی سے دور نہیں رہنا چاہتا جو بار بار مجھے نئی زندگی دیتی ہے۔''

اور محبّ پتہ ہے وہ اژدھا تمہیں نگلنا چاہتا تھا مگر جیسے ہی آگے بڑھتا تمہارے آس پاس روشنی کا ہالہ نمودار ہوتا جس سے وہ ٹکر کھا کر واپس پلٹ جاتا۔

مجھے اس وقت یقین ہو گیا وہ ایمان کا نور تھا کاش! میں پہلے ہی.....'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''بیٹا یہ تو خوشی کی بات ہے، رونا کیسا ہر چیز کا وقت مقرر ہے، اللہ کا شکر ہے جس نے تمہیں ہدایت کا راستہ دکھایا آج سے تمہارا نام ابراہیم ہے۔'' شاہ صاحب نے سنیل کو کلمہ پڑھایا اور اس کا نیا نام رکھا۔

''اب تم لوگ اپنی منزل کی طرف جاؤ۔ وطن تمہیں پکار رہا ہے جاؤ، اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

ایک بار پھر سے وہ اپنی منزل کی طرف گامزن تھے اس علاقے میں وہ داخل ہو چکے تھے اپنے تمام جدید آلات ان کے پاس تھے اور وہ مطمئن طریقے سے ہر جگہ کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

شام تک تقریباً ان کی تلاش کا سلسلہ جاری رہا ہیڈ کوارٹر میں مسلسل فون کی بیل بج رہی تھی۔ ''یس سر ہم لوگوں نے تمام علاقے کا مکمل سروے کیا ہے۔ وہاں وہ سب موجود ہے جس کی توقع تھی آج باقی کارکن بھجوا دیں تاکہ کام شروع کیا جائے، فی الحال تو کسی نے مزاحمت نہیں کی۔''

''او کے مگر اتنے لیٹ کیوں ہو گئے آپ لوگ؟

فرض شناس آفیسر ہونے کے ناطے دیر نہیں لگانی چاہئے تھی آپ لوگوں کو۔" پوچھا گیا۔

"یس سر! مگر حالات پر کنٹرول میں دیر ہوگئی۔"

"اوکے! مجھے یقین ہے جو کچھ کیا ہوگا آپ نے ٹھیک ہی کیا ہوگا Take Care" کہا گیا۔

رات دو بجے تقریباً 30 کے قریب عملہ پہنچ گیا جن میں 15 مسلح لوگ اور 15 مزدور کھدائی والے کارکن تھے۔ صبح ہوتے ہی کام شروع کر دیا گیا۔

پہلے دن کوئی قابل ذکر چیز نہ مل سکی دوسرے دن صبح کام شروع ہونے سے چند گھنٹے بعد ایک طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی فائر کی آوازیں قریب ہوتی چلی آرہی تھیں ابراہیم (سنیل) نے مزدوروں کو کھدائی جاری رکھنے کو کہا۔

ان کے سامنے ایک بدمعاش قسم کا انسان اور پیچھے تقریباً دس لوگ تھے جو کہ مقامی لگ رہے تھے "یہ علاقہ جابر خان کا ہے۔ اس میں آپ لوگ کھدائی رکوادیں۔" محب اس سے بات کرنے کو آگے بڑھا۔

"ہم حکومت کے لوگ ہیں اس کھدائی سے ہمارا اپنا کوئی مقصد نہیں اور ہاں اس سے ملک کا مستقبل سنور سکتا ہے اور کیا چاہئے۔"

"ہمیں کیا فائدہ حکومت کونسا ہمیں دے گی، اس ملک نے ہمیں کیا دیا ہے۔؟"

"ایسا نہیں کہتے بھائی اگر صلح صفائی سے آپ ہمیں کام کرنے دیں تو حکومت کسی کا حق نہیں رکھے گی یقیناً آپ لوگوں کا تعاون ملک وقوم اور خود آپ کے اپنے لئے فائدہ مند ہوگا لیکن آپ لوگوں نے کوئی مزاحمت کی تو ہم آرڈر پر عمل کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔" محب بولا۔

یہ سن کر وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مگران کے ارادے خطرناک ہی لگ رہے تھے۔

محب نے ابراہیم سے کہا۔" جاؤ اور تم خود جابر خان سے ملو اور چیک کرو کہ وہ کس قسم کا انسان ہے اور کیا اس کے علاوہ بھی کوئی غیر قانونی کام کرتا ہے۔"

ابراہیم دو مسلح نوجوانوں کو ساتھ لے کر نکل گیا مقامی لوگوں سے جابر خان کے متعلق پوچھا گیا مگر کوئی بھی حقیقت بتانے کو تیار نہ تھا۔ وہ لوگ ڈرے اور سہمے ہوئے انداز میں بات کرتے تھے۔ نجانے کس خوف نے ان کی زبانوں کو تالے لگا رکھے تھے۔

اس گاؤں میں رحیم گل ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے بچپن میں ہی اس کے والدین اپنے جان پہچان والوں کے پاس پڑھنے کے لئے چھوڑ آئے تھے ورنہ یہاں تو پڑھائی کا نام لینا تک پاپ تھا۔

ابراہیم لوگوں کی طرف سے بے بس ہوگیا تھا کوئی بھی جابر خان کی اصلیت بتانے کو تیار نہ تھا اور اسے ثبوت چاہئے تھا رحیم گل ان دنوں گاؤں آیا ہوا تھا اور اپنی بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھولے کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔

سامنے سے دو مسلح اور ایک سول آفیسر گزرتے گزرتے اس کی بیٹھک کے سامنے رک گئے۔ "پانی مل سکتا ہے۔"

رحیم گل نے نگاہ اٹھائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

بیٹھانے کے بعد پانی لینے چلا گیا۔ پانی پینے کے بعد ابراہیم نے اس کا نام پوچھا اور جابر خان کے متعلق بھی۔" اور ہاں رحیم گل یہ بھی بتاؤ کہ لوگ کیوں جابر خان کے متعلق کوئی بات نہیں کرتے کیوں ڈرتے ہیں؟"

"صاحب غریب لوگ ہیں۔ جب تک جابر خان کا حکم مانیں گے دو وقت کی روٹی ملتی رہے گی زمینیں ساری اسی کی ہیں۔ وہاں لوگ کام کرتے ہیں۔ نوکری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، گاؤں میں کوئی اسکول نہیں اور اگر ہو تب بھی بچوں کو اسکول بھجوانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور تو اور صاحب اس ظالم نے علاقے میں مسجد تک بنوانے سے منع کیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ لوگ اس کی زمینوں پر کام

کرتے ہیں اور مسجد بنوانے کی وجہ سے وہ وقت کا ضائع کریں گے اور پھر اس کے بعد روز وقت ضائع کرنے مسجد میں جائیں گے۔"

"سنا ہے اسلحہ اور بارود کا استعمال بھی کرتا ہے۔"

"جی صاحب کئی بے گناہوں کو قتل کر چکا ہے۔ اس کے تہہ خانے میں جدید قسم کا اسلحہ بھی موجود ہے۔"

"قتل کیوں کروائے اس نے؟"

"صاحب جب بھی کوئی اس کی بات پر ہاں نہیں کرتا یا حکومت کے جو لوگ بھی اس طرف آتے ہیں ان کا یہاں سے زندہ جانا ممکن نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے رحیم، تم بہادر نوجوان ہو تمہارے علاوہ تو سب اسی کے گن گا رہے ہیں۔"

"نہیں صاحب! وہ لوگ مجبور ہیں حقیقت میں وہ بھی اس سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔"

"اللہ حافظ۔" ابراہیم نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر واپس آ گیا۔

جابر خان کی حویلی میں ابراہیم داخل ہوا تو اس کے اپنے گارڈز اپنی بندوقوں کے سائے میں اسے جابر خان کے پاس لے گئے اور جابر خان نے غصے سے ابراہیم کو دیکھا۔

"تم نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی میرے کارندے جو بات کر آئے تھے وہی کافی تھی ہمیں نہیں مطلب ملک وقوم سے۔ چلے جاؤ اسی میں عافیت ہے ورنہ صرف بچھتاوا رہ جائے گا۔"

ابراہیم نے تحمل سے اس کی باتیں سنیں۔" تو ٹھیک ہے ہم اپنا کام کر کے ہی جائیں گے اگر آپ تعاون کریں گے تو ٹھیک ورنہ آپ کے خلاف ایکشن کے ورانٹ ہیں ہمارے پاس۔"

"میں نہیں مانتا کسی حکومت کو یا ان کے وارنٹ کو بلکہ تم لوگوں کو آخری بار جانے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

ابراہیم واپس آیا تو کچھ مایوس تھا۔ محب کے پوچھنے پر اس نے ساری روداد اسے سنا ڈالی۔" پریشان ہونے سے کام نہیں ہوگا۔ جو ہوگا سو ہوگا Dont Worry محب بولا۔ اگلے دن جابر خان کے بندوں نے مسلح اور مزدوروں پر فائر کھول دیا جواباً مسلح آدمیوں نے بھی بھرپور دفاع کیا۔

محب نے ادارے کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا اور مزید قانون نافذ کرنے والوں کو بھیجنے کی درخواست بھی کی۔

جابر خان کے چند آدمی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے اور باقی فرار ہوگئے۔ جس کا جابر خان نے زبردست نوٹس لیا۔ اس کی حالت ایک زخمی شیر کی سی ہو رہی تھی۔ آرمی کے چند جوان اور ایک کیپٹن جابر کے سامنے موجود تھے۔" ہمیں آپ کی حویلی کی تلاشی لینی ہے۔"

کیوں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔" اس نے گارڈز کو مخصوص اشارہ دیا اس کے ساتھ ہی گارڈز نے فائر کھول دیا، آرمی کا ایک جوان شہید ہوگیا اور کیپٹن نے انہیں بھی فائر کھولنے کو کہا۔

آناً فاناً تمام گارڈز ڈھیر ہوگئے اور جابر خان حویلی کی خفیہ سرنگوں میں روپوش ہوگیا۔

کیپٹن اور باقی جوانوں کو بھرپور تلاشی کا موقع مل گیا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ تہہ خانوں تک پہنچا کیسے جائے مگر پھر اللہ کا نام لے کر وہ آگے بڑھنے لگے۔

کیپٹن ہر جگہ کا بغور جائزہ لے رہا تھا ایک کمرے میں پہنچ کر وہ رک گیا اور فرش کے ساتھ کان لگا کر زمین پر اپنا ہاتھ زور زور سے مارنے لگا۔ نیچے خلا تھا۔

کیونکہ آواز سے اس نے معلوم کر لیا تھا۔ اس کمرے کے نیچے تہہ خانہ ہے مگر راستہ کہاں ہے؟

وہ ہر چیز کو بغور چیک کرتے رہے مگر راستہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا کیپٹن شدید تھکن کی وجہ سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر کرسی پر بیٹھتے ہی اسے شدید جھٹکا لگا اور کرسی کسی لفٹ کی مانند نیچے بڑھنے لگی، باقی سب لوگ بھی

حیران کھڑے تھے کرسی تہہ خانے میں جا کر رکی، کیپٹن سمجھ گیا یہی راستہ ہے تہہ خانے میں آنے کا۔ تہہ خانے میں ہر قسم کا اسلحہ بارود اور مشین گنیں تھیں اس نے تہہ خانے کی چند تصاویر لیں اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

کرسی دوبارہ اپنی جگہ آ کر فٹ ہوگئی تو کیپٹن اترا اور واپس چل دیا۔

غیر قانونی طور پر اسلحہ رکھنے اور کئی لوگوں کو قتل کرنے کے جرم میں حکومت نے جابر خان کو گرفتار کرنے کے وارنٹ جاری کئے تھے۔ جن کا ثبوت مل چکا تھا۔

کھدائی مکمل ہوگئی جابر کان کا تسلط ختم ہوگیا اور جابر خان کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا مگر اس ظالم کے لئے یہ سزا بھی کم تھی کیونکہ بے شمار معصوم جانوں کا خون کیا تھا کئی لوگوں کے گھروں کے چراغ گل کئے تھے اس نے۔ جابر اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا وہ پاگل ہوگیا تھا قدرت نے اس سے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی چھین لی تھی مگر آخری سوال جو سب کے ذہن میں تھا کہ آخر اتنا سارا اسلحہ یہ حاصل کیسے کرتا تھا تحقیق شروع ہوگئی۔

آخر کار وہ گھناؤنے چہرے بھی بے نقاب ہوگئے، حکومت کے اپنے ہی لوگ تھے جو جابر خان کو سپورٹ کرتے تھے راہول اور امول جو کہ سنیل (ابراہیم) کے چچازاد تھے انہوں نے اپنے عہدوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور جابر خان کی مدد کرتے رہے ان کو عہدوں سے برطرف کر دیا گیا۔

جیل کی سلاخوں کو پکڑے ایک بوڑھی عورت رو رہی تھی، ابراہیم وہاں سے گزرا اسے اس عورت پر ترس آ رہا تھا۔ ''ماں جی کون ہیں آپ اٹھیں یہاں سے۔''

مگر وہ عورت اٹھنے کے قابل نہ تھی ابراہیم نے اسے سہارا دیا اور دور کہیں اپنے ماضی میں گم ہوگیا۔ وہ عورت اس کی چچی تھی رمیش چچا کی پتنی۔

شاید اس کے حساب کا وقت آ گیا تھا۔ ''شکر یہ بیٹا! کیا تم میرے راہول اور امول کو رہا کروا سکتے ہو؟ تم جو کوئی بھی ہو مجھے اچھے لگے ہو۔''

''ماں جی میں جو کوئی نہیں بلکہ آپ کا بیٹا سنیل (لیکن اب ابراہیم ہوں) ان کا جرم قابل معافی نہیں، انہوں نے ملک کو دھوکا دیا ہے ملک کی جڑیں کھوکھلی کی ہیں۔'' عورت کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں ''معاف کرنا بیٹا اگر میں اس قابل ہوں تو۔''

کئی دن بعد اسٹیج پر Best کارکردگی کا ایوارڈ دیا جا رہا تھا، محبت کی دونوں ٹانگیں مقابلے میں ناکارہ ہو چکی تھیں ابراہیم کو بچاتے ہوئے ایوارڈ کے لئے ابراہیم اور محبت کا نام اکٹھا پکارا گیا۔ ابراہیم محبت کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا اسٹیج پر آیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ابراہیم نے آتے ہی مائیک ہاتھ میں لیا اور ہارون صاحب کا نام پکارا۔

ہارون صاحب چھڑی کے سہارے اسٹیج پر پہنچے اور ابراہیم کو گلے لگا لیا۔ ''میرا ایوارڈ ہارون صاحب جو کہ میرے ابو ہیں، انہیں دینے کی درخواست کرتا ہوں۔''

مگر ہارون صاحب کی متلاشی نظریں نجانے کسے تلاش کر رہی تھیں، دور ہال کی کھڑکی میں شاہ صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے، دراصل شاہ صاحب قوم جنات میں سے تھے، اب صرف اور صرف ہارون صاحب ہی انہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ مسکرا دیئے۔

محبت کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور ابراہیم نے آگے بڑھ کر اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اس کے ڈھلکتے آنسو اپنی انگلیوں میں جذب کر لئے، ابراہیم کے ذہن میں بار بار محبت کا جملہ آ رہا تھا۔

''میرا نام محبت ہے، نام کی طرح محبت کرتا ہوں آزما کر دیکھ لینا۔''

''واقعی محبت تم نے سچ کر دکھایا۔'' یہ جملہ ابراہیم کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔

ہنی مون

عمران قریشی۔کوئٹہ

دونوں روحیں جوش اشتعال میں شیشے کے کمرے میں داخل ہوگئیں اور طالب فوراً خفیہ دروازے سے باہر نکلے اور وہ روحیں شیشے کے گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقید ہوگئیں، سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود بھی وہ روحیں آج بھی چیختی چلاتی ہیں

عشق و محبت کی ایک داستان حیرت جسے پڑھ کر اہل دل محو حیرت میں پڑ جائیں گے

وہ دن ان دونوں کے لئے دوہری خوشی کا دن تھا۔ ایک طرف کرسمس جبکہ دوسری جانب ان کا ہنی مون..... وہ آج صبح ہی پکاؤلی ٹاؤن آئے تھے۔ یہاں ہنری بونٹے کا خوب صورت لکڑی کا گھر تھا۔ گھر پکاؤلی ٹاؤن کے قصبے سے کچھ ہٹ کر قدرتی مناظر کے درمیان واقع تھا۔ گھر کے سامنے قدرتی جھیل تھی۔ سب سے شاندار بات یہ تھی کہ چھت پر سن روم موجود تھا۔ جہاں گملے موجود تھے۔ لیکن پودے نامناسب دیکھ بھال کی بدولت مرجھا چکے تھے۔

ہنری بونٹے کو باغبانی کا بے حد شوق تھا۔ وہ اپنا فارغ وقت شوق کی تکمیل میں گزارتا تھا۔ بہرحال ان کی شادی محبت کی شادی تھی۔ اور ہنی مون کے لئے انہوں نے پکاؤلی ٹاؤن کا انتخاب کیا تھا۔ صبح ہی سے موسم کے تیور خراب تھے۔ کالے سیاہ بادل اور تیز ہواؤں کی بدولت باہر نکلنا ناگزیر تھا۔ اس لئے نہا دھو کر ہنری بونٹے اور ماریا نے شادی کا سوٹ زیب

تن کیا اور ہال کمرے میں آ بیٹھے۔

برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہال کمرے کی کھڑکی میں سے سفید گالوں کی مانند برف گرتی بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ ہنری آتش دان کو رواں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ماریا سحر زدہ نگاہوں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ نجانے کیوں اس نے بے اختیار ہو کر کھڑکی کو کھول دیا۔ تیز ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا اور بھڑکتا ہوا روشن دان ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ بجھ گیا۔ ہنری نے گردن گھما کر ماریا کی جانب دیکھا۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑکی میں کھڑی باہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔

ہنری نے آواز دی۔ "ماریا پلیز! کھڑکی کو بند کر دو۔ ورنہ آتش دان روشن نہیں ہو سکے گا۔" لیکن ماریا نے پرواہ نہیں کی۔ ہنری اٹھ کر ماریا کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا۔ وہ ٹکٹکی باندھے جھیل کے سرد پانی کو گھور رہی تھی۔

ماریا کیا ہوا؟ تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ ہنری نے اسے کاندھوں سے تھامتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ تو وہ کرنٹ کی مانند تڑپ کر پیچھے مڑی اور ہنری کے ساتھ بری طرح لپٹ گئی۔ پھر ہراساں لہجے میں بولی۔

"ہنری سامنے جھیل میں پانی کے اوپر ایک آدمی چل رہا تھا۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اور اس کے سر پر چمکتا ہوا رنگ بھی تھا۔ جیسا روحوں کے سر پر ہوتا ہے، ہنری نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر کھڑکی کو بند کر دیا۔ پھر نرم گرم آواز میں مخاطب ہوا۔ "یہ تمہارا وہم ہے۔ بھلا کوئی آدمی کیونکر پانی پر چل سکتا ہے۔ ہاں اگر ایسا کوئی کر سکتا ہے تو صرف سانتا کلاز کر سکتا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے۔ سانتا کلاز سرخ سفید رنگ کے لباس میں ملبوس ہوتا ہے اور سر پر چمکتے ہوئے رنگ کے بجائے سرخ اونی ٹوپی پہنتا ہے۔"

"ہنری تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔" لیکن یقین کرو۔ میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ پانی پر ایسے چل رہا تھا۔ جیسے پانی پر نہیں بلکہ پختہ زمین پر چل رہا ہو۔" ہنری نے اسے کاندھے سے تھامتے ہوئے صوفے پر بیٹھایا۔ اور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"ڈیئر میں تمہاری بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں۔ لیکن تم خود سوچ سکتی ہو۔ بھلا ایسا کیسے ممکن ہے۔ تم صوفے پر بیٹھی رہو۔ میں تمہارے لئے وہسکی کا گلاس لاتا ہوں۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔" وہ آتش دان کے ساتھ موجود شراب کی الماری کی جانب چل دیا۔ جس میں دنیا جہان کی شراب کی بوتلیں چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس کے اٹھتے قدم اچانک ہی رک گئے۔ آتش دان کی جانب مڑنے سے پہلے اس کی نگاہ سرسری طور پر کھڑکی پر پڑی وہاں سانتا کلاز کا چہرہ موجود تھا۔ ہنری نے جھٹکے کے ساتھ دوبارہ کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ اب بھی موجود تھا۔ اور دونوں ہاتھوں کا ہالہ بنائے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

باہر دور کہیں بادل گرجے اور ساتھ ہی جھٹکے کے ساتھ کمرے میں جلتا ہوا بلب بند ہو گیا۔ ماریا چیختی ہوئی نشست سے اٹھ کر ہنری کے ساتھ لپٹ گئی۔ ہنری نے حتی الوسع اپنے لہجے کو پرسکون بنانے کی کوششیں کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"ماریا ڈیئر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی موم بتی روشن کرتا ہوں۔"

اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی۔ ماریا کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپنے لگا۔ ہنری اس اثناء میں لائٹر کو آن کر چکا تھا۔ لائٹر کی کانپتی ہوئی زرد روشنی میں کھڑکی خالی دکھائی دی۔ دستک ایک دفعہ پھر سنائی دی۔

"اس وقت باہر کون ہو سکتا ہے؟ ماریا موم بتی روشن کرو۔ میں باہر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں..... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں..... یہاں مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔" ماریا نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں موم بتی جلاتا ہوں۔" ہنری بولا۔ اور الماری کی جانب چل دیا۔ کچھ دیر بعد کمرہ موم بتی کی ملگجی روشنی سے منور تھا۔ دستک کا سلسلہ جاری تھا ہنری دروازے کی جانب چل دیا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازے کے پاس

پہنچ کر پوچھا۔

"دروازہ کھولو..... میں سانتا کلاز تم سے ہمکلام ہوں۔" باہر سے نرم آواز سنائی دی۔ اور ہنری نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی ہال کمرہ گھنٹی کی ٹن ٹن کی آواز سے گونج اٹھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی کمرہ "میری پیپی کرسمس" کی آواز سے گونجنے لگا۔ وہ دونوں افراد سانتا کلاز کے مخصوص لباس میں ملبوس تھے۔ ان کی کمر تحائف سے لدے تھیلے کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہمیں اندر آنے کو نہیں کہو گے۔" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کیوں نہیں..... معاف کرنا میں گھبراہٹ میں بھول گیا۔ تم دونوں اندر آ سکتے ہو۔" ہنری نے ایک جانب ہوتے ہوئے شرمسار لہجے میں کہا۔ اور دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ صوفوں پر بیٹھنے سے پہلے انہوں نے کاندھے پر لدے ہوئے تھیلے ایک جانب رکھ دیئے۔ اور ان میں سے ایک آہستگی کے ساتھ ہمکلام ہوا۔

"میرا نام برکلے ہے۔ اور میرے ساتھی کا نام اتھل ہے۔ ہم پکاؤلی ٹاؤن سے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج کرسمس کے ساتھ آپ کا ہنی مون بھی ہے۔ یقین جانیے جناب ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم بے اختیار ہو کر آپ کے گھر چلے آئے تا کہ اس دوہری خوشی کی آپ کو مبارکباد پیش کر سکیں۔ اور ساتھ میں کچھ تحائف بھی....."

"میں آپ کی اس اپنائیت پر دلی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن آپ نے بلاوجہ تکلیف کی..... اس سردی میں اور موسم کے تیور کے باعث ٹاؤن سے باہر نکلنا بہت تکلیف دہ ثابت ہوا ہوگا۔ ماریا ڈیئر تم مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے کچن میں جا سکتی ہو۔"

ماریا جو اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر کی جانب چل دی۔

اتھل بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب..... ہم پچھلے سال کے کرسمس کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب سیمرو اور زولفیہ نے خودکشی کی تھی۔"

"سیمرو اور زولفیہ کون ہیں؟" ہنری نے پوچھا۔

"آپ دونوں کی طرح دو پیار کرنے والے تھے۔ ان کی قبریں جھیل کے پاس قبرستان میں موجود ہیں۔ آج انہیں مرے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ لیکن دلخراش حادثے بھلائے نہیں بھولتے۔"

ہنری نے پوچھا۔ "ان دونوں کا تمہارے ساتھ کیا رشتہ تھا۔ معاف کرنا میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ رہا ہوں..... کیونکہ میری اور ماریا کی شادی بھی محبت کی شادی ہے۔"

"ہوں....." اتھل ہنکارہ بھرتے ہوئے بولا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب..... آپ پوچھ سکتے ہیں..... اور ہم بتانا بھی چاہتے ہیں۔ اسی نیت سے تو یہاں آئے ہیں۔"

ماریا ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں کافی کے کپ موجود تھے۔ اس نے ایک ایک کپ سب کے سامنے رکھ دیئے۔ اور خاموشی کے ساتھ ہنری کے پاس آ بیٹھی۔

"میں سیمرو کا باپ ہوں اور یہ زولفیہ کا....." وہ ہمکلام تھا۔

"جناب مجھے بے حد افسوس ہوا یہ جان کر..... کہ یہ دلخراش حادثہ آپ دونوں کی اولاد کے ساتھ پیش آیا....." ہنری کے چہرے پر واقعی افسوس کے تاثرات نمایاں تھے۔

"لیکن ہمیں افسوس نہیں ہے۔" برکلے بولا۔ "ان دونوں کے ساتھ ایسا ہونا ہی تھا۔ ماں باپ کا اولاد پر زیادہ حق ہوتا ہے۔ اگر ہم نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا تھا تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"معاف کیجئے گا جناب....." ہنری نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ "کیا آپ ہمیں تمام واقعہ شروع سے سنانا پسند کریں گے۔ ایسے تو تشنگی مزید بڑھتی چلی جائے گی۔"

"کیوں نہیں جناب..... میرے خیال میں م

میں واقعہ سناتا ہوں اور یہ کچھ زیادہ بڑا بھی نہیں ہے۔" اجتھل بولا۔ ماریا اور ہنری ہمہ تن گوش ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

"پچھلے سال نومبر کی بات ہے۔ وہ دونوں یعنی سیمرو اور ذولفیہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کی محبت کے بارے میں تمام پکاؤلی ٹاؤن اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر کوئی نہیں جانتا تھا تو وہ میں اور برکلے تھے۔ ہمیں ان کی محبت کے بارے میں ان دونوں ہی سے معلوم ہوا تھا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ میری اور برکلے کی پکاؤلی ٹاؤن میں ہارڈ ویئر کی دکان ہے۔ چونکہ ہماری دکانیں آمنے سامنے ہیں اس لئے مخالفت بھی پائی جاتی تھی اور ہے..... بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور ہیں....." ہنری پریشان نگاہوں کے ساتھ برکلے کی جانب دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں تھے۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ایک ہی کام کرتے ہوئے ایسا ہوتا ہے۔ کاروبار میں چالاکی اور ہوشیاری کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہی بات اکثر اوقات دشمنی کا باعث بنتی ہے۔ جب مجھے میرے بیٹے سیمرو نے اپنی محبت کے متعلق بتایا۔ اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ ذولفیہ میرے حریف برکلے کی بیٹی ہے۔ تو میں نے حتمی طور پر انکار کردیا۔ لیکن محبت اس منہ زور گھوڑے کا نام ہے۔ جسے لگام نہیں باندھی جاسکتی۔ سو ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ملنا جلنا ترک نہیں کیا اور اسی ملنے جلنے کی بدولت ان کی محبت کے بیج میں سے ایک پودا پھوٹنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ ظاہر ہے بعد میں اس پودے نے تناور درخت بننا تھا۔ ہم دونوں ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اور خاص طور پر میں....." برکلے نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔

اس دوران کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ "ذولفیہ میری بیٹی تھی۔ اور میرے لئے یہ بات ہتک آمیز تھی کہ وہ بغیر شادی کے ماں بنے..... وہ بھی میرے حریف اجتھل کے بیٹے کی۔ میں نے اسے بہت مارا پیٹا..... لیکن وہ محبت میں مکمل دیوانی ہوچکی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے بات نہیں مانی اور ٹاؤن سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ میں ان کے ارادے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ اس لئے تیار تھا۔ پچھلے دسمبر بروز کرسمس میں نے انہیں جھیل کے پاس بارہ بجے رات میں گھیرا۔ اور ذولفیہ کو اپنے ساتھ واپس ٹاؤن چلنے کے لئے مجبور کرنے لگا۔ وہ ایسا کرنے سے منکر ہورہی تھی۔ اس لئے مجبوراً میں نے ہوائی فائر کردیا۔ دونوں نے گھبرا کر چٹان سے نیچے جھیل میں چھلانگ لگادی۔

دوسرے دن ان دونوں کی لاشوں کو شیرف منکاف کی زیرنگرانی جھیل سے باہر نکالا گیا اور جھیل کے پاس موجود قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ ہماری دشمنی ازل سے ابد تک چلتی رہتی۔ لیکن بچوں کے مرنے کے بعد ہم نے اس تمام کئے دھرے کا قصوروار محبت کو ٹھہرایا۔ ہمیں محبت سے نفرت ہوگئی۔ اسی محبت کی بدولت ہمیں اپنی نافرمان اولاد سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یوں اس کہانی کا اختتام ہوا۔

لیکن ایک دوسری کہانی کا آغاز ہوگیا۔ جس کا اختتام کبھی نہیں ہوگا۔" برکلے خاموش ہوگیا۔ ہنری اور ماریا سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھے جارہے تھے۔

اجتھل بولا۔ "ہم محبت کو پنپتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے شروع ہی میں اسے تباہ و برباد کردیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ٹاؤن میں ایسا ہی کیا۔ جو بھی نوجوان جوڑا ہمیں اس حرکت میں مبتلا دکھائی دیا۔ ہم نے اسے گردن دبا کر مار ڈالا۔ لیکن آپ دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہمارے انتقام سے وقتی طور پر بچ گئے ہیں کیونکہ آج کرسمس کی رات ہے اور اس وقت ہم گناہ نہیں کرتے۔ لیکن کل کی رات کرسمس کی رات نہیں ہوگی۔ ہم بھی آزاد ہوں گے اور آپ بھی....." بات کرتے کرتے اجتھل کا لہجہ اچانک ہی سرد ہوگیا۔ اور پھر دونوں جھٹکے کے ساتھ صوفوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہنری ہکلاتے ہوئے بولا۔ "جناب مجھے اس حادثے کے متعلق جان کر بے حد افسوس محسوس ہورہا ہے۔ آپ یقین جانیے۔ میں کل ہی جھیل کے ساتھ موجود قبرستان کا رخ کروں گا اور سیمرو ذولفیہ کے لئے دعا کروں گا۔ بلکہ ان کی قبروں پر پھول بھی چڑھاؤں گا۔"

"ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔ ان کی ملی جلی آوازوں نے ماحول کو عجیب سی پراسراریت سے ہمکنار کردیا تھا۔

"یہ کچھ تحائف ہیں۔" اجتھل نے تھیلے کے اندر سے تھری پیس سوٹ باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ میری جانب سے قبول کیجئے۔"

ہنری نے پریشان نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوٹ تھام لیا۔

"اور یہ میری جانب سے....." برکلے نے بھی تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اور سفید رنگ کا ایک خوب صورت فراک نکال کر ماریا کی جانب بڑھادیا۔ ماریا نے بھی ہنری کی جانب دیکھتے ہوئے سوٹ تھام لیا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو کل ملاقات ہوگی۔" دونوں نے دوبارہ یک زبان ہوکر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ باہر برف باری کا سلسلہ مسلسل جاری و ساری تھا۔ ان دونوں کا رخ جھیل کے ساتھ موجود قبرستان کی جانب تھا۔ ہنری نے گھبرا کر دروازے کو بند کردیا اور ماریا کا ہاتھ تھامے ہال کمرے کی جانب چلا آیا۔

ماریا پوچھ رہی تھی۔ "ہنری بھلا یہ کیسے تحائف ہیں؟ کرسمس پر ایسے تحائف تو کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیئے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ڈیئر.....؟"

"یہ شادی پر..... پہننے والے لباس ہیں۔ بھلا غیر معمولی بات کیوں ہوسکتی ہے۔"

"شادی کے لحاظ سے یہ موزوں ہے۔" ہنری نے صرف اپنی بیوی کو دلاسہ دینے کے لئے کہا۔ حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ "شادی کا یہی لباس مرنے کے بعد مردوں کو بھی پہنایا جاتا ہے۔" اجتھل اور برکلے کی باتوں میں دھمکی نمایاں تھی۔ جسے ہنری اچھی طرح جان گیا تھا۔ کیونکہ وہ اور ماریا محبت کرنے کی بھول کر چکے تھے۔ اور محبت سے ان دونوں کو نفرت تھی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی ہنری نے قبرستان کا رخ کیا۔ وہاں سیمرو اور ذولفیہ کی قبریں موجود تھیں۔ لیکن اکیلی نہیں تھیں بلکہ ساتھ میں دو قبریں اور بھی تھیں۔ جن کے کتبوں پر برکلے اور اجتھل کے نام موجود تھے۔ اسے اپنے جسم میں سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ کرسمس کی رات برکلے اور اجتھل کی روحوں سے ملاقات کرچکا تھا۔

الٹے قدموں اس نے ٹاؤن کا رخ کیا۔ اور چرچ کے پادری جون کو تمام حالات کے متعلق بتایا۔ جواباً جون نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

"گزشتہ کرسمس کی رات برکلے ساڑھے بارہ بجے میگ بار میں داخل ہوا۔ اور پے در پے دس بارہ جام شراب کے انڈیلنے کے بعد بار میں موجود لوگوں سے ہمکلام ہوا۔ کہ اس نے اپنی لڑکی اور اجتھل کے لڑکے سیمرو کو قتل کردیا ہے۔ اور اب وہ اجتھل کو قتل کرنے جارہا ہے تاکہ اس کا انتقام مکمل ہوسکے۔ بار میں موجود لوگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نشے میں بدمست سانڈ کی مانند طاقتور ہوچکا تھا۔ اس نے بار میں کچھ توڑ پھوڑ کی۔ اور اجتھل کے گھر کا رخ کیا۔ بار کے مالک میگ نے شیرف منکاف کو فون کیا۔ شریف منکاف جب اجتھل کے گھر پہنچا۔ تب تمام گھر زبردست فائرنگ کی آواز سے گونج رہا تھا۔ اس نے فوراً ہال کمرے کا رخ کیا۔ تب اکٹھی دو گولیاں اسے اپنے جسم میں برداشت کرنی پڑیں۔ اندر کا ماحول خون آلود تھا۔

اجتھل صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔ اس کے جسم سے خون بہہ کر تمام کمرے کے فرش کو سرخ کررہا تھا۔ برکلے ریوالور ہاتھ میں لئے بدمست ہاتھی کی مانند توڑ پھوڑ کرنے میں مصروف تھا۔ شیرف منکاف کی اگلی دو گولیوں نے اس بدمست ہاتھی کو جہنم رسید کردیا۔ لیکن اگلے دو گھنٹوں کے دوران شیرف بھی جان دے بیٹھا۔ اور یوں پانچ انسانوں کی موت کے بعد یہ کہانی ختم ہوگئی۔

لیکن اب جو کہانی تم سنا رہے ہو اس کہانی کا آغاز تین مہینے پہلے ستمبر میں ہوا۔ جب انیتا اور فریڈ کی ناگہانی موت کی بدولت تمام قصبہ افواہوں کی لپیٹ میں آگیا۔ ان کے ماں باپ کا کہنا یہ تھا کہ موت سے پہلے ان کے کمرے میں سے تین انسانوں کے لڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن کمرے کا دروازہ توڑنے پر صرف انیتا اور فریڈ کی

لاش دستیاب ہوسکی۔ بعد میں یہ سلسلہ چل نکلا۔

محبت کرنے والے جوڑوں کی موت عام ہوگئی۔ تفتیش کرنے کے باوجود قاتل نہ پکڑا گیا۔ اور پکڑا بھی کیسے جاتا، قاتل تو مر چکا تھا۔" پادری جون خاموش ہوگیا۔

ہنری کا خوف کے مارے یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں..... وہ پادری سے ہمکلام ہوا۔ تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"جناب ٹاؤن سے شہر جانے والی ٹرین کا ٹائم کیا ہے؟"

"میرے بچے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن تمہیں شہر جانے کے لئے کچھ دن مزید انتظار کرنا ہوگا۔ کیونکہ برف باری کی بدولت شہر جانے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ جب تک نہیں کھلتے تب تک تمہیں ٹاؤن میں رہنا ہوگا۔ یہ صلیب اپنے گلے میں ڈال لو۔ تمہیں روحوں کے شر سے بچانے میں مدد دے گی۔" پادری جون نے اپنے گلے میں سے صلیب اتار کر ہنری کو تھماتے ہوئے کہا۔ اور میری مزید ایک بات یاد رکھنا۔ ارواح شیشے کے پار نہیں جاسکتی۔ اس لئے کوشش کرنا اس جنگ میں شیشے کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرنا۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

ہنری پریشان حال گھر کی جانب چل دیا۔ ماریا ہال کمرے میں پریشان مورتی کی مانند ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔ ہنری نے اسے دلاسہ دیا۔ اور حالات کی سنگینی کو اس سے پوشیدہ رکھا۔ لیکن اب ماریا واپس شہر جانے کے لئے بضد تھی۔ ہنری اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ راستے بند ہونے کی بدولت وہ دونوں ٹاؤن میں قید ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس نے ماریا سے وعدہ کیا کہ کل صبح وہ واپسی کا ٹکٹ کرواڈالے گا۔ یوں ماریا مطمئن ہوگئی۔

رات پونے بارہ بجے کا وقت تھا۔ نیندان دونوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آنے والے وقت کی پلاننگ..... لیکن موجودہ مسئلے سے انحراف..... آنکھیں بند کرلینے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔

ٹن ٹن ٹن..... وال کلاک رات کے بارہ بجے کا اعلان کرنے لگا۔ ساتھ ہی تیز ہوا کے جھونکے کی مانند وہ دونوں حال کمرے میں وارد ہوئے۔

"جناب ہماری شادی بے شک محبت کی شادی ہے۔" ہنری چابی بھرے کھلونے کی مانند بس بولنے لگا۔ "لیکن اس شادی میں ہمارے والدین کی مکمل رضا مندی شامل تھی۔"

"ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہارے والدین کی رضامندی تھی یا نہیں..... بات محبت کی شادی کی ہے۔ اور ہمیں اس سے اختلاف ہے۔" اعتھل سرد لہجے میں بولا۔

"جہاں مخالفت ہوتی ہے۔ وہاں طرف دار بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔"

ایک تیسری آواز سنائی دی۔ چاروں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ پتلی مونچھوں اور خوب صورت شخصیت کا مالک نوجوان..... پولیس کی وردی میں ملبوس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آہا..... شیرف مٹکاف تم آگئے۔ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔" برکلے ہنکارہ بھرتے ہوئے بولا۔

"مخالف اور طرف دار دونوں کمرے میں موجود ہیں۔ تو پھر ہمیشہ کی طرح فیصلہ ہوجائے۔" برکلے بولا اور تینوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ تینوں روحوں کا یوں لڑنا دل کو ہلا دینے کے مترادف تھا۔ وہ دونوں آنکھیں بند کئے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ہنری سوچ رہا تھا۔ پادری جون کا دیا ہوا صلیب کا نشان فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکا۔ تینوں روحیں صلیب کے نشان کے باوجود کمرے میں موجود تھیں۔ اچانک اس کے دماغ میں پادری کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔

"ارواح شیشے کے پار نہیں جاسکتیں۔ اس لئے کوشش کرنا اس جنگ میں شیشے کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرنا۔" اس کی آنکھیں جھٹکے کے ساتھ کھل گئیں۔

کمرے میں ارواح کی جنگ بدستور جاری تھی۔ ہنری نے ماریا کا ہاتھ تھاما۔ اور چھت کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ چھت پر سن روم اندھیرے میں ڈوبا سنسان دکھائی

دے رہا تھا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ شیشے کا دروازہ کھولا۔ اور اپنے آپ کو شیشے کے کمرے میں کیموفلاج کرلیا۔ پندرہ منٹ کا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ دونوں ہوا کے جھونکے کی مانند چھت پر نمودار ہوئے۔ ان کے غیض وغضب کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نمودار ہوتے ہی شیشے کے کمرے کی دیوار کے ساتھ سر ٹکرانا شروع کردیا۔ لیکن اندر داخل ہونا مفقود ثابت ہوا۔ ہنری نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور ماریا کا ہاتھ تھام کر کمرے کے درمیان میں زمین صاف کرکے بیٹھ گیا۔

دونوں روحیں تمام رات کمرے کی شیشے کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہیں۔ لیکن اندر داخل نہیں ہوسکیں۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی وہ چھت سے غائب ہوگئے۔ دونوں میاں بیوی نے خدا کا نام لے کر دروازہ کھولا۔ اور نیچے کمرے کی جانب چل دیئے۔ تمام رات سردی میں ٹھٹھرتے رہنے کی بدولت انہیں اپنے جسموں میں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد دونوں سونے کے لئے لیٹ گئے۔ دوبارہ جب ان دونوں کی آنکھ کھلی۔ تب گھڑی تین بجا رہی تھی۔ ضروریات زندگی سے فارغ ہونے کے بعد ہنری نے ماریا کا ہاتھ تھاما اور پادری جون کے پاس جا پہنچا۔ تمام حالات تفصیل سے سننے کے بعد پادری جون ہمکلام ہوا۔

"تم دونوں کو فوراً سے پیشتر پروفیسر لاشوئی کے کیبن کا رخ کرنا چاہئے۔ وہ ارواح سے رابطے کا علم جانتا ہے۔"

"لیکن فادر بھلا اس سے کیا ہوگا؟" ہنری نے پوچھا۔

"شیرف مٹکاف کی روح تمہاری طرف دار ہے۔ اور میرے خیال میں اس مسئلے کا حل اس کی روح سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا۔"

بات دونوں میاں بیوی کی سمجھ میں آگئی۔ اس لئے انہوں نے ٹائم ضائع کرنے کے بجائے پروفیسر لاشوئی کے کیبن کا رخ کرنا مناسب جانا۔ پروفیسر کا کیبن ٹاؤن سے باہر ویرانے میں تھا۔ وہ ڈھلتی عمر اور جھریوں زدہ چہرے کا مالک تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں چمکدار اور گہری نیلی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تمام جسم کے بوڑھا ہوجانے کے باوجود آنکھیں اب بھی مکمل طور پر جوان ہوں۔ ہنری نے اسے مختصر طور پر حالات سے آگاہ کرنے کے بعد مقصد کے متعلق بتایا۔ پروفیسر لاشوئی انہیں اپنے ہمراہ ایک ایسے کمرے میں لے آیا۔ جہاں ایک میز کے گرد پانچ کرسیاں موجود تھیں۔

کمرہ سرخ رنگ کی روشنی سے منور تھا۔ اس نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود کمرے سے منسلک دوسرے کمرے کی جانب چل دیا۔ دوبارہ جب وہ نمودار ہوا تب اس کے ہاتھوں میں ایک ضخیم رسیدہ کتاب موجود تھی۔ اس نے کتاب اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہنری سے بلائی جانے والی روح کا نام پوچھا۔ اور ہنری نے فوراً اسے شیرف مٹکاف کے نام سے آگاہ کردیا۔ نام معلوم ہوجانے کے بعد پروفیسر نے کتاب کھولی۔ اور اسے دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کردیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی پڑھائی میں تیزی آنے لگی۔ جبکہ اس کی آنکھوں کا رنگ خون کی مانند سرخ ہونے لگا۔ پھر ایک جھماکے کے ساتھ ان کے سروں پر لٹکتا ہوا بلب بجھ گیا۔ اور کمرے میں یکلخت اندھرا چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر نے ان الفاظ کا ورد شروع کردیا۔ "اگر کمرے میں شیرف مٹکاف کی روح موجود ہے تو سامنے آئے۔" تیسری یا چوتھی دفعہ یہ الفاظ دہرانے پر کمرے کا درجہ حرارت ٹھنڈا ہونا شروع ہوگیا اور پھر انہیں اندھیرے کمرے میں کسی انسان کا ہیولہ دکھائی دینے لگا۔ پروفیسر لاشوئی نے ہنری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھ سکتے ہیں لیکن مہربانی کرکے جلد از جلد..... کیونکہ وقت بے حد کم ہے۔"

"شیرف مٹکاف کیا تم ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہو؟" ہنری نے پوچھا۔

"بالکل تیار ہوں۔ بلکہ میں تمہارے سوالوں کے متعلق اچھی طرح جانتا بھی ہوں۔"

ہنری بولا۔ "تو پھر ہمیں بتاؤ ہم اعتھل اور برکلے کی روحوں سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں؟ ان دونوں نے ہماری جان عذاب میں کردی ہے۔"

"میں تم دونوں کے مسئلے کے متعلق اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تم دونوں کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ وہ دو ہیں جبکہ میں اکیلا ہوں۔ وہ طاقتور ہیں۔ میں کمزور ہوں۔ آج سے پہلے ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے جب بھی مظلوموں کی مدد کرنے کی کوشش کی تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ناکام ہوجاؤں گا۔ اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

"شیرف کیا ہمیں ان دونوں کے عتاب سے کوئی بھی نہیں بچاسکتا۔" ہنری نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

"نہیں..... وہ دونوں ناقابل تسخیر ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ تم دونوں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے شیشے کے کمرے میں بند کرلو۔ ورنہ ان دونوں کی دسترس سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے۔" وہ اچانک ہی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

ساتھ ہی کمرہ سرخ رنگ کی روشنی سے منور ہوگیا۔ دونوں میاں بیوی کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ "پروفیسر لاشوئی کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جیسے تم نے شیرف مٹکاف کی روح کو بلایا ہے۔ ایسے ہی ان دونوں کی روحوں کو بلا کر قید کرڈالو۔" ہنری بولا۔

"نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان دونوں کی روحیں کمرے میں آنے سے منکر ہوجائیں گی۔ اور ان کی مرضی کے بغیر انہیں بلانا ممکن نہیں ہے۔"

دونوں میاں بیوی ناکام قدموں کے ساتھ چرچ کی جانب چلے آئے۔ پادری جون ان دونوں کا منتظر تھا۔ دونوں نے اسے اپنی ناکامی سے آگاہ کیا۔ پادری نے دونوں کو دلاسہ دیا۔ اور تنبیہ کی کہ وہ روانہ رات اپنے آپ کو سن روم میں بند کرکے سوئیں۔ کیونکہ بدروحیں صرف رات کی سیاہی کے دوران ہی نقصان پہنچاسکتی ہیں۔ دن کی روشنی میں ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اس دوران پادری اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچ سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی نے پادری کی نصیحت کے سامنے سر جھکایا۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

وہ رات پچھلی رات سے مختلف نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہنری نے شیشے کے کمرے میں بستر اور کپڑوں کا انتظام کرلیا تھا۔ سرِشام ہی دونوں میاں بیوی اپنے آپ کو کمرے میں بند کرکے آنے والے وقت کی تیاری کرلی۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ساڑھے نو کے قریب دونوں بدروحیں چھت پر نمودار ہوئیں۔ تمام رات پچھلی رات کی طرح گزری اور صبح کے قریب دونوں بدروحیں دفان ہوگئیں۔ میاں بیوی نے ناشتہ کیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پادری جون کے چرچ کا رخ کیا۔

وہ چھوٹتے ہی بولا۔ "میں مسئلے کا حل تلاش کرچکا ہوں۔ اور اس کی تکمیل کے لئے تیاریوں کا آغاز بھی کرچکا ہوں۔ تم دونوں کو ایک دو دن مزید انتظار کرنا ہوگا۔"

"لیکن حل کیا ہے؟" ہنری نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"وقت آنے پر مسئلے کے حل کے متعلق معلوم ہوجائے گا۔ تم دونوں بے فکر ہوجاؤ۔ میں ان دونوں کو اب قابل نہیں چھوڑوں گا۔ کہ وہ لوگوں کو مزید پریشان کرسکیں۔"

دونوں میاں بیوی بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس چلے آئے۔ وہ جلد از جلد روحوں سے نجات چاہتے تھے۔ لیکن پادری معاملے کو طول دیئے جارہا تھا۔ بہرحال سن روم کی بدولت اب وہ دونوں بدروحوں کے عتاب سے محفوظ تھے۔

آنے والا دوسرا دن بے حد سنسنی خیز ثابت ہوا۔ دونوں پادری جون کے حکم کے مطابق سرِشام چرچ پہنچ گئے۔ چرچ کی چھت پر شیشے کا چوبہ دان تیار تھا۔ اس کی تیاری میں پکاؤلی ٹاؤن کے بہترین کاریگروں کی محنت شامل تھی۔ کمرہ سن روم سے مطابقت رکھتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سائز میں اس سے کافی بڑا تھا۔ اور اس کے دو دروازے تھے۔ سامنے کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا جبکہ پچھلا دروازہ خفیہ تھا۔ اور بغور دیکھنے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دونوں خفیہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اور روحوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

وہ دونوں بارہ بجے کے قریب نمودار ہوئے۔

شیشے کے کمرے کا سامنے والا دروازہ اس انداز میں بند کیا گیا تھا کہ ہلکے سے جھٹکے کی بدولت کھل سکے۔ پادری جون سیڑھیوں کے قریب موجود کمرے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ تاکہ منصوبے کے آخری پہلو پر اختتام کی مہر ثبت کرسکے۔

دونوں روحوں نے آتے ہی شیشے کے کمرے کی دیوار سے سر ٹکرانا شروع کردیا۔ دروازے کو دھکا لگنے کی دیر تھی کہ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ دونوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کمرے میں داخل ہوگئے۔ اتھل استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"اب تمہیں ہمارے عتاب سے کون بچائے گا۔ بلاؤ اپنے ہمدرد پادری کو، ہم اس سے بھی نمٹنے کو تیار ہیں۔"

برکلے بولا۔ "تم نے ہم سے بچنے کے لئے چرچ کا رخ کیا۔ دیکھ لو ہم تمہارے سامنے چرچ کی چھت پر موجود ہیں۔ اور یہیں تمہاری زندگیوں کا خاتمہ بھی کریں گے۔"

ہنری ماریا کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہوچکا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ دروازے کے خفیہ بٹن پر تھا۔ ہنری چلاتے ہوئے بولا۔

"ہر ظالم کا آخر ہوتا ہے۔ تمہارے ظلموں کے اختتام کا وقت بھی آچکا ہے آؤ اور ہمیں پکڑ کر دکھاؤ۔" الفاظ ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اتھل اور برکلے استہزائیہ نگاہوں سے ان دونوں کی جانب دیکھتے رہے۔ لیکن اس اثناء میں ان کے پیچھے موجود دروازہ بھی جھٹکے کے ساتھ بند ہوگیا۔ اب وہ شیشے کے کمرے میں قید دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ ان کی چیخوں کی بدولت چرچ کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ ماریا شیشے کے کمرے سے باہر نکلتے ہی بے ہوش ہوگئی۔ ہنری نے اسے احتیاط کے ساتھ اٹھایا اور کانپتے قدموں کے ساتھ نیچے چرچ کی جانب چل دیا۔ پادری جون ان کے ہمراہ تھا۔

تین دن کے بعد شہر جانے کے راستے کھل گئے۔ لیکن ہلکی برف کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ رات کے اس پہر وہ دونوں شہر جانے کی تیاریاں مکمل کرچکے تھے۔ اور اب کھڑکی میں کھڑے برف کے گالوں کو نیچے گرتے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ان کا سنی مون دنیا کا عجیب ترین ہنی مون ثابت ہوا تھا۔ جس کے متعلق سوچنے ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھا۔ اب تو پکاؤلی ٹاؤن سے رخصت ہونے کا وقت قریب آچکا تھا۔

"ہنری....." اسے ماریا کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا ڈیئر..... تم گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہنری میں نے سامنے موجود جھیل کے پانی پر کسی آدمی کو چلتے ہوئے دیکھا ہے۔" اس کی آواز میں بے پناہ خوف تھا۔ ہنری نے اسے کاندھے سے تھامتے ہوئے قریب موجود صوفے پر بٹھادیا۔

"تمہارا وہم ہوگا۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے وہسکی لاتا ہوں۔ سردی بڑھتی جارہی ہے۔"

اس نے کمرے میں موجود الماری کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے اٹھتے ہوئے قدم اچانک ہی رک گئے۔ آتش دان کی جانب مڑنے سے پہلے اس کی نگاہ سرسری طور پر کھڑکی پر پڑی۔ وہاں کسی نوجوان کا چہرہ موجود تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دوبارہ کھڑکی کی جانب دیکھا۔ لیکن اب وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے اسے اپنا وہم جانا۔ اور دوبارہ الماری کا رخ کرنے لگا۔ باہر دور کہیں بادل گرجے اور ساتھ ہی جھٹکے کے ساتھ کمرے میں جلتا ہوا بلب بجھ گیا۔ ماریا چیختی ہوئی نشست سے اٹھ کر ہنری کے ساتھ لپٹ گئی۔

"ڈیئر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی موم بتی روشن کرتا ہوں۔" اچانک دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ ماریا کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپنے لگا۔ ہنری اس اثناء میں لائٹر آن کرچکا تھا۔ دستک ایک دفعہ پھر سنائی دی۔

"اس وقت باہر کون ہوسکتا ہے؟ ماریا تم موم بتی کو روشن کرو۔ میں باہر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں ہنری میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی، باہر ان دونوں کی روحیں موجود ہیں۔ کہانی ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرانے کی کوشش کررہی ہے۔ لیکن اب کی دفعہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔

ہنری موم بتی روشن کر چکا تھا۔ اور اب دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لیکن ماریا درمیان میں دیوار بنی کھڑی تھی۔

"ماریا ہٹ جاؤ۔ کوئی ضرورت مند بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے دروازہ کھولنے دو۔"

"نہیں ہنری اب میں تمہیں دروازہ نہیں کھولنے دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔"

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اور باہر سے پادری جون کی آواز سنائی دی۔

"ہنری دروازہ کھولو۔ میں سردی کی بدولت ٹھٹھرتا جارہا ہوں۔" ہنری نے طویل سانس لیتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی گھنٹی نے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ ٹن ٹن ٹن.....

ایک لڑکا اور لڑکی کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہوئے۔ ان میں پادری جون کوئی نہیں تھا۔ لیکن ایتھل اور برکلے بھی نہیں تھے۔ ان دونوں کی شکلیں انجانی تھیں۔ ان میں سے ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اور دوسری نوجوان لڑکی..... دروازہ کھلتے ہی انہوں نے "میری میری پیپی ہنی مون" گانا شروع کردیا۔

"کون ہو تم؟" ہنری کے لہجے میں خوف تھا۔ واقعات بالکل دو رات پہلے کے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایتھل اور برکلے کے بجائے دروازے پر نوجوان لڑکا اور لڑکی کھڑے تھے۔ نوجوان نے پوچھا۔

"جناب کیا آپ ہمیں اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟" جواب سنے بغیر وہ اندر موجود صوفے کی جانب چل دیا۔ لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔

"میرا نام سیمرو ہے۔ ہم دونوں پکاڈلی ٹاؤن سے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ہنی مون منانے کے لئے ہمارے قصبے میں آئے ہیں۔ یقین جانیے جناب ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اس خوشی سے محروم رہے ہیں۔" نوجوان اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

لیکن ہنری کے دماغ میں نوجوان کا بتایا ہوا نام گونج رہا تھا۔ "سیمرو..... سیمرو..... سیمرو....." یہ نام اس نے کہاں سنا تھا۔ پھر جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا۔

سیمرو ایتھل کے لڑکے کا نام تھا جو کہ مرچکا تھا۔ ایک دفعہ پھر ان کا واسطہ دو عدد روحوں سے پڑ گیا تھا۔ اس نے صوفے پر بیٹھی ہوئی دونوں روحوں کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"جناب آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جیسا سوچ رہے ہیں۔ اب ویسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم دونوں اپنے ماں باپ سے مختلف ہیں۔ وہ محبت کے خلاف تھے۔ جبکہ ہم محبت کے پیروکار ہیں۔ ہم صرف آپ کو محبت کی کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ اگر ہمارے والدین ہم سے اختلاف نہ کرتے تو شاید آج آپ کی طرح ہم بھی اپنا ہنی مون منا رہے ہوتے۔" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں..... محبت زندہ تو ہے نا..... بس اسے زندہ رہنا چاہیے۔ ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ ایک دفعہ پھر آپ دونوں کو مبارکباد دیتے ہوئے اجازت چاہیں گے..... گڈ نائٹ.....!!" جھماکے کے ساتھ کمرے میں موجود بلب جل اٹھا۔

ماریا ایک دفعہ پھر ہنری کے ساتھ لپٹ گئی۔ کیونکہ کمرہ اب خالی تھا۔ وہ دونوں جاچکے تھے۔ باقی کی رات جاگتے ہوئے گزر گئی۔

دوسری صبح انہوں نے سامان سنبھالا اور پکاڈلی ٹاؤن کے مختصر اسٹیشن کی جانب چل دیئے۔ راستے میں موجود قبرستان سے گزرتے ہوئے انہوں نے سیمرو اور ذولفیہ کی قبروں پر پھول چڑھائے۔ ان کے حق میں دعا کی اور وکٹوریہ میں جا بیٹھے۔ وکٹوریہ اسٹیشن کی جانب بھاگنے لگا۔

آج بھی پکاڈلی ٹاؤن کے مختصر چرچ میں ایتھل اور برکلے کی روحیں شیشے کے کمرے میں قید ہیں۔ لوگ دور دور سے انہیں دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ تو نہیں سکتے۔ ہاں رات میں ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں ضرور سن سکتے ہیں۔ ان دونوں کی عبرت انگیز کہانی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ جن میں سے ایک چرچ کا پادری جون ہے۔

خون کی پیاس

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اچانک خوفناک آوازوں کے ساتھ قبر پھٹی اور اس میں سے دھواں سا نکلا پھر اس دھوئیں نے ایک ٹھوس جسم دھار لیا، اور پھر پاس بیٹھی عورت پر جھکتا چلا گیا اور جب وہ اٹھا تو اس کے ہونٹ خون سے لت پت تھے۔

دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی ایک ناقابل فراموش خونی اور تحیر انگیز پر ہول روداد

اچانک سینما ہال کی تمام روشنیاں گل ہوگئیں اور مہندر چونک کر اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اشتہارات شروع ہوچکے تھے۔ مہندر دل چسپی سے اشتہارات دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اصل فلم "زندہ لاش" شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

فلم کے شروع میں ایک خوف ناک منظر دیکھنے میں آیا۔ وہ ایک قبرستان کا منظر تھا۔ ایک خوبصورت عورت ایک قبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ قبرستان کا ماحول بہت بھیانک تھا کہ اچانک چاروں طرف سے ایسی خوف ناک آوازیں آنے لگیں جیسے ہزاروں بلائیں چیخ رہی ہوں۔ بین کر رہی ہوں، عورت نے خوف زدہ ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ بس آوازیں تھیں، خوف ناک آوازیں جو اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے

بہت سی بلائیں خوش ہو کر طرح طرح کی آوازیں منہ سے نکال رہی تھیں۔

پھر اچانک خوف ناک آوازوں کے درمیان ایک قبر پھٹی اور اس میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا۔ عورت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس قبر میں سے باہر آنے والے ہاتھ کو دیکھتی رہی اور پھر کچھ دیر بعد ایک انسانی ڈھانچہ اس عورت کے سامنے تھا۔ بے حد خوف ناک شکل تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے بڑے بڑے دانت، لمبے لمبے پاؤں، سارا جسم استخوانی تھا۔ وہ عورت اسے دیکھ کر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

"آوازیں کچھ اور تیز ہو گئی تھیں۔ قبرستان کا ماحول کچھ اور دہشت ناک ہو گیا تھا۔" اور سینما ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنی چیخوں کو روکنے کے لئے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ مہندر بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا۔ وہ مردہ آہستہ آہستہ اس عورت کی طرف بڑھا اور کچھ دیر بعد وہ اس عورت کو بے لباس کرنے لگا۔

مہندر کو اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ ڈھانچہ نے عورت کے سینے پر اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے۔ اور جب وہ اٹھا تو اس کے ہونٹوں پر خون موجود تھا۔ اور اس عورت کا سینہ خون میں لت پت تھا۔ عورت نے سسکاری لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر اس ڈھانچہ پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔ اب وہ ڈھانچہ اس کے نرخرے کی طرف جھک گیا۔ اور منہ لگا کر خون پیتا رہا۔ اور جب وہ اٹھا تو اس عورت کا نرخرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ عورت جو گلاب کی طرف نرم و نازک تھی۔ اب زرد پتوں کی طرح مرجھا چکی تھی اور کسی مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر پڑی تھی۔

ڈھانچہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر اسی قبر کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں سے وہ نکلا تھا۔ اب خوف ناک آوازیں تھم چکی تھیں اور سینما ہال پر سکون ہو گیا تھا۔

مگر مہندر کے بدن میں ابھی تک خون گردش کر رہا تھا۔

اس کے جذبات میں ہیجان برپا تھا۔ تنفس بے ترتیب تھا۔ اسے سخت پیاس لگی تھی۔ ایک عجیب سی پیاس جس کو وہ کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ اس نے کئی گلاس پانی اور ٹھنڈا میں بوتلیں پئیں مگر اس کی پیاس ختم نہیں ہوئی۔

فلم ختم ہوئی تو وہ نڈھال نڈھال سا اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اب بھی اس کی آنکھوں میں وہ خوف ناک مناظر رقص کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی وہ ڈھانچہ کہیں سے آنکلے گا اور اسے دبوچ لے گا۔ وہ جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ اس کی بیوی شانتی نے حیرت سے اس کو دیکھا اور پوچھا "مہندر خیریت تو ہے؟"

مہندر نے خالی خالی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "ہاں خیریت ہے۔"

"کھانا لاؤں۔"

"نہیں آج مجھے بھوک نہیں ہے۔" مہندر نے انکار میں سر ہلا دیا اور شانتی نے مختصراً اچھا کہہ کر اپنی خواب گاہ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ مہندر اور شانتی ہمیشہ الگ الگ کمرے میں سویا کرتے تھے۔ مہندر کچھ دیر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اور پھر وہ اپنی بیوی کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں مسہری پر پڑے اپنے اپنے جذبات کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگے تھے۔

مہندر کو ایک بار پھر پیاس لگنے لگی۔ عجیب سی پیاس، اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی اور وہ شانتی کے سینے کی طرف جھک گیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔" شانتی نے حیرت سے کہا۔

لیکن وہ کچھ جواب دیئے بغیر اس کے سینے میں اپنے ہونٹ گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ، یہ تم کیا کر رہے ہو۔؟"

شانتی ایک بار پھر چیخی اور پھر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہندر نے حسرت سے شانتی کی طرف دیکھا اس کے تمام بدن میں سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پیاس کے مارے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے شانتی پر جھپٹ پڑا۔ اور اسے مسہری پر گرا کر ایک بار پھر اپنے

دانت سینے میں گاڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی شانتی تیزی سے چھلانگ مار کر اپنی خواب گاہ سے نکل بھاگی اور اپنی دس سالہ بیٹی شیلا کے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

شیلا مزے سے گہری نیند سو رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور مہندر چلایا۔ "شانتی دروازہ کھولو بھگوان کے لئے دروازہ کھولو۔ شانتی..... دروازہ کھولو۔" اس کی آواز میں عجیب طرح کا درد تھا۔

شانتی نے آہستہ سے کہا۔ "مہندر میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ تم انسان سے وحشی بن گئے ہو۔"

"شانتی۔ شانتی اب..... میں ایسا نہیں کروں گا..... تم دروازہ کھولو تو۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔ اس کی آواز سن کر شیلا بھی جاگ اٹھی اور حسرت سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ پھر اپنے ڈیڈی کی آواز سن کر اپنی ممی سے بولی۔

"ممی باہر ڈیڈی کھڑے ہیں۔ آپ دروازہ کیوں نہیں کھولتیں۔" اور شانتی بولی۔

"شیلا تم سو جاؤ شاباش۔" اور شیلا حیرت سے اپنی ممی کو دیکھتے ہوئے پھر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ اور مہندر تھک ہار کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اور شانتی کی خواب گاہ میں جا کر جلدی جلدی اپنے کپڑے پہنے اور پھر باہر نکل گیا۔

اس کا انگ انگ پیاسا تھا۔ اور اس کے بدن میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ایک طرف جا رہا تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ سردیاں عروج پر تھیں۔ آسمان پر ٹھٹھرتے چاند تارے زمین کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہولناک سناٹا تھا۔ مگر مہندر تیزی سے سناٹے کا سینہ چیرتا ہوا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک طرف جا رہا تھا اور پھر ایک فٹ پاتھ پر ایک دکان کے چھجے کے نیچے سکڑی سمٹی فٹ پاتھ پر وہ کچھ دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ایک بارہ تیرہ سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ جو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ فٹ پاتھ پر ایک دکان کے چھجے کے نیچے سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ وہ دونوں یقیناً بھکارن تھیں۔

مہندر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر ایک طرف بھاگ نکلا۔ لڑکی شاید گہری نیند سو رہی تھی۔ اس لئے کچھ دیر تک تو اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن جب ہوش آیا تو اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر مہندر کی گرفت خاصی سخت تھی۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو لے کر ایک ویران سی حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ حویلی بڑی پراسرار تھی۔ ہر طرف چمگادڑیں اڑ رہی تھیں۔ اور مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ بہت خوف ناک اور دہشت ناک ماحول تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو تم!" لڑکی نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

مگر مہندر کے بدن میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی اور پیاس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جلد جلد اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ لڑکی نے چیختے ہوئے مزاحمت کی۔ مگر مہندر نے ایک ہاتھ مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔

کچھ دیر بعد مہندر کی پیاس بجھ چکی تھی۔ بدن کی سنسناہٹ ختم ہو گئی تھی۔ اور خون کی گردش تھم چکی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس لاش کا کیا کرے۔ پھر اچانک ایک خیال نے اس کے بدن میں ایک بار پھر خون کی گردش تیز کر دی۔ لیکن پھر وہ پرسکون ہو گیا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ حویلی میں سے ایک زنگ آلود خنجر اور ایک بوری ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خنجر سے اس نے لڑکی کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور اس بوری میں وہ ٹکڑے بھر کر، اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر آیا تو اس کی بیوی شانتی ابھی تک شیلا کے کمرے میں تھی۔ اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے اس کمرے کی طرف دیکھا۔ اور بوری کو لے کر باورچی خانے میں آ گیا۔ پھر بوری میں سے لڑکی کے جسم کے سارے ٹکڑے نکال کر فرج میں رکھ دیئے۔ اور ایک ٹکڑا نکال کر بھوننے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ مزے لے لے کر لڑکی کا گوشت کھا رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

زندگی میں پہلی بار مہندر نے اتنا مزیدار گوشت

کھایا تھا۔ انسانی گوشت، اتنا مزیدار ہوتا ہے اس کا اندازہ اسے پہلی بار ہو رہا تھا پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ شانتی کی چیخ کی آواز سے کھلی وہ تیزی سے آواز کی طرف بڑھا۔ باورچی خانے میں شانتی فرج میں رکھے لڑکی کے ٹکڑوں کو گھور رہی تھی۔

مہندر نے آگے بڑھ کر شانتی کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ”یہ..... یہ کیا ہے؟“ شانتی نے خوف زدہ انداز میں فرج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

مہندر کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے بولا۔ ”کچھ نہیں بس ایک لڑکی کے جسم کے ٹکڑے ہیں۔ رات اچانک سے ایک قتل ہو گیا سوچا کہ اس لاش کا کیا کروں لہٰذا میں نے ایسا کر دیا۔ اب میں یہی گوشت کھاؤں گا۔ بس اسے یہاں لے آیا، رات اس کا ایک ٹکڑا میں نے بھون کر کھایا تھا۔ بہت مزیدار تھا، اتنا مزے دار کہ زندگی میں ایسا گوشت کبھی نہیں کھایا، تم بھی کھا کے دیکھو۔“

شانتی اس کی بات سن کر لرزتی آواز میں بولی۔

”مہندر..... مہندر..... تم نے انسانی گوشت کھایا ہے۔“

”ہاں اور اب پھر کھاؤں گا۔ تم میرے ناشتے میں ایک ٹکڑا اس گوشت کا پکا کر لانا اور ہاں دیکھو کسی کو اس بات کا علم نہ ہونے دینا ورنہ میں گرفتار ہو جاؤں گا اور پھر پولیس مجھے پھانسی پر چڑھا دے گی۔“

شانتی نے خوف سے اسے دیکھا، اسے مہندر سے کتنی محبت تھی۔ کتنی چاہتی تھی۔ وہ تو اس کے جنم جنم کا دیوتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرے گی۔

چوتھی رات ایک بار پھر منہدر کو اپنے بدن میں سنسناہٹ دوڑتی محسس ہوئی اور شدت سے پیاس لگنے لگی۔ وہی عجیب سی پیاس خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اور پھر بے قرار ہو کر تیزی سے شانتی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شانتی کے پہلو میں لیٹ کر اس نے شانتی کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور اس کے سینے پر اپنے ہونٹ رکھ کر دانت گاڑنے کی کوشش کرنے لگا، مگر شانتی ایک جھٹکے سے دور ہٹ گئی۔

”مہندر۔ آج..... پھر وہی حرکت۔“ شانتی نے روہانسی اور جذبات سے لبریز آواز میں کہا لیکن مہندر نے جواب دیئے بغیر دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی۔ اور شانتی ایک بار پھر اپنے کمرے سے نکل بھاگی اور شیلا کے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر کے ہانپنے لگی۔ اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ شانتی نے ایک چادر اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی اور شیلا کے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ باہر سے مہندر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اسے دروازہ کھولنے کا کہہ رہا تھا۔ لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ پھر مہندر کی آواز آنا بند ہو گئی اور چند لمحوں بعد شانتی کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی باہر کا دروازہ کھول کر باہر گیا ہو۔ شانتی نے آنکھیں موند کر اپنا سر تکیئے پر رکھ دیا۔

دوسری صبح فرج کھولتے ہی ایک بار پھر شانتی کی چیخ نے مہندر کو جگا دیا۔ لیکن اب وہ بستر سے اٹھ کر باہر نہیں آیا شانتی ہانپتی کانپتی اس کے کمرے کی طرف بڑھی اور اسے جاگتا پا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ت..... تم نے دوسرا قتل بھی کر دیا۔“

وہ پرسکون انداز میں بولا۔ ”ہاں مگر دیکھو مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ پلیز..... کچھ دیر سونے دو۔“ اور شانتی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

پھر جب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شہر میں لڑکیاں پراسرار طور پر غائب ہونے لگیں تو سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ پولیس حرکت میں آ گئی اور جگہ جگہ چھاپے مارے گئے۔ مگر ہر طرف سے ناکامی۔

لوگوں نے اپنی اپنی لڑکیوں پر گھروں سے رات کے بعد نکلنے پر پابندی لگا دی۔ پولیس کے دستے رات بھر شہر میں گشت کرنے لگے۔ لیکن اغوا کرنے والا مجرم مہندر ابھی انکی نگاہوں سے دور تھا۔ پولیس ابھی تک کوئی خاص سراغ نہ لگا پائی تھی۔ البتہ انہیں ایک ویران حویلی سے اغوا ہونے والی لڑکیوں کے کچھ پھٹے ہوئے کپڑے اور خون کے دھبے ضرور نظر آئے۔ جن سے

انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ تمام لڑکیاں قتل ہو چکی ہیں۔ مگر ان کی لاشیں کہاں گئیں، قاتل کون ہے؟ اس سلسلے میں پولیس ابھی تاریکی میں تھی۔

اخبارات مسلسل چیخ رہے تھے۔ لوگ پریشان تھے۔ پولیس قاتل کی تلاش میں دن رات مصروف تھی اور قاتل اپنے کمرے میں بے چین اور مضطرب تھا۔ کئی روز سے وہ بہت بے چین اور بے قرار تھا۔ اس کے بدن میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہی عجیب پیاس۔

اسے اب تو پیاس کے ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اس نے کتنے ہی گلاس پانی کے پی لئے تھے۔ خوب جی بھر کے طرح طرح کے کھانے کھائے مگر جب سے انسانی خون اور انسانی گوشت اس کے منہ کو لگا تھا، اسے کوئی اور چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ ان کا ذائقہ اسے بہت لذیذ معلوم ہوتا تھا۔

شانتی الگ پریشان تھی وہ دن رات اپنے کمرے میں بند رہتی۔ شیلا کو بھی کمرے میں بند رکھتی۔ لیکن رات وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئی اور مہندر اس کے کمرے میں آ گیا۔ پھر بھاگنے کے تمام راستے مسدود کر کے وہ شانتی کے جسم سے کھیلنے لگا۔ اور چند لمحوں بعد وہ شانتی کے بدن سے خون پینے میں مصروف تھا۔ شانتی نے مدافعت کی۔ مگر آج اس کی مدافعت کمزور تھی۔ وہ کئی روز سے مہندر کو بے چین اور بے قرار و پریشان دیکھ رہی تھی۔ اس سے مہندر کی یہ پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اور آج اس نے خود کو مہندر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ درد سے تڑپتی رہی، کراہتی رہی، سسکتی رہی، مگر مہندر کو منع نہیں کیا۔

ایک رات پھر منہدر اپنی پیاس بجھانے کے لئے شانتی کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ مگر اس کی پیاس نہیں بجھی۔ شانتی کے جسم کا سارا خون وہ پہلے ہی پی چکا تھا۔ وہ دیوانہ وار ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اس کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور سنسناہٹ بدن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اب باہر نہیں جا سکتا تھا۔ سارے راستے مسدود تھے۔ اور پیاس بجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن اچانک وہ چونک پڑا۔ ابھی ایک ذریعہ تھا۔ وہ تیزی سے شانتی کی طرف جھپٹا۔ شانتی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر وہ اس کی طرف متوجہ ہونے لگی۔

بلکہ اس کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے تکیے کے نیچے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ شانتی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر کمزوری کے باعث وہ گر پڑی۔

مہندر تیزی سے شیلا کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں میں سے ایک چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ اندر شیلا بے خبر سو رہی تھی۔ مہندر تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ حیرت سے کچھ نہ بولی پھر خوف زدہ انداز میں بولی۔ ”ڈیڈی، ڈیڈی یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔؟“ وہ اپنی ممی کو آوازیں دینے لگی۔

خواب گاہ میں پڑی شانتی نے اپنی بیٹی کی چیخیں سنیں تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کمزوری کے باعث ایک بار پھر گر پڑی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیلیفون اپنے قریب کھسکایا۔ اور لرزتی کانپتی انگلیوں سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ”ہیلو پولیس اسٹیشن۔“

اور کچھ دیر بعد اس کے گھر کے سامنے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

چند پولیس والے مہندر کو پکڑ کر ایک گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور دوسری گاڑی شانتی اور شیلا کو لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

دوسرے دن اخبارات بری طرح سے چیخ رہے تھے۔ انہوں نے واقعات کی تفصیلات بہت بڑھا چڑھا کر شائع کی تھیں جس کی وجہ سے سارے ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ اور جب پولیس کو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ ایک فلم ”زندہ لاش“ کی وجہ سے ہوا ہے تو حکومت نے فوراً اس فلم کی نمائش کو ممنوع قرار دے کر اس کی تمام کاپیاں جلا دیں۔

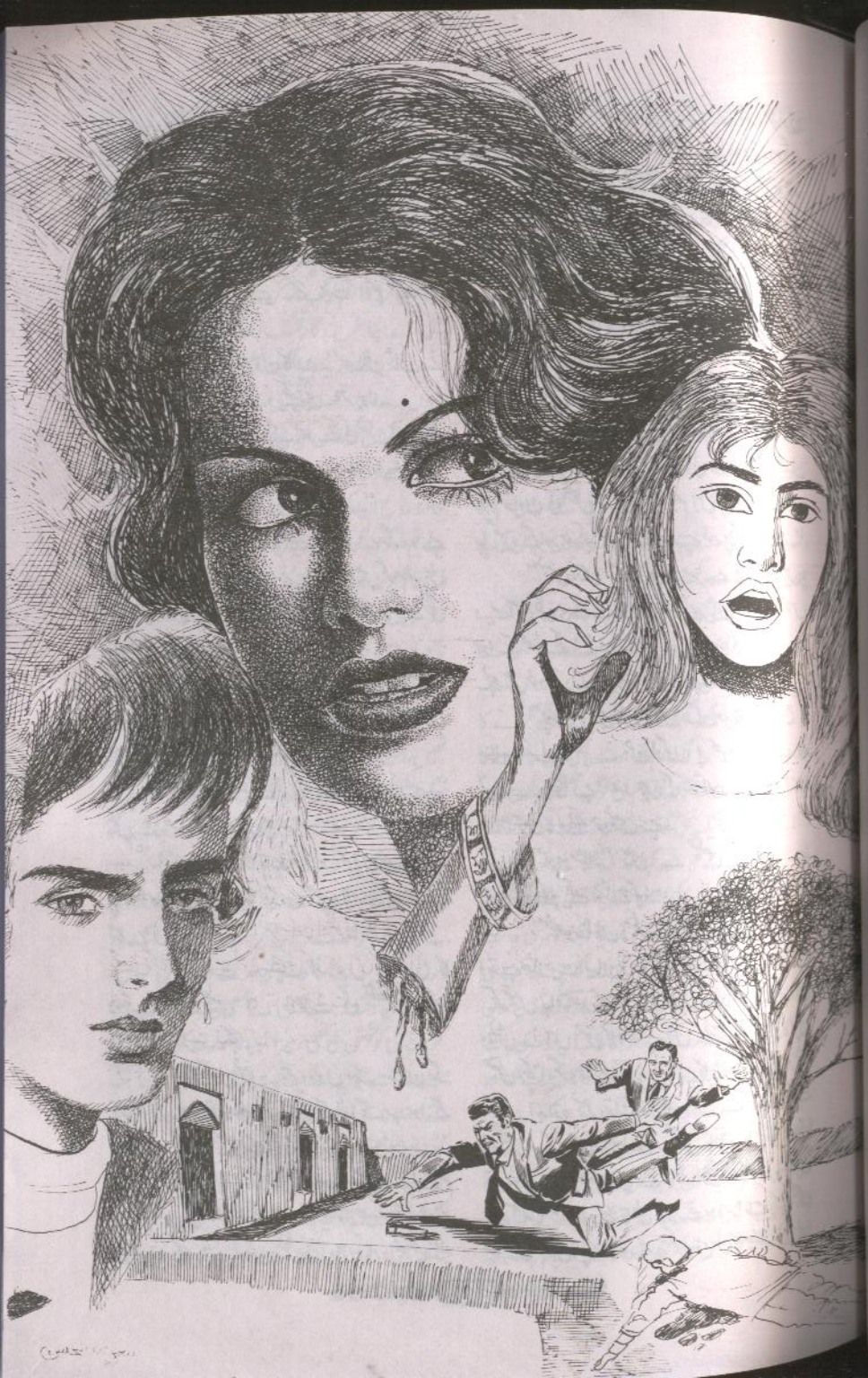

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:13

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

ہم لوگ عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ راستے بھر خاموشی طاری رہی تھی۔ دونوں اپنے طور پر سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے اس لئے راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم ساحل پر پہنچے تو ماحول تاریکیوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ جہاز کے مسافر تھکے تھکے آرام کر رہے تھے۔ ہم اپنی جگہ پہنچے تو عسکری نے کہا۔

''میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

''مجھے بھی شدید بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا اور عسکری چلا گیا۔ کھانے کے دوران ایک اور کام کی بات ہوگئی۔

''مجھے فرانسیسی افسر سان اوگلو کی تلاش تھی۔ وہ مجھے مل گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تیار ہوگیا ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے کے لئے اس کے ٹھکانے پر جانا ہوگا۔ میں اس کا ٹھکانہ دیکھ آیا ہوں۔'' عسکری بولا۔

''اوہ۔ احتیاط رکھنا عسکری۔''

''بے فکر رہو۔'' عسکری نے کہا۔ وقت مقررہ پر وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ میرے ذہن میں خیالات گردش کرنے لگے، گارساں ایک وحشی جانور تھا۔ سب دیکھ چکے تھے کہ اس نے بس شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے ورنہ انسانی زندگی کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ کسی بھی وقت، کسی کو بھی ہلاک کرسکتا ہے۔ یہ بات ہم بھی جانتے تھے اور وہ بھی کہ یہاں کوئی اس کا دوست نہیں ہے سوائے اس کے اپنے ساتھیوں کے جو زیادہ تر جہاز پر ہی رہتے تھے۔ عسکری نے واقعی سان اوگلو کا صحیح انتخاب کیا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا اور پرجوش بھی۔ میں اس چٹان کے پیچھے بیٹھ کر عسکری کا انتظار کرنے لگی۔ ماضی کی باتیں انسان کے لئے سوچ کا بہترین سرمایہ مہیا کرتی ہیں۔ نہ جانے کیا کیا یاد آرہا تھا۔

''اچانک چٹان کے دوسری طرف آہٹ سنائی دی اور میں چونک پڑی۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ''نشاء.....!'' یہ آواز عسکری کی نہیں تھی لیکن اجنبی بھی نہیں لگی تھی۔ میں جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ تب میں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ یہ احمر جنیدی اور عدنان شائی تھے۔ میرے ذہن میں شدید نفرت ابھر آئی تھی۔

''ہیلو۔ نشاء۔!'' احمر جنید نے کہا۔

''جی.....!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''شرم نام کی کسی چیز سے واقفیت رکھتے ہیں آپ لوگ''۔ میں نے نفرت سے کہا۔

"حالات ایسے ہی ہوگئے ہیں نشاء کہ ہم ان چیزوں سے ناآشنا ہوگئے ہیں۔ لیکن اس وقت ہم تمہارے لئے ایک اہم پیغام لے کر آئے ہیں۔ ایسا پیغام جسے سن کر تمہارے ذہن سے سارا غصہ نکل جائے گا۔"

"جانتی ہو یہ پیغام کس کا ہے۔"

"سن لو۔ تمہارے لئے بہت اہم ہے یہ پیغام۔" احمر جنیدی بولا۔

"پیغام دانش ہارون کا ہے۔" عدنان ثنائی نے کہا۔ اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ احمر بولا۔

"وہ ہمیں ہوا کے ایک جھونکے کی شکل میں ملے تھے۔"

"ایک نادیدہ وجود کی حیثیت سے۔"

حالانکہ اس وقت وہ مجھے وہ مسخرے لگ رہے تھے لیکن ان کے الفاظ نے میرے جسم میں گرم لہریں دوڑا دی تھیں۔ میں سرد نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تو جنیدی نے پھر کہا۔

"ماضی میں بہت کچھ ہوا ہے۔ اس کی تفصیل فضول ہے۔ لیکن ان واقعات کو بھولنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"دانش ہارون سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔" میں نے پتھریلے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ اسے ملاقات ہی کہو۔ تم اس بارے میں چاہو تو عدنان سے پوچھ سکتی ہو۔" جنیدی نے کہا اور میں ہنس پڑی۔

"زبردست۔ دو نیک انسانوں کی سچائی کا جواب نہیں۔ چلیں اس ملاقات کی تفصیل مجھے بتائیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ہم دونوں ایک سنسان جگہ آرام کر رہے تھے، ہوا بالکل بند تھی کہ اچانک سرد ہوا کے ایک جھونکے نے ہمیں چھوا اور پھر ایک آواز سی ابھری۔"

"احمر! یہ میں ہوں دانش ہارون جس کے لئے تم لوگ پاگلوں کی طرح سرگرداں ہو، یہ آواز سن کر بے بی ہم حیران رہ گئے۔ تب ہارون دانش کی آواز دوبارہ ابھری۔"

"جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو میں اس میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں، لیکن اس کے لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی، کیا سمجھے۔ لیکن اس کے لئے وقت اور طویل جدوجہد درکار ہے۔ اگر تم لوگ محنت کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کے خواہش مند ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

میں خاموشی سے احمر جنیدی کی باتیں سن کر اس کے سچ اور جھوٹ کا اندازہ لگا رہی تھی، احمر جنیدی نے میری شکل دیکھی اور بولا۔

"ہاں تمہیں اس کا اختیار ہے کہ صحیح فیصلہ کرو، یہ صرف ایک کوشش ہے، ہارون دانش کا پیغام سننے کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی اور اگر تمہارا فیصلہ عدم تعاون کی شکل میں ہوگا تو ہم اس ملاقات کو بھول جائیں گے اور جو کچھ ہمیں کرنا ہے اپنے طور پر کریں گے۔"

"نہیں، نہیں آپ لوگ میرے بزرگ ہیں، ویسے آج کل بہت سے بزرگ مجھ پر مہربان ہیں، خیر تو اس ہوا کے جھونکے نے اور کیا کہا مسٹر احمر جنیدی؟" میرے لہجے میں خود بخود ایک طنز کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

"پوری باتیں سن لو اس کے بعد جولانی طبع کا مظاہرہ کر لینا۔ تم نے جن لوگوں پر بھروسہ کیا ہے وہ تمہارے لئے بے مقصد ہیں کیونکہ ان کے اپنے اندر صلاحیتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

"اوہو مثلاً۔" میں نے تیکھی نگاہوں سے احمر جنیدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خصوصاً میں وسکن ڈیزل کی بات کرتا ہوں۔ وہ بے صلاحیت انسان تو موجودہ مصر کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا قدیم مصر کے اسرار و رموز کیا جانے، ہارون دانش نے اس احمق کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی عقل رکھتا، مگر وہ اتنا احمق ہے اس کا شاید ہارون دانش کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہارون دانش نے اسے ایک اور شخص کے پاس بھیجا تھا، یہ شخص بلاشبہ کام کا آدمی تھا لیکن....." احمر جنیدی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن مجھے سنبھلنا پڑا، وہ جملے قابل غور تھے، دوسرا نام پہلے بھی میرے علم میں آ چکا تھا اور پھر وسکن ڈیزل کا مسئلہ، چنانچہ

میں سنبھل گئی میں نے کہا۔

"آپ اپنے بارے میں خود فیصلہ کریں مسٹر جنیدی آپ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"جو کچھ اب تک ہوا بے بی اس کی شکل بڑی محنت سے بدل گئی ہے حالانکہ وہ حقیقت نہیں تھی جو دیکھی گئی یا سوچی گئی۔"

"کہاں سے شروع کروں مسٹر جنیدی؟" میں نے کہا۔

"کہیں سے بھی شروع کر لو بے بی اس دن سے جب میں نے اور روشاق نے تمہیں اس مکان میں بھیجا تھا۔"

"نہیں آپ بہت پیچھے چلے گئے، میں اپنے والد کی خواب گاہ سے بات شروع کرتی ہوں جہاں آپ چوری کی نیت سے گھسے تھے۔"

"تم نے مجبور کر دیا تھا مجھے نشاء، تم نے....."

"وہ کیسے مسٹر جنیدی؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

جنیدی مجھے گھورنے لگا، میرے گفتگو کرنے کا انداز اسے بہت برا لگ رہا تھا، ویسے بھی ان حالات کا شکار ہونے کے بعد تقریباً تمام ہی لوگ جھنجھلاہٹوں میں مبتلا تھے اور سب ایک ہی کیفیت کا شکار تھے۔ وہ کہنے لگا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے تعاون کرو، میں بہت سے رازوں کی عقدہ کشائی کر دوں گا، مگر تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا بلکہ مجھے منع کر دیا جبکہ دوسری جانب سے روشاق اپنی شیطانی قوتوں سے کام لے کر برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں نشاء کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا، اب یہ دوسری بات ہے کہ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں روشاق اپنے ساتھ شیطانی قوت کے علاوہ افرادی قوت بھی رکھتا ہے۔ وہ نوجوان جس کا نام عسکری ہے روشاق کا ساتھی تھا اور وہ اکیلا ہی کیا نجانے کون کون اس کے لئے کام کرتا ہے، چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ روشاق تمہارے والد کی خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ سارا ریکارڈ اپنے قبضے میں کر لینا چاہتا ہے جو اس کے لئے کارآمد ہوا تو میں نے بھی وہی کوشش کی اور زخمی ہو گیا، اگر تم مجھ سے تعاون کر لیتیں نشاء تو روشاق سے پہلے میں ان اشیاء کا جائزہ لے لیتا جو ہماری رہنمائی کر سکتی تھیں، بہرطور اس کے بعد بھی میں ان لوگوں کے پیچھے لگا رہا جو کچھ روشاق نے کیا وہ میں نے بھی کر ڈالا، تم لوگ مارشل تک پہنچے میں بھی پہنچ گیا۔ میں نے اپنا طریقہ کار مختلف رکھا تھا، ہارون دانش کے بارے میں مجھے زیادہ واقفیت نہیں تھی بلکہ پوری تفصیل انہوں نے ہی مجھے بتائی تھی، مثلاً تمہارا ایک کاٹیج میں داخل ہو کر ان تابوتوں کو دیکھنا، جن میں خود ہارون دانش موجود تھے اور اس کے ساتھ ہی قدیم مصری تاریخ کی ایک محافظ روح ان کی نگرانی کے لئے موجود تھی، ہارون دانش نے تم لوگوں کو وسکن ڈیزل کے پاس بھیجا اور اس نے وسکن ڈیزل کے ذریعے کام لینا چاہا، وسکن ڈیزل نے کوشش کی کہ البرونوس نامی ایک شخص کے ہاتھوں وہ دونوں تابوت اس کاٹیج سے منگوائے جنہیں وہ الجزائر لے جانا چاہتا تھا تاکہ اس عظیم شخص کی لیبارٹری میں اس پر کچھ عمل کر سکے، یہ ساری باتیں مجھے ہارون دانش نے ہی بتائی تھیں، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان حالات کا شکار ہو کر وسکن ڈیزل بددل ہو چکا ہے اور یہ سوچنے لگا ہے کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے، اس نے بلاوجہ اپنے آپ کو ایک روگ لگا لیا ہے اور کیا کیا پوچھو گی مجھ سے نشاء ہارون دانش، ان تمام چیزوں سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر مجھ سے رجوع کیا ہے اور کہا ہے کہ ایک بار پھر میں تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کروں، حالانکہ اس وقت جب میں نے تمہیں مارشل سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، میرا یہی مقصد تھا کہ تمہیں اس مصیبت سے نکال لے جاؤں، جہاز نامعلوم مدت کے لئے سمندر میں لنگرانداز ہو گیا تھا اور گارساں کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کوئی بہتر صورت حال نکلنے کی کوئی امید نہیں ہے، اگر میں تم سے یہ تمام باتیں کرتا تو تم کبھی تیار نہ ہوتیں۔ چنانچہ میں نے تمہیں اغوا کرنے کا عمل شروع کیا، خیر تم

میرے بارے میں جو بھی سوچو سوچ لینا، میں تمہیں ایک پیشکش کرتا ہوں کہ سارے معاملات میں مجھ سے تعاون کرو، میں تاریخ کا ایک اہم باب دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں اور اب مجھے ہارون دانش کا سہارا حاصل ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو میں ایک لمحے تک کچھ سوچتی رہی، پھر میں نے کہا۔

"ایک سوال کا جواب دینا پسند کریں گے آپ؟"

"ہاں ہاں پوچھو؟"

"اے کے ہمدانی کو کس نے زندہ درگور کیا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"آپ نے مسٹر احمر جنیدی آپ نے؟"

"کس نے تم سے یہ بکواس کی ہے، کیا میں تمہیں اس طرح کا انسان نظر آتا ہوں اور تم نے اگر یہ بات سنی ہے تو میں تمہیں یہ بتادوں کہ یہ صرف روشاق کا کمینہ پن ہے، اس کے بارے میں تم آج نہیں سوچو گی بے بی تو کل سوچنا پڑے گا تمہیں، کیونکہ میں بھی حالات سے اس قدر لاعلم نہیں ہوں، روشاق بالکل فراڈ ہے، وہ ایک پراسرار کردار ہے جو تاریخ کے کسی گوشے میں نظر نہیں آتا، میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں، جبکہ میں نے اسے تاریخ میں تلاش کیا ہے لیکن اس نے اپنی تاریخ ہی چھپا رکھی ہے، اس کا کوئی کردار بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

میرے ہونٹوں پر پھر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے کہا۔ "اور میری تاریخ کیا ہے مسٹر احمر جنیدی؟"

میرے اس سوال پر احمر جنیدی خاموش ہو گیا، عدنان شنائی بھی بالکل خاموش بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا، احمر جنیدی کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے تاثرات نظر آرہے تھے اس نے عدنان شنائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا عدنان شنائی کہ اس لڑکی کو کچھ سمجھانا بیکار ہی ہے، تم نے ہی ضد کی تھی حالانکہ میں نے ہارون دانش سے بھی انکار کیا تھا، میں نے اس سے کہا تھا کہ نشاء ماننے والوں میں سے نہیں ہے، وہ ایک بھٹکے ہوئے ذہن کی مالک ہے جسے شاید اب دنیا میں کسی پر بھی اعتماد نہیں رہ گیا۔"

ایک دم سے عدنان شنائی بول اٹھا۔ "نشاء، جو کچھ کہا جارہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے، تم انتہاء پسند ہو اور اپنی انتہا پسندی میں ہی تم نے اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں، اگر شروع ہی میں تم ہم سے تعاون کر لیتیں تو نہ اے کے ہمدانی زخمی ہوتا اور نہ ہارون دانش کو اس قدر الٹ پھیر کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ وہ ہماری مدد کرتا کیونکہ جیسا کہ اب دیکھا گیا ہے کہ وہ ہوا میں شامل ہے اور یقینی طور پر اس کی کوئی اہم وجہ ہوگی، جو ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکی، وہ اگر چاہتا تو ہمارے شانوں پر بھی سفر کر سکتا تھا۔ لیکن کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔"

"سنیں مسٹر احمر جنیدی اس وقت بھی میں نے آپ سے تعاون نہیں کیا اور آج بھی شاید میں یہ نہ کر سکوں، میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میرا مصرف کیا ہے، میرا مقصد کیا ہے؟ میں چاروں طرف نہیں دوڑ سکتی، بہت سے لوگ مجھ سے تعاون کرنے کی درخواست کر رہے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں جب تک مجھے میری اپنی تفصیل نہیں معلوم ہو جاتی میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی، جو شخص بھی یہ کام کرے گا یو سمجھ لیا جائے میں سوچے سمجھے بغیر اس کی غلامی کر لوں گی۔"

"تمہاری تفصیل، بے بی تمہاری تاریخ اگر سامنے آجاتی تو بات ہی کیا تھی، نشاء، بہت کم وقت ہے، بہت ہی کم وقت، لیکن اس کے لئے تمہیں تعاون کرنا ہوگا، تم ہمارا ساتھ دو تو سب کچھ ہو جائے گا۔"

"کیسا تعاون ذرا مجھے بتایئے تو سہی مسٹر جنیدی؟"

"آنکھیں بند کر کے خلوص دل کے ساتھ ہماری ہر ہدایت پر عمل کرو۔"

"آج تک میں نے آنکھیں بند ہی رکھی ہیں اور جب بھی آنکھیں کھولیں کوئی نہ کوئی نقصان اٹھالیا۔"

"اس کی وجہ جانتی ہو؟"

"نہیں جانتی۔"

"ابھی تمہاری آنکھیں کھولنے کا وقت نہیں آیا

ہے۔ جب تمہاری آنکھیں کھلیں گی تو تمہاری نگاہوں کے سامنے اتنا کچھ ہوگا کہ یقین نہ کر پاؤں گی۔"

"شاید، اسی وقت مسٹر جنیدی، اسی وقت میں لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں کہ میری زندگی پر اتنے سارے لوگوں کی اجارہ داری کیوں کر ہو گئی ہے، کیا سمجھتے ہیں وہ اپنے آپ کو، اگر باپ کی بات کرتے ہیں آپ تو آپ یقین کیجیے کہ اب مجھے اس نام سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، میری ماں کے بارے میں مجھے پتہ چل چکا ہے کہ وہ بھی تاریخ کے کسی گوشے میں گم ہے اور جس عورت نے مجھے ماں کہہ کر بہلایا وہ میری ماں نہیں تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس طرح کے شواہد بھی ملے کہ مسٹر ہارون دانش بھی میرے باپ نہیں ہیں، کیا سمجھے، اگر وہ میرے باپ ہوتے تو ان خوف ناک حالات میں مجھے تسلی دینے کے لئے مجھ تک ضرور آتے۔"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے نشاء۔" احمر جنیدی نے کہا۔

"کیا وجہ؟"

"ہو سکتا ہے ہارون دانش اپنے آپ کو چھپائے رکھنا چاہتا ہو، اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ روشاق یا کوئی اور بھی اس کی تاک میں ہو، ہو سکتا ہے یہ تاریخ کا حصہ نہ ہو۔"

"تاریخ تاریخ تاریخ، کون سی تاریخ کی بات کرتے ہیں آپ، اس تاریخ نے تو ویسے ہی طور پر مجھے دیوالیہ کر دیا ہے، پاگل ہو گئی ہوں میں، آخر کون سی تاریخ اور کیسی تاریخ۔"

احمر جنیدی نے عدنان شنائی کا چہرہ دیکھا اور عدنان شنائی نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے تمہارا خیال احمر، بس یہاں پر بات ختم کر دو، لیکن یہ پیشکش کرتے جاؤ کہ جب بھی اس کی سمجھ میں کوئی بات آجائے تو یہ ہم سے رجوع کر سکتی ہے، کیا سمجھے، بے بی ہم تمہارا انتظار کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ میں ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

نجانے کب تک میں ان باتوں پر غور کرتی رہی، میں سوچ رہی تھی کہ جو انکشافات انہوں نے کئے ہیں اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے کیا ہارون دانش ان تک پہنچے ہیں، لیکن میں کیا کروں، کیا کرنا چاہئے مجھے، میں کسی کی ہدایت پر عمل نہیں کروں گی، وسکن ڈیزل کے پاس مجھے میرے پاپا نے بھیجا تھا۔ جب میرا باپ ہی کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پایا تو میں جو دنیا سے اس قدر دور اور ناتجربے کار ہوں، میں کیا فیصلے کر سکتی ہوں، جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

اچانک ہی میں نے عسکری کو دیکھا جو میری طرف آرہا تھا، کیونکہ گارساں کے احکامات کے مطابق ہر اس شخص کو اپنی عورت کے ساتھ رہنا تھا جس نے کسی عورت کا انتخاب کر لیا تھا۔ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا تھا جو تکلیف دہ ہوتا لیکن اس کے امکانات تھے کہ کسی بھی وقت کوئی بری بات ہو سکتی ہے، بہت سے ایسے نوجوان جن کا تعلق کسی لڑکی سے نہیں ہو پایا تھا کینہ توزی کا شکار نظر آتے تھے، اس طرح عسکری کا میرے پاس ہونا بھی میرے لئے ایک مجبوری بن گیا تھا۔

اس وقت میں بہت منتشر تھی۔ یہ دونوں میرا سکون تہہ و بالا کر گئے تھے عسکری کا آنا مجھے برا نہیں لگا۔ میں نے ذہن کو ان دونوں کی باتوں سے ہٹالیا۔ اور پراسرار جہاز کے کپتان ڈگلر کے بارے میں سوچنے لگی کیسے انوکھے تھے وہ سب، جولین، معصوم ایلنا، سب لمحے ایکدم یاد آگئے تھے عسکری میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ جب کئی منٹ تک اس نے کوئی بات نہیں کی تو میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ بہت سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"نہیں نشاء۔ پریشان ہوں۔"

"مزید سوال کروں۔" اس نے اپنا انداز برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

"اوہ نشاء۔ براہ کرم یہ رویہ نہ رکھو۔"

"بہتر۔ تم پھر آرام کرو۔"

"میری بات تو سنو۔" وہ بولا۔

"تو تم نہیں سنا رہے۔"

"میں اس سے مل کر آرہا ہوں۔ میرا مطلب ہے سارن اوگلے سے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گارساں کے مخالفوں میں سے ہوں اور سارن اوگلے کی بصیرت سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں نے گارساں کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی۔ جب وہ کسی قدر متوجہ ہوا تو میں نے اسے محتاط طریقے سے اسے پوری تفصیل بتائی تو وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں پاگل ہوں۔

"گویا اس نے آپ کی باتوں کو سچ نہیں مانا۔"

"اس نے اس کا اظہار نہیں کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ ایسا کوئی جہاز کسی اور کو کیوں نہیں نظر آیا۔ میں نے اسے پوری طرح یقین دلایا کہ میں ہوش مند ہوں اور کسی سازش کے تحت اس سے یہ سب نہیں کہہ رہا ہوں تب وہ بہت پرجوش ہوگیا۔"

"ہاں پھر....." اب مجھے بھی عسکری کی باتوں سے دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"وہ کہنے لگا کہ ہم اس وقت اس جہاز پر چلیں۔ بمشکل میں نے اسے ایک پروگرام دیا اور آمادہ کرلیا کہ یہ کام ہم کل کریں گے۔"

"گویا وہ وہاں جائے گا۔"

"ہاں۔"

"لیکن۔"

"ہاں، میرے ساتھ۔"

"صرف تمہارے ساتھ۔ میرا مطلب ہے میں ساتھ نہیں ہوں گی۔" عسکری میری صورت دیکھتا رہا۔

پھر ہنس پڑا۔ مجھے طیش آ گیا۔

"کیوں ہنسے۔" میری غراہٹ ابھری۔

"تمہیں کسے چھوڑ سکتا ہوں میں۔ ویسے وہ جہاز میری زندگی کی ضمانت خوب بن گیا ورنہ بات نبھانی پڑتی اور خودکشی کرنی پڑتی۔"

"اب مجھے ہنسی آرہی ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"وہ کیوں.....!"

"شاید تم نے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی تھی جو پوری ہوگئی۔ ویسے خودکشی تم جیسے لوگ کبھی نہیں کرسکتے۔" اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور تھوڑے فاصلے پر زمین پر دراز ہوگیا میں نے بھی ایک جگہ منتخب کرلی میں نے اسے احمر جنیدی وغیرہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے عسکری کو آواز دی۔

"سو گئے مسٹر عسکری۔"

"نہیں۔ کیوں۔"

"ایک سوال میرے ذہن میں آیا ہے۔"

"بتاؤ کیا۔"

"کیا روشاق کو بھی جہاز کے بارے میں بتاؤ گے۔"

"اسے کیوں.....!"

"میرا مطلب ہے۔ اسے ہر بات بتانا تمہاری ڈیوٹی تو نہیں ہے۔ میں نے کہا اور عسکری ایکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر دوبارہ اپنی جگہ لیٹ گیا مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے میری بات بہت بری لگی ہے۔

میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔ پھر صبح کی روشنی سے آنکھ نہیں کھلی تھی بلکہ وہ ہولناک چیخیں جاگنے کا سبب بنی تھیں جو بے حد دہشت ناک تھیں کوئی کرب سے بری طرح چیخ رہا تھا پھر کچھ دوسری چیخیں بھی ان چیخوں میں شامل ہوگئیں۔ سوتے ہوئے لوگ بھی سہم سہم کر جاگ گئے تھے اور کچھ جانے بوجھے بغیر چیخنے لگے تھے۔

عسکری بھی اچھل کر بیٹھ گیا پھر ہم دونوں نے بھی وہ بھیانک منظر دیکھ لیا ہم کسی قدر بلند جگہ پر تھے اس نے ہم سے کچھ فاصلے پر وہ خونی منظر دیکھ لیا۔ احمر جنیدی زمین پر لوٹیں لگا رہا تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ سے تشنجی انداز میں اس خونخوار بلی کو اپنے نرخرے سے جدا کرنے کی کوشش کررہا تھا جس نے جنیدی کے چہرے اور گردن

کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا جنیدی شدید کوشش کے باوجود بھی بلی کو خود سے جدا نہیں کرپا رہا تھا۔

پھر بہت سے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ میں نے عدنان شائی کو دیکھا جس نے بیساکھی سے بلی کی کمر پر بھرپور ضرب لگائی تھی اس کے ساتھ ہی کچھ بہادر لوگوں نے بلی کو کمرے سے پکڑ کر جنیدی کے اوپر سے کھینچنے کی جدوجہد کی، بلی کی خوف ناک غراہٹوں کے ساتھ انسانی چیخیں بھی بلند ہوئیں اور پھر بلی کئی انسانوں کے سروں سے گزر کر برق رفتاری سے ایک طرف دوڑ گئی۔ کسی نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میرا سارا وجود منجمد ہوگیا تھا۔ سانس اتنے بوجھل ہوگئے کہ سینہ پھٹنے لگا۔ خونخوار بلی نے اپنے مزاج کے مطابق عمل کیا تھا عسکری بھی اب میرے پاس نہیں تھا وہ بھی ادھر ہی دوڑ گیا تھا جہاں جنیدی اب لوگوں کے درمیان تھا اور نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ یہ سوچنا بھی غیر ضروری تھا کہ یہ عمل بھی شیطان روشاق ہی کا تھا۔ وہ منحوس شیطان دہشت پھیلائے ہوئے ہے۔ اسے اس کی وحشت ناکی سے روکنے والا کوئی نہیں ہے شاید خود گارساں بھی نہیں کیونکہ وہ بھی جانتا ہے کہ یہ بھیانک بلی روشاق کی ہے۔ اوہ! وہ بلی ہے بھی یا نہیں۔ مجھے وہ ہمیشہ ایک ناپاک روح ہی لگی تھی۔

مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا چنانچہ میں وہیں بیٹھ گئی۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ جنیدی رات کو میرے پاس آیا تھا۔ روشاق جیسے شیطانی قوتوں کے مالک کو اس کا ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ جنیدی نے مجھ سے کیا باتیں کی ہیں۔ اسے یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہوگا کہ کہیں میں جنیدی سے مل نہ جاؤں۔ چنانچہ جنیدی روشاق کا شکار ہوگیا، بظاہر تو یوں لگتا تھا جیسے جنیدی کا حشر بھی اے کے ہمدانی جیسا ہی ہوا ہے۔ بلکہ ممکن ہے بلی نے اس کا نرخرہ چبا کر اسے ختم ہی کردیا ہو، میری نگاہیں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ لوگ جنیدی کو وہاں سے اٹھا کر لے جارہے تھے میں دیکھتی رہی پھر میں نے عسکری کو واپس آتے دیکھا۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا۔

"جنیدی کو قتل کردیا گیا۔"

میرے سارے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"قتل۔"

"ہاں بلی نے اس کے نرخرے کو چباڈالا۔" وہ ہلاک ہوگیا ہے۔

"میرے خدا۔ روشاق نے اسے بھی راستے سے ہٹادیا۔"

"سو فیصدی۔"

"وہ جسے چاہے مار سکتا ہے عسکری۔"

"شاید.....!"

"اوہ، اب کیا ہوگا؟ ہم سب ہی اس کے شکار ہیں۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔" میری آواز رندھ گئی۔

"جنیدی خود بھی بہت خطرناک ہے۔ اس نے اے کے ہمدانی کا جو حشر کیا وہ تمہیں یاد نہیں نشا۔" عسکری نے کہا۔

"نہیں۔ وہ اس بات سے انکار کرتا ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کون۔؟" عسکری چونک کر بولا۔ اور میں سنبھل گئی۔ میں نے عسکری کو رات کی بات نہیں بتائی تھی۔

"کون نشاء!" عسکری نے پھر پوچھا۔

"عسکری۔ میرا ذہن بے قابو ہورہا ہے۔ میں نہیں جانتی میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

"اتنا زیادہ اثر نہ لو نشاء ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان میں کسی بھی وقت کوئی بھی حادثہ ہوسکتا ہے۔"

میں گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ دم گھٹتا جارہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ "سارن اوگلے سے تو کوئی اور بات نہیں ہوئی۔"

"ہاں۔ میں تمہیں ابھی اس بارے میں بتانے والا تھا۔ وہ ابھی مجھے ملا تھا۔ میرے پروگرام سے پوری طرح متفق ہے لیکن کہتا ہے کہ اس حادثے کے بعد فوری سرگرمی مناسب نہیں ہے کہیں کسی کی نگاہوں میں نہ آجائیں۔ ویسے وہ مجھ سے زیادہ پرجوش ہے۔"

میں بدستور الجھی رہی۔ بری طرح دل خراب ہورہا تھا۔ دماغ پریشان تھا لوگ ٹولیاں بنا کر اس حادثے کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ پھر میں نے گارساں کو بھی ان لوگوں کے درمیان دیکھا۔ عسکری نے کہا۔

"آؤ..... جنیدی کے بارے میں معلوم کریں۔"

"کیا....."

"وہ یقیناً مرچکا ہے۔ دیکھیں اسے۔"

"میں نہیں دیکھ سکوں گی۔"

"نہ دیکھنا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن صورت حال کا پتہ چلتے رہنا چاہئے۔ دوسروں کا کیا ری ایکشن ہے پتہ تو چلے۔" ہم لوگوں کے درمیان پہنچ گئے۔ عدنان ثنائی ایک سنجیدہ اور بردبار آدمی تھا لیکن میں نے اسے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا اس نے گارساں سے کہا۔

"آپ نے اس جزیرے پر اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا ہے لیکن ہمارے ساتھ انصاف کون کرے گا۔ میرے دوست کو قتل کردیا گیا آپ حکمران ہیں بتائیں قاتل کو سزا کون دے گا۔ یہ کیسی بادشاہت ہے مسٹر گارسا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔"

"لیکن اسے تو ایک جانور نے ہلاک کیا ہے۔" گارساں نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں اس جانور کا مالک کون ہے۔ وہ اس کی موت کا ذمہ دار ہے وہ میرے دوست کا قاتل ہے۔"

گارساں پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر اس نے کہا۔

"ہاں۔ ایک حد تک بات درست ہے۔ وہ خونخوار بلی اپنے مالک کے ساتھ یہاں تک آئی ہے اسے سنبھالنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ بلاؤ اس شخص کو جو بلی کا مالک ہے۔ میں بادشاہ ہوں۔ انصاف کروں گا۔"

گارساں انصاف کرنے پر تل گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد روشاق کو اس کے سامنے پیش کیا گیا وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے بھتیجے۔ چچا کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"مارشل کا سفر ختم ہوگیا ہے۔ اب تم گریٹ کنگ کی مملکت میں ہو۔ گارساں کے دربار میں ہو۔ ہر پرانی بات کو بھول جاؤ۔ کیا نام ہے تمہارا۔؟" گارساں نے کہا۔

"تاریخ کبھی فنا نہیں ہوتی بھتیجے۔ وقت کی کتاب میں جو تحریر ہوگیا سو ہوگیا۔ خیر یہ بھی وقت کا ایک حصہ ہے اس جزیرے کی بھی کوئی تاریخ ہونی چاہئے چلو ٹھیک ہے۔ مجھے حکم دو میں حاضر ہوں۔"

"خونی بلی تمہاری ملکیت ہے۔"

"وہ میری دوست ہے۔ دوست دوست ہوتے ہیں، ملکیت نہیں ہوتے۔ دوستوں کو جب ملکیت سمجھ لیا جاتا ہے تو تباہیوں کو آواز دی جاتی ہے۔"

"میں صرف اپنی بات کا جواب سننا پسند کرتا ہوں۔ وہ بلی تمہاری ملکیت ہے۔"

"نہیں۔ دوست ہے میری۔ اپنے فیصلے وہ خود کرتی ہے۔ ان میں میرا کوئی دخل نہیں ہوتا۔"

"اس نے میری رعایا کے ایک شخص کو قتل کردیا ہے۔"

"اس کے لئے یہ ضروری ہوگا وہ بہتر سمجھتی ہے۔ میں نہیں جانتا۔" روشاق کے اس لاپروا بانہ جواب نے گارساں کو برافروختہ کردیا۔

"اس شخص کو رسیوں سے باندھ کر میرے سامنے لاؤ۔ یہ خود کو بہت بڑا انسان سمجھتا ہے۔ اسے بادشاہوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔" گارساں وہاں سے ہٹ گیا اس کے آدمیوں نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ روشاق نے اپنی گرفتاری پر ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اسے بڑی ذلت کے ساتھ گارساں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

گارساں نے کہا۔ "وہ بلی تمہاری پالتو تھی۔ مارشل پر اسے ایک مسافر کی حیثیت حاصل نہ ہوتی ہوگی۔ اسے صرف تمہارے پاس دیکھا گیا، اس نے

جو کچھ کیا اس کے ذمہ دار صرف تم ہو اور تمہیں اس کے عمل کی سزا بھگتنا ہوگی۔"

روشاق نے مکاری سے گردن جھکائی، اور بولا۔ "عظیم گارساں کی مملکت کا مجرم گارساں کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ ناانصافی، نہ سمجھ میں آنے والی ہے۔"

"تمہاری پالتو بلی نے ایک انسان کو ہلاک کیا ہے۔"

"وہ میری پالتو نہیں ہے۔ صرف دوست ہے۔ سزا اسے ملنی چاہئے، میں نے تو مرنے والے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"بلی کہاں ہے۔"

"وہ اسی وقت بھاگ گئی تھی۔"

"دوست ہے وہ تمہاری۔"

"ہاں عظیم بادشاہ۔"

"گہری دوست۔"

"میرا یہی خیال ہے۔"

"تب تو جب اسے علم ہوگا کہ اس کے جرم کی سزا اس کا گہرا دوست بھگت رہا ہے تو وہ اپنے جرم کی سزا بھگتنے آجائے گی۔"

"میں نہیں جانتا۔ لیکن سزا اسے ہی بھگتنی چاہئے۔"

"اس خونی جانور کو سزا پانے کے لئے ہونا تمہاری ذمہ داری ہے۔ وہ نہ آئی تو اس کی سزا تمہیں بھگتنا ہوگی۔"

"میں عظیم گارساں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہوں....."

"وہ صرف ایک جانور نہیں ہے۔ وہ ایک مقدس روح ہے۔ اس کی بے حرمتی کرنے والے مشکلات میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور میری آرزو ہے کہ گارساں کی بادشاہت پرسکون رہے اور عظیم بادشاہ، شان سے یہاں حکومت کرے۔ میں ایک اور انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا انکشاف۔"

"مقدس روح نے ہی عظیم بادشاہ کی یہاں تک رہنمائی کی ہے۔ اور یوں نہ ہو کہ مقدس روح بادشاہ سے ناراض ہوکر اسے نقصان پہنچادے۔"

گارساں اور غضب ناک ہوگیا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو کہتا ہے کہ ایک معمولی بلی ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"میں اس عظیم گارساں کی زندگی کی دعائیں کرتا ہوں۔" روشاق نے بدستور مکاری سے کہا۔

"اپنی سوچ کا انداز بدل لے کیونکہ تیرا واسطہ گارساں سے ہے، سن اسے ہمیشہ تیرے پاس دیکھا گیا ہے اور تو اسے اپنا دوست کہتا ہے، وہ مقدس روح ہو یا ناپاک روح اسے واپس بلانا تیری ذمہ داری ہے اور اگر تو یہ ذمہ داری پوری نہ کرسکا تو سمجھ لے کہ گارساں کے عتاب کا شکار ہوگا اور جو گارساں کے عتاب کا شکار ہوتے ہیں زندگی ان سے بہت دور چلی جاتی ہے۔" گارساں حقارت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"وہ آجائے گی، اسے ہر قیمت پر واپس آنا ہوگا، اگر وہ واپس نہ آئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی دوستی میں سچائی نہیں تھی۔" روشاق نے بڑبڑاتی ہوئی آواز میں کہا، پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالئے۔ چہرہ اوپر کیا اور دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ دیئے، کچھ دیر تک وہ خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسرے لوگ دلچسپی سے اس کی یہ تمام حرکتیں دیکھ رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کرکے بولا۔

"وہ سچی دوست ہے اور اس نے کبھی دوستی کو داغدار نہیں کیا، وہ آگئی۔"

تمام گردنیں روشاق کی انگلی کے اشارے کی طرف مڑ گئیں، تب انہوں نے دیکھا کہ وہ خونخوار بلی دبے قدموں اسی طرف آرہی تھی، یہ سب بہت دل چسپ اور انوکھا تھا، بے شک ایک انسان ہلاک ہوگیا تھا اور اس کی ہلاکت کا سبھی کو افسوس تھا، لیکن اب جو کچھ ہورہا تھا وہ بہت دلچسپ اور انوکھا تھا۔ خود گارساں کی

آنکھوں میں بھی دل چسپی کے آثار نظر آرہے تھے، اس نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا اور دونوں دوڑ کر بھری ہوئی آٹومیٹک رائفلیں لے آئے، ان میں سے ایک رائفل گارساں کو پیش کردی گئی اور گارساں رائفل چیک کرنے لگا، میں نے روشاق کے چہرے کی جانب دیکھا، کمبخت پتھرایا ہوا کھڑا تھا، اتنا مطمئن اور اتنا پرسکون جیسے اسے کسی بات کی پرواہ نہ ہو، میرے نزدیک کھڑا عسکری سرگوشی میں بولا۔

"وہ مطمئن ہے اور میں تمہیں بتاؤں....." وہ خاموش ہوا تو میں مضطربانہ انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگی، پھر بولی۔

"چپ کیوں ہوگئے عسکری؟"

"نہیں میں یہ بتا رہا تھا کہ گارساں یقیناً اس بلی کو ہلاک نہیں کرسکے گا۔"

میں نے عسکری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، خود میرے بدن میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس شیطانی بدروح کی ناقابل سرگرمیوں کی میں خود گواہ تھی، مجھے بھی یہی احساس ہو رہا تھا کہ گارساں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، ویسے گارساں بھی مزے کا آدمی تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عجیب وغریب مسخری فطرت کا مالک، ورنہ ایک عام سی بلی کیا حیثیت رکھتی تھی، البتہ ہماری نگاہ میں اس کی جو حیثیت تھی ہم اسے جانتے تھے، بلی آہستہ آہستہ قریب آئی اور پھر اچانک اچھل کر ایک چٹان پر چڑھ گئی، چٹان بالکل سامنے تھی، گارساں دل چسپی کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے پرمزاح لہجے میں کہا۔

"واقعی بڑی مضبوط اور ناقابل یقین دوستی ہے، لیکن میرے بزرگ دوست بلی کو سزا ضرور ملے گی، کیونکہ مستقبل میں وہ کسی اور کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے اور کسی بھی مجرم کو ایک بار زندگی کا فائدہ دینا دوسروں کے لئے ہلاکت کا سبب بنتا ہے اس لئے اسے ہلاک کیا جاتا ہے۔"

"مقدس روح کسی غیر ضروری انسان کو نقصان نہیں پہنچاتی وہ صرف وہ عمل کرتی ہے جو دوسروں کے حق میں بہتر ہو، اور اگر میں بتادوں کہ فرانسیسی افسر پر حملہ نہ ہوتا تو گارساں کو آزادی ملنا مشکل ہوجاتی اور اگر گارساں کو آزادی نہ ملتی تو اب تک سمندر میں کھڑے بے شمار افراد ہلاک ہوجاتے، خیر شہنشاہ کا اپنا عمل ہوتا ہے، بھلا رعایا میں کس کی مجال ہے کہ وہ شہنشاہ کو اس کے عمل سے روکے۔"

گارساں بھی اپنی فطرت کا ایک ہی تھا، اس نے اس گفتگو پر بھی کان نہ دھرا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"تمہارا شہنشاہ اس جزیرے پر ہونے والے پہلے جرم کی مجرم کو سزائے موت دیتا ہے اور اس کے بعد ہر ذی روح کے جرم کی یہی سزا ہوگی، اسے یاد رکھا جائے۔"

یہ کہہ کر گارساں نے بلی کا نشانہ لیا اور گولیوں کی آواز گونج اٹھی، بلی اپنی جگہ سے اوپر اچھلی اور دوبارہ واپس چٹان پر آ گئی۔ گارساں کا نشانہ خطا ہوگیا تھا، تب اس نے جھلا کر بلی پر گولیوں کی بارش کردی، لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بلی ادھر ادھر اوپر نیچے اچھل کر گارساں کی چلائی ہوئی گولیوں سے بچ رہی تھی۔ گارساں کو ناکام دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی نے جو دوسری رائفل سنبھالے ہوئے تھا اندھا دھند فائرنگ شروع کردی، لیکن حیرت انگیز مناظر دیکھنے میں آئے، بلی آسانی سے چٹان سے نیچے کود کر اپنی جان بچا سکتی تھی، لیکن وہ چٹان ہی پر جمی ہوئی تھی اور چھلانگیں لگا کر خود کو گولیوں سے بچا رہی تھی یہاں تک کہ دونوں رائفلوں کا میگزین ختم ہوگیا اور گارساں منہ دیکھتا رہ گیا، بلی پھر چٹان کے اوپر بیٹھ گئی، لوگوں کے حلق سے طرح طرح کی بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی بلی نے ایک خوف ناک غراہٹ کے ساتھ نیچے چھلانگ لگائی چند قدم گارساں کی جانب بڑھی اور میں نے بغور دیکھا کہ ایک لمحے کے لئے گارساں کا چہرہ بھی متغیر ہوا تھا، لیکن بلی چند قدم چلنے کے بعد رکی اس نے زمین پر دونوں پنجے جمائے اور زمین کھودنے لگی، پھر دوسرا منظر بھی بہت دل چسپ تھا۔

بلی نے اپنی کھودی ہوئی جگہ پر گندگی کی اور واپس مڑ گئی۔ وہ برق رفتاری سے اس چٹان کے عقب میں جارہی تھی اور پھر وہ ایک دم واپس پلٹی اس بار اس کا انداز بے حد خوف ناک تھا، وہ اگر چاہتی تو گارساں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا بھی وہی حشر کرسکتی تھی جو اس نے احمر جنیدی کا کیا تھا۔ گارساں نے فوراً ہی گردن جھکالی تھی اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تھی، ادھر روشاق کے چہرے پر ایک مکروہ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی، جب بلی بہت دور نکل گئی تو گارساں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اسے ایک مفرور مجرم قرار دیا جاتا ہے اور اب کسی بھی وقت وہ جزیرے کی فضا میں نظر آئے تو اسے ہلاک کردیا جائے۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے اور جیسے دربار برخاست کردیا، البتہ روشاق نے آگے بڑھ کر کہا۔

"معزز شہنشاہ، میرے لئے کیا حکم دیتا ہے۔"

"میری آنکھوں سے دور ہوجاؤ۔" گارساں کسی قدر خجل نظر آرہا تھا، روشاق مسکرا کر واپس مڑ گیا، تب عسکری نے مجھے اشارہ کرکے کہا۔

"آؤ واپس چلیں اب یہاں رکنا بے مقصد ہی ہوگا۔"

"تم جانا چاہو تو جاؤ، میرے لئے کیا ضروری ہے کہ میں ہر لمحہ تمہارا ساتھ دوں۔" نجانے کیوں مجھے عسکری کے یہ الفاظ پسند نہیں آئے تھے، وہ شانے ہلا کر خاموش ہوگیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر احمر جنیدی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور مجھے اس کے وہ تمام الفاظ یاد آرہے تھے، اگر سچ مچ ہارون دانش نے احمر جنیدی پر اعتماد کیا تھا تو اس کا خاتمہ میرے راستے روکنے کے مترادف تھا اور یہ بات میں اچھی طرح جانتی تھی کہ روشاق کے علاوہ اس کا کوئی محرک نہیں ہوسکتا، لیکن اس کے باوجود میری عقل اس وقت یہی کہتی تھی کہ مجھے روشاق کے سلسلے میں نرم ہی رہنا چاہئے، اب اور کوئی نقصان اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ شیطان کو قابو میں رکھنے کے لئے شیطانی دماغ کا استعمال ہی ضروری تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے عدنان ثنائی کو غمزدہ انداز میں ایک چٹان کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا، پھر کچھ اور کارروائیاں ہوئیں، غالباً گارساں ہی کا حکم تھا کہ اس کی لاش ضائع کردی جائے کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد اس کی لاش سمندر میں پھینک دی گئی تھی۔

وقت گزرنے لگا، لوگ پھر اپنے معمولات میں مصروف ہوگئے تھے۔ عسکری میرے تلخ الفاظ کے باوجود میرے ساتھ ساتھ ہی تھا اور میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے بہت سے احساسات ہو رہے تھے، عدنان ثنائی اور احمر جنیدی سے بڑے واقعات وابستہ تھے، احمر جنیدی چلا گیا تھا اور اب عدنان ثنائی بیٹھا ہوا تھا، اچانک ہی میں نے عسکری سے کہا۔

"مجھے ایک بات کا جواب دو عسکری؟"

"ہاں بولو۔" اس نے برا مانے بغیر کہا۔

"کیا اب بھی اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے مشن پر روانہ ہوجائیں۔"

"اب....." عسکری نے کسی قدر ہچکچائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں..... کیا بات ہے، کوئی اور فیصلہ کرلیا تم نے، تم گریز کررہے ہو۔"

"نہیں بالکل نہیں، البتہ ایک بات ضرور محسوس کررہا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"میرے خیال میں گارساں روشاق سے دشمنی مول لے کر کچھ پریشان سا ہے، روشاق کے بارے میں تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا ہر عمل ناقابل یقین ہوتا ہے اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں گارساں کی تباہی کی پیشگوئی کردی ہے اور اگر سارن اولگلے اپنے مشن میں کامیاب ہوجاتا ہے تو تم بتاؤ نشاء کیا یہ پیشگوئی درست نہیں ہوجائے گی، مطلب یہ کہ بقول روشاق کے اس نے مقدس روح کی توہین کی ہے اور تم نے اس کمبخت بلی کو دیکھا، کیا بات ہے، واقعی وہ ایک بری روح ہے، سمجھ

رہی ہو نا تم۔"

"ہاں یہ تو ہے، واقعی تمہاری اس بات میں وزن ہے، لیکن ایک بات بتاؤ، تم بھی تو اسے بدروح اور برا بھلا کہہ رہے ہو؟"

"میں....." عسکری ایک دم ہنس پڑا۔

"ہاں کیوں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں بتاؤں خوف نام کی کوئی چیز اب میرے دل میں نہیں رہ گئی، خوف ہمیشہ زندگی کے لئے ہوتا ہے اور مجھے زندگی سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، البتہ ایک احساس ضرور ہے، وہ واقعی بے حد پراسرار اور خطرناک ہے، کہیں اسے ہمارے عمل کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔"

"یقین کرو، مجھے بھی شدت کے ساتھ یہ احساس ہے، لیکن بہر طور ہمیں ہر قیمت پر یہ کرنا ہے۔"

"ہاں اب تو اس سے گریز کیا ہی نہیں جا سکتا، اچھا تو پھر کیا کہتی ہو، میں اس سے ملاقات کروں؟" عسکری نے عجیب سے انداز میں پوچھا، میں سمجھ نہیں پائی تھی چنانچہ میں نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس سے؟"

"سارن او گلے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا اور عسکری میرے پاس سے چلا گیا۔ میں کوئی سنسان گوشہ تلاش کرنے لگی، دماغ پھٹا جا رہا تھا، میں سکون چاہتی تھی۔ کافی دور ایک جگہ منتخب کر کے میں ایک چٹان سے ٹک کر بیٹھ گئی، یہاں سے سمندر نظر آ رہا تھا اور اس پر آہستہ آہستہ ہچکولے لیتا ہوا مارشل، دل میں عجیب وغریب خیالات آ رہے تھے آخر اب ہوگا کیا، وقت اس کہانی کو کس طرح آگے بڑھائے گا۔

اچانک ہی کچھ فاصلے پر آہٹ سی ہوئی اور میں چونک کر پلٹی تو میں نے روشاق کو دیکھا وہ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میرے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں، خدا خیر کرے، یہ منحوس آدمی کسی خاص مقصد سے ہی میرے پاس آتا تھا۔

میں نے سہمی ہوئی نظروں سے روشاق کو دیکھا۔ اس منحوس کی مسکراہٹ بھی رگوں میں خون منجمد کرتی تھی۔ میرے پاس آ کر اس نے مہذب لہجے میں کہا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں مقدس پجارن۔"

میں نے ان الفاظ پر حیران نگاہوں سے اسے دیکھا، تو وہ جلدی سے بولا۔

"اگر تو اجازت دے۔"

بالکل غیر امتیازی طور پر میری گردن اثبات میں ہل گئی۔ وہ اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس سمیٹ کر بیٹھ گیا پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔ "تجھے اندازہ ہوگا کہ وقت کس طرح دلچسپ کہانیوں کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے کیا اب بھی تم ان واقعات سے متاثر ہوتی ہو۔"

"مسٹر روشاق۔ میں، میں۔" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"آہ کتنا عجیب لگتا ہے مجھے جب تو خود آشنا ہوتی تو تیری آواز میں قہر وغضب کی بجلیاں کوند رہی ہوں گی لوگ تیرے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ سے خوف زدہ ہوں گے تو کچھ تو کہے گی وہ ایک مقدس قانون ہوگا ٹھوس اور اٹل۔"

میں نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ روشاق کی باتوں کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایسی باتیں اکثر کرتا تھا۔ مجھے نئے نئے ناموں سے پکارتا تھا اس وقت جزیرے کے ویرانے میں مجھے وہ پراسرار عورت نظر آئی تھی تو سجدہ ریزی کے عالم میں اس نے کچھ ناقابل فہم الفاظ کہے تھے۔

"آپ۔ آپ ٹھیک ہیں مسٹر روشاق۔" میرے منہ سے بے معنی الفاظ نکلے جنکا میرے ذہن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"ہاں۔ میرا کیا بگڑے گا۔ کج فہم خود اپنے لئے جہنم تیار کرتے ہیں۔"

"کون کج فہم۔؟" یہ سوال بھی بے اختیار

میرے منہ سے نکلا تھا۔

"بہت سے۔ یہ سمندری لٹیرا عقل کا اندھا میرا احسان بھول کر بادشاہی کے زعم میں مبتلا ہو گیا۔ میں نرم مزاج ہوں۔ لیکن، اسایانہ حورس۔ وہ میری طرح ٹالنے والوں میں سے نہیں ہے، دو لاکھ ایک سو اڑتالیس افراد اس کی توہین کا بدلہ لیں گے۔"

"دو لاکھ آٹھ سو اڑتالیس؟"

"نہیں۔ دو لاک ایک سو اڑتالیس۔"

"وہ کون ہیں۔"

"اسایانا حورس کے غلام۔ اس کے محافظ، تمہیں جہاز کے اصل کپتان روڈرکس کا حشر یاد نہیں رہا۔"

"روڈرکس۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ اس نے بھی کسی کے ایما پر اسایانہ حورس پر گولیاں چلوائی تھیں۔ اس کے بعد کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ یہ نیا انکشاف تھا۔ وہ پھر بولا۔

"گارساں نے اپنا غرور خود توڑ لیا۔ اب اسے معافی کہاں ملے گی۔ مشکل ہے، میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر میں نے کہا۔

"اور بلی نے جنیدی کو کیوں قتل کیا؟"

"ایک بات کہوں۔"

"بولو مسٹر روشاق۔"

"اس کا نام میں بھی احترام سے لیتا ہوں۔ دوسرے جو دل چاہے کہیں لیکن تم ہم ہی سے ایک ہو۔"

"تو پھر....."

"اس کا نام احترام سے لو۔"

"کیا کہوں اسے۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اور میں نے روشاق کا چہرہ بدلتے دیکھا۔ وہ جیسے شدید غصے میں آ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اس کی توہین نہ کرو۔ مستقبل میں تمہیں اس سے بہت سے معاملات طے کرنے ہیں۔"

"خیر چھوڑو۔ آپ نے مجھے جنیدی کی موت کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"اس نے قدیم مصر کے ماضی میں قدم رکھ دیا تھا۔" تاریخ نے اس کا پاؤں الٹ کر اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن قصور ہارون دانش کا ہے۔ وہ مسلسل کمزور سہارے تلاش کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود جانتا ہے کہ آخر کار اسے ان کا سامنا کرنا ہے جن سے وہ گریز کر رہا ہے۔" روشاق نے اعتماد سے کہا۔

"کاش آپ کی باتیں میری سمجھ میں آتیں۔"

"نہیں بے بی۔ تیری ناسمجھی ختم ہو گئی۔ بہت کچھ جاننے لگی ہے تو۔ چالاک ہو گئی ہے، مجھ سے وعدے کرتی ہے اور پھر سب کچھ چھپا لیتی ہے۔"

"کیا چھپایا ہے میں نے....."

"جنیدی کا نیا منصب۔ ویسے اس نے سچ بولا تھا۔ ہارون دانش نے وسکن ڈیزل سے مایوس ہو کر اسے اپنے ساتھ ملایا تھا۔ لیکن وہ اس قابل نہیں تھا۔"

"اوہ۔ اس لئے تم نے اسے قتل کر دیا۔"

"میں نے....." وہ چونک کر بولا۔

"جھوٹ بولو گے۔" میں نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"نہیں بے بی۔ اس کے قتل کے احکامات کہیں اور سے صادر ہوئے تھے۔"

"آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی مسٹر روشاق۔ اور آپ کیا سمجھتے ہیں جنیدی نے جو کچھ کیا تھا آپ خیال میں، میں فوراً آپ کو بتانے دوڑی آتی۔ میں نے اس کی باتوں پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اور سچ بتاؤں میں نے اس سے کوئی تعاون نہیں کیا صرف اس لئے کہ آپ نے اس کے لئے منع کیا تھا۔ ورنہ۔"

میں خاموش ہوئی تو وہ بے چینی سے بولا۔

"بولتی رہو بے بی۔"

"اپنے باپ کا نام سن کر مجھے فوراً اس کی باتوں پر ایمان لے آنا چاہئے تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اے کے ہمدانی پر حملے میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔"

"جو لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں ان پر تبصرہ آرائی بے کار ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہارون دانش ہی

اس کی موت کا سبب بنا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا، جبکہ اس کے ان الفاظ پر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ کیا اے کے ہمدانی مر گیا۔ روشاق پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ کمبخت کو نہ جانے کیا کیا آتا ہے۔ بہرحال میں نے فوراً کہا۔

"میں نہیں سمجھی مسٹر روشاق۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ اپنے باپ کے بارے میں سوچو جو اپنے غلط فیصلوں سے اپنی راہ میں مسلسل کانٹے بچھا رہا ہے۔ اسے ان باتوں سے کچھ نہیں ملے گا۔ بھلا تاریخ بھی کہیں بدلتی ہے۔ آنے والے وقت کو بدلا جاسکتا ہے گزرے وقت کو نہیں۔"

"میں ان سب سے نفرت کرتی ہوں مسٹر روشاق۔ آپ کیا ہیں۔ جنیدی کیا تھا، آنے والا وقت کیا ہوگا مجھے اب کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر میری زندگی اس جزیرے پر ختم ہو جائے تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔ میں زیادہ جینا بھی نہیں چاہتی۔"

روشاق آنکھیں بند کر کے عجیب سے انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "وقت کی گرد نے تیرے ذہن سے بہت سے نقش مٹا دیئے ہیں۔ سوچیں بھی لمحات کے دائرے میں آجاتی ہیں جب تیرے ذہن سے وقت کی گرد چھٹے گی تو بہت سے انکشافات خود بخود ہو جائیں گے۔"

"میں اب کیا کروں۔ مجھ پر جنون طاری ہو رہا ہے۔"

"مجھ سے تعاون کر نزائلہ۔ مجھ سے تعاون کر۔ اب تیرے سامنے میرے علاوہ اور کوئی نہیں رہ گیا۔ مجھ پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لے۔ وہ جو چلے گئے اس منزل تک تیسرے ساتھی تھے۔ جو ہیں وہ بھی تاریخ کے ان بند دروازوں کو نہیں کھول سکیں گے۔ ان دروازوں کے پیچھے جو کچھ ہے وہ مصر کے بڑوں کے راز ہیں جو عام لوگوں پر نہیں کھلتے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی بکواس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"خود آپ کیا ہیں مسٹر روشاق۔ آج تک مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل سکا اور آپ نے عجیب طرح سے میرے ذہن کو الجھا رکھا ہے۔ آپ مجھے کبھی نزائلہ کبھی آشوانی مندر کی پجارن کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ، میں صرف نشاء ہوں صرف نشاء۔"

"کیا۔ کہا؟ میں نے تجھے۔"

"جو میں نے بتایا ہے۔"

"ابھی آپ نے مجھے نزائلہ کہا تھا۔"

"آہ۔ میں بھی اپنی ہواؤں میں جی رہا ہوں۔ بھٹک جاتا ہوں۔ وقت کی لہروں میں تحلیل ہو جاتا ہوں۔ تم ان باتوں کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دیا کرو۔"

میں نے روشاق کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "میرے لئے اب کیا حکم ہے مسٹر روشاق۔"

"حکم نہیں، درخواست، دوستانہ مشورہ، جو تمہارے اور ہارون دانش کے لئے بے حد مفید ہے۔ اگر تمہیں وہ بوڑھی عورت، جس کا نام..... ہتیس رکو، وہ بے حد زیرک ہے۔ سنو، ہارون دانش تم سے رجوع کرے گا، ضرور کرے گا، تو اس سے کہنا کہ روشاق سے بہتر وکیل اور کوئی نہیں ہے۔ اسے کہنا کہ وہ تاریخ کا گھنگار نہ بنے۔ اس نے ان پوشیدہ روحوں کو چھیڑا اور نقصان اٹھایا۔ اس سے کہنا روشاق دشمن نہیں ہے اسے بس اس کا حصہ درکار ہے اور کچھ نہیں۔"

"کیسا حصہ؟" میں نے سوال کیا۔ تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی نظر آئی تھی پھر اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔"

"میری بات سنیں مسٹر روشاق۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"یہی وہ عمل ہے مسٹر روشاق جس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ آج لوگ صرف اپنے کام کے لئے مجھے آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔"

"نہیں۔ میں چلتا ہوں، بس اس سے زیادہ

نہیں، میں چلتا ہوں۔" وہ اسی بدحواسی کے عالم میں مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں سرد آنکھوں سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ ایک بدروح، ایک مکروہ کردار، اس نے جنیدی کو کتنی آسانی سے قتل کر دیا تھا۔ آہ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ جن کی زندگی سے ایسی کوئی کہانی منسلک نہیں ہوتی جن کی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ ماں باپ ہوتے ہیں خاندان ہوتے ہیں، میں نے اپنے بارے میں سوچا۔ تباہ شدہ جہاز کے دوسرے مسافر یقیناً عذاب کا شکار ہوں گے۔ لیکن میرا عذاب مختلف تھا۔ میں تو نہ جانے کیسے عذاب بھگت رہی تھی۔ بہت سے خیالات تھے جن میں مارشل کی تباہی کا خیال بھی تھا۔ وہ دیوانہ جس کا نام گارساں تھا، سب کچھ کر سکتا تھا۔

ذہن تو ہر وقت بحران کا شکار رہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی بحرانی کیفیت طاری تھی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر چٹانوں کے درمیان چل پڑی۔ تھوڑی دور گئی تھی کہ کسی نے مجھے آواز دے کر پکارا۔ "مس نشاء سنیئے۔"

آواز اجنبی تھی میں نے پلٹ کر دیکھا، ڈاکٹر تھا وہ ڈاکٹر جس سے صوفیہ کی دوستی ہو گئی تھی وہ میرے قریب آ گیا میں نے سوالیہ انداز میں دیکھا تو وہ بولا۔ "مس نشاء، صوفیہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ صوفیہ سے میں بددلی کا شکار نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ وہ اپنی اچھی خاصی زندگی کو چھوڑ کر میری وجہ سے اس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔

"سسٹر کہاں ہے ڈاکٹر؟"

"وہاں، اس چٹان کے پیچھے۔"

"جی۔" میں نے کشمکش کے عالم میں کہا تو ڈاکٹر بولا۔

"اس نے مجھے آپ کی پوری کہانی سنا دی ہے۔ میں دنگ رہ گیا ہوں مس نشاء، آپ کی زندگی سے منسلک پراسرار کہانی ناقابل یقین ہے۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ آپ سے شرمندہ ہے۔ اور آپ سے ملاقات کرتے ہوئے جھجکتی ہے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں آپ....."

"ڈاکٹر۔ آیئے چلیں۔"

میں ڈاکٹر کے ساتھ اس چٹان کے پیچھے پہنچ گئی جہاں صوفیہ ایک پتھر پر اداس اور خاموش بیٹھی ہوئی تھی اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کھڑی ہو گئی میں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تو صوفیہ کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ اس کی گلوگیر آواز ابھری۔

"سوری نشاء۔ سوری۔"

"نہیں سسٹر۔ بس زیادتی میری ہے، لیکن، میں جس عذاب سے گزر رہی ہوں اس کا آپ کو علم ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اندازہ ہے۔ اور میری غلطی کا احساس مجھے ڈاکٹر الیاس نے دلایا۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

"نہیں مس نشا؟ شکریہ کی ضرورت نہیں۔"

"سسٹر صوفیہ بے قصور ہیں۔ مجھے شاید احساس ہے کہ انہوں نے اپنی خوب صورت زندگی مجھ پر قربان کر دی ہے۔"

"مجھے ان الفاظ سے اختلاف ہے۔" ڈاکٹر کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"جی.....؟" میں حیرانی سے بولی۔

"اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو میری خوبصورت زندگی کا آغاز کیسے ہوتا۔ مجھے اتنی پیاری بیوی کیسے ملتی۔" ڈاکٹر الیاس نے پیار بھری نظروں سے صوفیہ کو دیکھ کر کہا۔ اور میں نے ایک خوشگوار حیرت سے پہلے ڈاکٹر اور پھر صوفیہ کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"ہم نے نکاح کر لیا ہے۔"

"ارے واقعی، سچ مچ۔"

"مس نشاء۔ سنا ہے جوڑے آسمانوں میں بنتے

ہیں۔ لیکن ہمارا جوڑا مارشل پر بنا ہے اور ہنی مون اس جزیرے پر۔"

"صوفیہ۔" میں نے ایک بار پھر سسٹر صوفیہ کو لپٹا لیا۔ تو وہ بولی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں نشاء۔"

"ڈاکٹر الیاس سے شادی کر کے۔"

"جی نہیں سالی صاحبہ۔ آپ کی سسٹر بے حد خوش نصیب ہیں کہ مارشل کے سفر میں انہیں ہم جیسا خوبصورت جوان مل گیا۔ ویسے ہمارا ہنی مون سٹی بھی بے حد خوب صورت ہے۔ البتہ ہم اپنے بچوں کے مستقبل سے کسی قدر پریشان ہیں۔

"کیوں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بس یہاں سے نکلنا تو ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے بچے اس جزیرے پر ٹارزن کی طرح درختوں پر چھلانگیں لگاتے پھریں گے۔"

بہت دن کے بعد ہنسی آئی تھی، بہت اچھا لگ رہا تھا صوفیہ نے رازداری سے کہا۔ "ایک بات بتاؤ گی نشاء۔"

"جی۔ پوچھیئے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے عسکری کو قبول کر لیا ہے؟"

"نہیں سسٹر ہرگز نہیں۔ وہ میری منزل نہیں ہے، ایثار کر رہا ہے میرے ساتھ، صرف اس لئے رہ رہا ہے میرے قریب کہ اس پاگل حکمران کی ہدایت کے مطابق کوئی اور شخص میرا مالک بننے کی کوشش نہ کرے۔ ان حالات میں مجھے قبول کرنا پڑا ہے اسے، لیکن میری اس سے نفرت برقرار ہے، وہ ہمیشہ میرے لئے اجنبی رہے گا۔"

"اوہ..... بہر حال اس سے ہوشیار رہنا، یہ میں تمہیں بتائے دے رہی ہوں، وہ اگر چاہے تو گارساں کے قریب آ سکتا ہے، اور اس کے بعد تم پر تسلط قائم کر لینا اس کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ فی الحال اس کا تعاون تمہارے لئے ضروری ہے، اپنے انداز میں تھوڑی سی لچک پیدا کر کے اس سے یہ تعاون جاری رکھو۔ کم از کم اس وقت تک جب تک قدرت ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر دے، بڑی مشکل کا شکار ہیں ہم، دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، بس اللہ ہی ہے جو کبھی ہمیں ہماری دنیا دیکھنا نصیب ہو جائے۔"

"بہت شکریہ سسٹر، میں آپ کی ہدایت کو ذہن میں رکھوں گی۔"

عسکری کے نام پر مجھے یاد آیا کہ وہ سارن اوگلے سے ملنے گیا ہے، میں صوفیہ کے پاس سے آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچ گئی جہاں ہمارا قیام تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ سر کے نیچے ایک پتھر رکھے آرام سے زمین پر دراز تھا، مجھے دیکھ کر اٹھ گیا اور بولا۔

"کہاں نکل گئی تھیں؟"

"بس ایسے ہی۔" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"آج کا دن تو گزر گیا، سارن اوگلے کا کہنا ہے کہ کل خواہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق اپنا کام سرانجام دینا ہے، کل ٹھیک گیارہ بجے وہ اسی پوائنٹ پر پہنچ جائے گا جہاں ہم اس سے جا کر ملیں گے، تنہا ہوگا اور ہمارا ساتھ دے گا، ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے نشاء کہ احمر جنیدی کی موت اور اس کے بعد روشاق کے ڈرامے نے شدید اعصابی دباؤ کا شکار کر رکھا ہے۔ میں نے عدنان ثنائی کو دیکھا ہے، وہ سب سے زیادہ پریشان ہے اور اب وہ وسکن ڈیزل کے پیچھے لگا ہوا ہے میں وسکن ڈیزل پر بھی حیران ہوں۔ وسکن ڈیزل بڑا عجیب سا انسان ہے وہ روشاق سے بالکل خوف زدہ نہیں ہے۔ البتہ مجھے خوف ہے کہ روشاق اب اسے نشانہ نہ بنا دے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر آہستہ سے کہا۔

"وسکن ڈیزل بہت زیادہ مطمئن ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"ایک آدھ دفعہ میں نے اس سے خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن وہ پراطمینان لہجے میں بولا کہ روشاق اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے کچھ پراسرار قوتوں کا تحفظ حاصل ہے۔"

"خدا کرے یہ تمام لوگ روشاق کی شیطانیت سے محفوظ رہ سکیں، ویسے اس میں کوئی شک نہیں نشاء کہ

روشاق کبھی کبھی ایک سمجھ میں نہ آنے والی بدروح جیسا لگتا ہے۔"

"میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی عسکری، براہ کرم یہ موضوع ترک کر دو اور سنو! سارن اوگلے کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کیا کرو، ہم نہیں جانتے کہ کون کونسی آنکھ ہمارا جائزہ لے رہی ہے۔"

"میں نے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی تھی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ روشاق بہت سی ایسی باتوں سے واقف ہو جاتا ہے جن کا گواہ کوئی نہیں ہوتا۔" بہر حال یہ جملے کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ عسکری خلاء میں دیکھ رہا تھا جہاں آہستہ آہستہ اندھیرا اتر رہا تھا۔ پھر میں نے ذہن جھٹک دیا۔

معمولات وہی تھے جنیدی کی لاش کو سمندر میں پھینک دیا گیا تھا، روشاق بھی آزاد تھا اور بلی کی حیثیت ایک عجیب سی شکل اختیار کر گئی تھی بڑی ہی منحوس تھی وہ بلی جسے روشاق مقدس روح کہتا تھا اس نے مجھے بھی بہت سے الٹے سیدھے نام دیئے تھے، بہر طور رات کو جب عسکری کروٹ بدل کر لیٹ گیا تو میں نے اس کے بارے میں سوچا، اس نے میری زندگی کی بڑی خوبصورت ابتداء کی تھی پھر اس کا دوسرا روپ میرے سامنے آیا جو میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب بھی وہ روشاق کا پیروکار ہے یا نہیں، لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ایسا نہیں ہو، بے چارہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا کوئی صلہ نہیں ہے، اسے نہ مجھ سے کچھ ملے گا نہ روشاق سے اس کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی اور دوسری صبح بڑی اداس اداس سی تھی، البتہ عسکری کو میں نے بڑا مستعد دیکھا تھا، اس نے مجھے بتایا۔

"سارن اوگلے میرے پاس آیا تھا، مجھے بتا کر گیا ہے کہ وہ میری نشان کردہ جگہ جا رہا ہے۔"

"اتنی جلدی؟"

"ہاں اس کا کہنا تھا کہ اس سے قبل کہ کوئی اور واقعہ پیش آ جائے اسے چل پڑنا چاہئے، تم تیار ہو نشاء؟"

"ہاں بالکل۔"

"میں تمہارے لئے ناشتہ لاتا ہوں۔ منہ ہاتھ وغیرہ دھو لو۔" عسکری نے کہا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ رفتہ رفتہ جزیرے پر خوشیاں منانے والوں کے انداز میں بیزاری پیدا ہوتی جا رہی تھی، زندگی بچ جانے کی خوشی اور اس کے بعد گارساں کے اعلان سے بہت سے نئے واقعات جنم لئے تھے لیکن انسانی فطرت کچھ پانے کے بعد کچھ اور پانے کی جستجو کرتی ہے، یکسانیت بہت جلد اپنا اثر دکھانے لگتی ہے اور اب ایسا ہی ہونے لگا تھا لوگ بجھے بجھے سے نظر آ رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے ایک چکر اس آبادی کا لگایا، گارساں کی منصوبہ بندیاں جاری تھیں، ابھی بس آبادی کی پلاننگ ہو رہی تھی، وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ روزانہ ناپ تول میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ منصوبہ مکمل ہوتے ہی ایک دن اچانک کام شروع کر دیا جائے گا، ہم کافی دور نکل آئے اور جب آخری آدمی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ہم نے رفتار بڑھا دی اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں سارن اوگلے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ فرانسیسی پولیس آفیسر نے ہمیں دیکھا وہ مستعد اور پھرتیلا نظر آ رہا تھا۔

"یہ میری ساتھی نشاء ہے؟" عسکری نے کہا۔

"ہیلو۔" میں نے کہا۔

"چلیں۔" سارن اوگلے بولا۔

"ہاں اب رکنے کا کیا جواز ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور ہم نے آگے کا سفر شروع کر دیا اور کچھ دیر کے بعد مطلوبہ جگہ پہنچ گئے، اب ہم ساحل سے زیادہ دور نہیں تھے، سارن اوگلے نے وہ جہاز دیکھ لیا اور کسی قدر مسرور لہجے میں بولا۔

"اوہ! تم نے تو واقعی سچ کہا تھا اصل میں اس جہاز کی پوزیشن ایسی ہے کہ نہ تو اسے سمندر سے براہ راست دیکھا جا سکتا ہے اور نہ جزیرے سے عام طور سے گزرتے ہوئے جب تک کہ کوئی اس ساحل کا خصوصی طور پر رخ نہ کرے۔"

"یہی وجہ ہے کہ یہ اب تک نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔"

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے جہاز تک پہنچ گئے، تختے کے ذریعے جہاز پر چڑھے اور پھر عرشے پر کھڑے ہو کر میں نے کپتان زنگر کو آواز دی۔

"مسٹر زنگر، مسٹر زنگر ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟" لیکن مجھے دوبارہ آواز نہ دینا پڑی، جہاز کے دوسرے حصے سے زنگر دو آدمیوں کے ساتھ برآمد ہوا، وہ جہاز پر ہمارا انتظار کر رہا تھا، طاقتور دوربینوں سے ہمیں دیکھ لیا جانا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ وہ سب قریب آ گئے تو اچانک ہی سارن اوگلے کے منہ سے نکلا۔

"اوہ مائی ڈیئر کیپٹن زنگر، کیا تم مجھے پہچان سکتے ہو شاید نہ پہچانو، لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔"

"تم" زنگر پر خیال انداز میں بولا۔

"ہاں آسٹراس برڈ میں آگ لگ گئی تھی اور تم آٹھویں منزل پر پھنس گئے تھے اس وقت تمہارے ساتھ ایک شخص بھی وہیں پھنسا ہوا تھا، جس نے بعد میں تمہیں عمارت سے نکالا تھا اور تم اس کے ساتھ مہمان رہے تھے، ان دنوں ایک افسر اعلیٰ کی حیثیت سے میں وہیں مقیم تھا اور تم....." اوگلے کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ زنگر آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر سارن اوگلے سے لپٹ گیا، پھر اس نے کہا۔

"بھلا اپنی جان بچانے والے محسن کو کوئی بھول سکتا ہے میرے دوست، لیکن وقت بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے، آہ یقیناً وہ بھولنے والی بات نہیں تھی، تم یہاں ہو، میرے دوست، دیکھو تقدیر کس طرح بعض اوقات شناساؤں سے ملا دیتی ہے، مجھے تم سے بے حد خوشی ہوئی ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"ہاں اور تم سے مل کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"آؤ، مسٹر عسکری نے تمہیں بتایا ہوگا کہ ہمارا جہاز یہاں پھنسا ہوا ہے بلکہ تباہ ہو چکا ہے، ہم نے اس میں سے تمام کارآمد سامان نکال کر اسے اپنے طور پر استعمال کیا ہے، دوربینوں کی مدد سے تمہیں دور ہی سے دیکھ لیا گیا تھا۔ آؤ افسوس کہ ہم تمہاری کوئی خاطر نہیں کر سکتے۔"

جہاز ہی کے ایک کیبن میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا، سب وہاں جا کر بیٹھ گئے، زنگر نے کہا۔

"اور اب مجھے یہ سب کچھ بتانے میں بہت خوشی ہو رہی ہے، ورنہ پہلے میں اس تشویش کا شکار تھا کہ کہیں میرا راز کسی غلط انسان کے پاس نہ پہنچ جائے، مسٹر عسکری نے تمہیں ہماری داستان سنا دی ہوگی، اس کے ساتھ ہی اس جزیرے پر یہ صورت حال ہے، مجھے گارساں کے بارے میں بھی علم ہو چکا ہے اور پتہ بھی چل چکا ہے، میں نے اپنی دوربینوں کی مدد سے وہ مورچہ بندی بھی دیکھی ہے جسے گارساں نے جزیرے پر موجود کسی نامعلوم گروہ کے خلاف نہیں بلکہ جہاز کے مسافروں کے خلاف کی ہے، تقریباً تمام ہی تفصیلات میرے علم میں ہیں، لیکن میری جان جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کہیں بحری قزاق مارشل تباہ نہ کر دے جس پر سفر کر کے تم یہاں تک آئے ہو اور جو ایک بار پھر ہماری زندگی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ ہمارے جہاز پر جو کچھ بچا ہے مارشل پر اسے استعمال کر کے ہم نئی زندگی پا سکتے ہیں۔ لیکن اس دیوانے سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ جہاز کے مسافروں کے جسموں سے جان نکالنے کے لئے کہ اب ان کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور انہیں گارساں کی حکومت تسلیم کر لینی چاہئے، فوری طور پر مارشل کو تباہ نہ کر دے، اگر یہ جہاز بھی تباہ ہو گیا تو یہ سمجھ لو کہ پھر زندگی کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ اس نوجوان نے یہ کہہ کر وہ تمہیں لے کر آئے گا، تمہارا تذکرہ کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ تم ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہو اس لئے ذہین بھی ہو گے، تم اس سلسلے میں ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہو، بہرطور یہ سب کچھ ہے، ہم تمہارا شدید انتظار کر رہے تھے اور جب تم نہیں آئے تو ہمیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔"

"ہاں میرے دوست، درحقیقت ہم اس شیطان صفت درندے کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ایسے

انوکھے واقعات پیش آ رہے ہیں جن کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔"

"تمہیں ہمارے وسائل یا ہمارے طرز رہائش کے بارے میں تفصیلات تو معلوم ہو چکی ہوں گی۔"

"اس نوجوان کی زبانی مختصراً لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ ایک تجربے کار کیپٹن نے ان حالات میں اپنے تحفظ کے لئے کیا کچھ نہ کر لیا ہوگا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے۔"

"میں بہت سی مختلف تجویزیں سوچ رہا ہوں یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ گارساں کی نظر ہمارے جہاز پر نہیں پڑی اور وہ اس کی دیوانگی سے محفوظ ہے، ہمارے پاس بہت مختصر سے ہتھیار ہیں۔ ایک کارگو شپ کو جنگی جہاز میں تو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، تجویز یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں تم لوگوں کی مدد سے ہم پہلے ان میں سے کسی ایک کے مورچے پر قبضہ کریں اور وہاں سے ہتھیار حاصل کرنے کے بعد دوسرے مورچوں کے لوگوں کو نشانہ بنائیں، اگر تم یہ سمجھتے ہو مائی ڈیئر کہ بحری قزاق جنگ و جدل کے بغیر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دے گا تو یہ کسی طور ممکن نہیں ہے۔"

سارن اوگلے ہنسا پھر بولا۔ "اور میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں نے اسے شدید ہنگامہ خیزی کے بعد گرفتار کیا تھا بہرحال میرے دوست، میں تمہاری اس تجویز سے متفق نہیں ہوں کیونکہ اس میں ایک بہت بڑی خامی ہے۔"

"وہ کیا؟" زنگر نے سوال کیا۔

"ہمارے پاس کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ہم اس کام کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، مثلاً اگر میں اپنے ساتھی فرانسیسی سپاہیوں کو اس ذمہ داری پر لگا دوں اور صرف چند ہتھیاروں کے بل پر تو میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس نے جو مورچہ بندی کی ہے وہ مضبوط اور محفوظ ہے۔ دوسرے مورچوں سے خوف ناک جنگ کی جائے گی اور اس بات کے امکانات ہیں کہ ہم اپنی کوشش میں ناکام رہیں، پھر کیونکہ گارساں یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ حملہ کرنے والے کون ہیں چنانچہ طیش میں آ کر نیچے گہرائیوں میں آباد جہاز کے مسافروں کو نشانہ بنائے گا کیونکہ وہ یہی سمجھے گا کہ جہاز کے مسافروں نے بغاوت کی ہے، اس طرح بے شمار افراد کی زندگیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

بالکل ٹھیک الفاظ کہے تھے فرانسیسی افسر نے ہم لوگ اس کی پیشگوئی کے ساتھ خوف زدہ ہو گئے تھے، زنگر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور ایک پولیس افسر کی سوچ عام لوگوں کی سوچ سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ اس کا واسطہ دن رات انہی چیزوں سے پڑتا ہے، پھر بتائیے سارن اوگلے اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے۔"

اوگلے پر خیال انداز میں رخسار کھجانے لگا، بہت دیر تک خاموشی طاری رہی پھر اس نے کہا۔

"ایک اور طریقہ ہو سکتا ہے، بے شک وہ پیچیدہ اور مشکل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اگر ایسا ہو جائے تو ہم کم خطرہ مول لے کر زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

سب سوالیہ نگاہوں سے اوگلے کو دیکھنے لگے تو وہ بولا۔ "گارساں ایک جرائم پیشہ آدمی ہے، بحری قزاق، لوٹ مار قتل و غارتگری اس کی فطرت کا حصہ ہے اور یہ سب کچھ دولت کے لالچ کے لئے کیا جاتا ہے۔"

"ہاں بالکل" زنگر نے کہا۔

"دولت کا لالچ ہی اسے ہوش سے بیگانہ کر سکتا ہے۔"

"براہ کرم وضاحت کیجیے۔" زنگر بے چینی سے بولا اور سارن اوگلے مسکرانے لگا پھر اس نے کہا۔

"سمندر کے اس ویران گوشے میں پہاڑوں کے درمیان ایک جہاز کا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے، اس میں زر و جواہر کے انبار ہیں۔ خیال ہے کہ اس کے ذریعے ایک بہت بڑا خزانہ کہیں منتقل کیا جا رہا تھا کہ جہاز طوفان کا شکار ہو گیا۔ اس میں انسانی ڈھانچوں اور خزانوں کے انبار کے علاوہ کچھ نہیں ہے، یہ خبر گارساں کو عقل و خرد سے عاری کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ خبر سنانے والا کوئی ایسا شخص

ہو جو بہترین اداکاری کر سکے، مگر وہ سارن او گلے نہ ہو ورنہ گارساں اس کی نیت پر شک کرے گا۔"

زنگر کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بدحواسی سے بولا۔"اور وہ خزانے کے لالچ میں دوڑا آئے گا یہاں۔ اور واقعی ایسا ہی ہوگا۔"

"ہاں اور پھر وہ واپس نہیں جائے گا۔ اس کے جو ساتھی باقی رہ جائیں گے ان کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔" سارن او گلے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بہترین لاجواب اور اطلاع دینے والی شخصیت عسکری سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"میں تیار ہوں۔" عسکری نے گرمجوشی سے کہا۔

"گویا میری تجویز سب کو قبول ہے۔"

"اس سے عمدہ تجویز ہو ہی نہیں سکتی۔" زنگر نے کہا اور اچانک ہی میری نظر کیبن کی کھڑکی سے باہر کی طرف اٹھ گئی جہاں چٹانیں نظر آ رہی تھیں اور میرا چہرہ زرد ہوگیا، میرے حلق سے ایک سہمی ہوئی سی آواز نکل گئی۔

"عسکری وہ......وہ" عسکری میری آواز پر اچھل پڑا اور پھر میرے اشارے پر عسکری کے علاوہ سارن او گلے نے بھی ادھر دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، زنگر ہماری کیفیت سے بے نیاز اپنی باتوں میں مصروف تھا، اچانک اس نے ہماری بے چینی کو محسوس کیا اور ہمیں تعجب سے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے۔؟" اس نے کہا اور پھر تھوڑا جھکا اس نے بھی ادھر دیکھا جہاں ہم لوگ دیکھ رہے تھے۔ وہ بلی وہاں موجود تھی، زنگر کو بھی مارشل کے حادثے کے بارے میں تفصیلات معلوم تھیں، لیکن روشاق یا میرے بارے میں کچھ نہیں پتہ تھا چنانچہ اس نے حیرانی سے کہا۔

"کیا بات ہے، آپ لوگ کیا دیکھ رہے ہیں، وہاں تو ایک بلی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا کیونکہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

"یہ بلی، یہ بلی بے حد خوف ناک ہے مسٹر زنگر، ایک پراسرار وجود جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"صرف یہ بلی۔" زنگر حیرانی سے بولا۔

"ہاں، انتہائی خوف ناک ایک ہولناک قاتل، جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"عجیب بات ہے...... مسٹر سارن، جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ اس کا رنگ وروپ اور جسامت دیکھ رہے ہیں مسٹر زنگر۔" سارن نے کہا۔

"ہاں یہ عجیب ہے۔ خیر ہم اس سلسلے میں زیادہ بات نہیں کریں گے ہمیں اصل مقصد کی طرف آ جانا چاہئے۔"

"تو بات یہ ہو رہی تھی کہ مسٹر عسکری نے یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے کہ وہ گارساں کو جہاز تک لے آئیں اس کے بعد ہم لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ ہم انہیں کیسے قابو میں کریں گے، میرے خیال میں میرے آدمیوں کے لئے یہ مشکل نہیں ہوگا، ایک دو افراد ہوتے تو ہم انہیں جال میں بھی جکڑ سکتے تھے لیکن ممکن ہے گارساں زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر ادھر آئے۔ چنانچہ ہمیں ان کے مناسب استقبال کے لئے تیاریاں ضروری کرنی ہوں گی۔"

"ہاں معمولی تیاریاں نہیں بلکہ بھرپور تیاریاں۔" سارن او گلے نے کہا۔

"اور یہ بات بھی طے ہے کہ وہ مسلح ہو کر آئے گا، لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں یہ میرے اور ساتھیوں کی زندگی کی بقاء کا مسئلہ ہے ہم میں سے کوئی زندگی حاصل کرنے کا یہ موقع نہیں گنوائے گا۔ بس اس کا یہاں تک آ جانا شرط ہے اور اس کے لئے تھوڑی سی ریہرسل کر لینا ضروری ہے آپ اسے خزانے کی کہانی سنائیں گے مسٹر عسکری، آیئے میں آپ کو بتا دوں کہ یہ خزانہ کہاں ہے؟ آیئے براہ کرم۔" زنگر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور پھر وہ جہاز کے نچلے حصے میں پہنچ گیا جہاں ٹکڑے کے بڑے بڑے بکس رکھے ہوئے تھے۔

ان سب کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگی تھیں، اس کا مطلب تھا کہ تقدیر ان پر مہربان ہونے والی ہے۔

(جاری ہے)

روح کا چین

خلیل جبار-حیدرآباد

قبر میں لیٹے ہوئے مردے کی اچانک آنکھیں کھلیں اور پھر آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، مردہ غیض و غضب کی حالت میں غرانے لگا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھے اور اس نے نوجوان کو دبوچ لیا۔

کرب واذیت سے دوچار ایک دل خراش، دل فگار، عبرت ناک اور سبق آموز کہانی

رات خاصی بیت گئی تھی، میں ایک شادی کی تقریب سے لوٹ رہا تھا، مجھے رات کی شادیوں سے بڑی چڑ تھی، اس لئے میں شادی بیاہ کی تقریبات میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ آج بھی میرا شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کا موڈ نہیں تھا لیکن ابا جان کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے سے مجھے جانا پڑ گیا۔ شادی ہمارے قریبی رشتہ داروں میں تھی۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں سائیکل کے پیڈل پر تیز تیز پاؤں مار رہا تھا۔ ہمارے گھر سے ذرا پہلے راستے میں قبرستان آتا تھا۔ قبرستان آتے ہی مجھے خوف سا آنے لگا تھا۔ بچپن ہی سے نہ جانے کیوں مجھے قبرستان کے قریب سے گزرنے پر خوف طاری ہو جاتا تھا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اندھیرے میں کوئی آسیب مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے، میں تیزی سے دوڑ لگا کر قبرستان

سے دور ہوتا چلا جاتا تھا بچپن کا خوف آج بھی مجھ پر غالب تھا۔ میں اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا مجبوری یہ تھی گھر جانے کے لئے راستہ یہی تھا اس کا متبادل کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میرے دوست بھی میری اس بزدلی سے واقف تھے اور اس معاملے میں میرا مذاق بھی اڑاتے تھے، میں خاموشی سے ان کا مذاق برداشت کر جاتا لیکن اپنے خوف پر کبھی قابو نہیں پا سکا تھا۔ گورکنوں کے چھوٹے چھوٹے بچے اکثر رات کے وقت قبرستان میں ایسے گھومتے پھرتے رہتے تھے جیسے وہ قبرستان میں نہیں کسی پارک میں گھوم رہے ہوں۔

قبرستان کے آتے ہی میرے ذہن پر خوف طاری ہو گیا۔ سائیکل چلاتے ہوئے میں نے ایک نظر قبرستان پر ڈالی قبرستان میں کسی بزرگ کا مزار بنا ہوا تھا جہاں ایک بلب روشن تھا بلب کی روشنی میں قریب کی چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں، مزار سے چند قدم دور نصیر کھڑا دکھائی دیا، نصیر کو دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا کہ وہ اس وقت قبرستان میں کیا کر رہا ہے حالانکہ اس کا گھر قبرستان سے بہت دور تھا، ایک لمحے کو میرا خوف جاتا رہا اور میں ایک درخت کے پاس سائیکل کھڑی کر کے اس کی جانب لپکا۔

"نصیر....." میں نے زور سے آواز لگائی۔

سناٹے میں میری آواز بہت تیز گونجی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری آواز سن کر میری طرف لپکے گا۔ لیکن اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ میں بھی تیزی سے اس کی طرف لپکا مجھے قبروں کو پھلانگتا دیکھ کر وہ بھی اور تیز ہو گیا تھا پھر اچانک وہ غائب ہو گیا۔ میں نے اس کو بہت تلاش کیا لیکن اسکا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کدھر گیا، اسے یوں غائب ہوتا دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نصیر کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ قبرستان سے کیسے غائب ہو گیا، میرے بدن سے پسینے چھوٹ پڑے میرے علاوہ اس وقت قبرستان میں کوئی نہیں تھا۔ اس لئے زیادہ خوف طاری تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نظر نہ آنے والی مخلوق میری بے بس پر دانت نکالے قہقہے لگا رہی ہے، اچانک جیسے میرے بدن میں طاقت بھر گئی ہو میں تیزی سے قبروں کو پھلانگتا ہوا دوڑا اور سائیکل کے پاس پہنچ کر میرا بھاگنا بند ہوا، سائیکل پر بیٹھتے ہی میں نے پیڈل پر بدحواسی کے عالم میں پاؤں مارنا شروع کر دیئے اور چند لمحوں میں ہی میں قبرستان سے دور نکل گیا اور گھر آ کر ہی دم لیا۔

رات میں کئی بار میری آنکھ کھلی اور میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا لیکن آنکھ کھلنے پر احساس ہوتا کہ چند لمحوں پہلے میں نے ڈرا دینے والا منظر دیکھا تھا وہ خواب تھا اس بات سے دل کو سکون ملتا اور میں دوبارہ سو جاتا۔ خواب میں جو منظر مجھے آ رہا تھا وہ کچھ یوں تھا کہ میں قبرستان میں جا رہا ہوں اور اچانک میرے سامنے نصیر آ جاتا ہے میں ابھی اس سے بات کرنے ہی والا تھا کہ کوئی سیاہ لباس میں ملبوس مخلوق اچانک وارد ہوتی ہے اور نصیر کو اٹھا کر لے جاتی ہے میں چیخنا چاہتا ہوں لیکن میری چیخ حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور بے اختیار میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

صبح کالج میں میری ملاقات نصیر سے ہوئی پر میں نے قبرستان میں اس کی موجودگی اور غائب ہونے سے متعلق بات پوچھی تو وہ ہنس کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں رات میں قبرستان جا کر کیا کروں گا تمہیں ضرور وہم ہوا ہے۔"

"مجھے وہم نہیں ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں قبرستان میں دیکھا تھا اور میں جب تمہارے پیچھے بھاگا تو تم غائب ہو گئے۔" میں نے اسے بتایا۔

"میرا تمہیں ایک قیمتی اور مفید مشورہ ہے کہ آئندہ کبھی قبرستان کے اندر اس طرح مت چلے جانا۔ قبرستان میں آسیب ہوتا ہے جو رات میں لوگوں کو تنگ کرتا ہے۔ وہ انسان کے دوستوں اور رشتہ داروں کے روپ میں نظر آتا ہے ان کے پاس جانے والے شخص پر وہ آسیب حملہ کر دیتا ہے ہاں ان کے جسم

میں داخل ہو کر اسے اور اس کے گھر والوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔" نصیر نے کہا۔

"ہاں..... ہاں نصیر سچ کہہ رہا ہے۔" فرحان بیچ میں بول پڑا۔

"ہمارے پڑوسی مرزا ندیم کی لڑکی پر آسیب آ گیا تھا۔ آسیب کے باعث اس نے گھر میں توڑ پھوڑ مچا دی۔ کبھی کسی کو اٹھا کر دیوار پر دے مارتی تھی۔ سب گھر والے پریشان ہو گئے کہ اتنی کمزور اور نازک لڑکی میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے جو وہ اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ اپنے سے بھاری، بھاری سامان اور انسانوں کو اس طرح پھینک رہی ہے جیسے کوئی کھلونا پھینک رہی ہو۔"

"ممکن ہے ایسا ہو۔" میں نے کہا۔

میں ان سے اس وقت کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ نصیر کو میں نے خاصے فاصلے سے دیکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرا وہم ہو، وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ نصیر کا رات کے ساڑھے بارہ بجے قبرستان میں کیا کام ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کو گزرے دو ماہ ہو چکے تھے اور میں بھی اس واقعہ کو بھولتا جا رہا تھا اس دن سے میں محسوس کر رہا تھا کہ نصیر کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ سوکھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑتے جا رہے تھے اس کے جسم سے گوشت کم اور ہڈیوں کا ابھار زیادہ دکھائی دینے لگا تھا مجھے اس کی صحت گرنے پر سخت تشویش تھی میں نے کئی بار اس کو مشورہ دیا کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائے۔ وہ میری بات کو ہنس کر ٹال کر ہاں، ہوں کر کے رہ جاتا تھا۔

ایک رات میں سائیکل پر قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں رات میں گھر سے باہر زیادہ دیر نہیں رہتا۔ اس دن اتفاق ہی ہے کہ اپنے دوست غلام محی الدین کے گھر گیا تھا اس کے گھر والے کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ غلام محی الدین نے DVD پر میرے پسندیدہ گانے لگا دیئے۔ میں اور غلام محی الدین گانے سننے میں اتنے مگن ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور میں اس وقت بری طرح چونکا جب میری نظر گھڑی پر پڑی رات کے بارہ بج چکے تھے میں بدحواسی میں تیزی سے صوفے سے اٹھا اور غلام محی الدین سے اجازت لے کر گھر کو چل دیا۔ قبرستان آتے ہی میری سائیکل اچانک ایک جھٹکے سے فضا میں اچھلی اور میں دھڑام سے سڑک پر گر پڑا سائیکل کے نیچے ایک بڑا سا پتھر آ گیا تھا جو میں دیکھ نہیں پایا۔ اور سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑا۔ میں جیسے ہی سڑک سے اٹھا اچانک مجھے ایسا لگا کہ کوئی شخص قبرستان سے باہر آیا ہے۔ میں نے اس کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

وہ شخص کوئی اور نہیں نصیر ہی تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی آنکھیں آگ کا شعلہ لگ رہی تھیں، آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ ایسے چل رہا تھا کہ جیسے نیند میں چل رہا ہو۔

"نصیر..... نصیر..... ٹھہرو میری بات سنو۔" میں نے بے ساختہ اسے پکارا مگر نصیر چلتا ہوا میرے پاس سے گزر کر اس طرح جانے لگا۔ جیسے اس نے میری آواز سنی ہی نہیں ہو۔ میں نے اس کا کاندھا پکڑ کر اس کو جھٹکا دیا وہ ایسے چونکا جیسے میں نے اسے نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ غصے سے گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔

"نصیر ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔" میں نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی چاہتا ہے تو فوراً میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ ابھی اور اسی وقت تجھے ختم کر دوں گا۔" نصیر نے عجیب نظروں سے اور غصے بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی آواز مجھے بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی بھاری بھرکم شخص بول رہا ہے۔ اس کی آواز سے بے اختیار مجھ پہ کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے بہ مشکل کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سائیکل کو پکڑ کر اس پر سوار ہوا۔ اور تیز رفتاری سے سائیکل کو بھگاتا ہوا آگے کو بڑھ گیا پھر میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس وقت میں بہت خوف زدہ تھا اور جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ رات میری آنکھوں میں کٹی۔ رات بھر میں سکون کی نیند نہ سو سکا بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ صبح بیدار ہونے پر مجھے اپنا جسم گرم گرم لگ رہا تھا۔ اور درد بھی کر رہا تھا۔

''تمہیں تو سخت بخار ہے۔'' امی جان نے میرے بستر سے نہ اٹھنے پر میرے ماتھے پر ہاتھ لگایا۔

''تم آرام کرو آج کالج جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں مشکل سے بستر سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر چائے اور پاپے سے ناشتہ کیا۔ بخار کی گولی گھر میں موجود تھی۔ کھانے سے دوپہر تک بخار کا زور ٹوٹ گیا اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا البتہ بخار سے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔

میں دو دن تک کالج نہیں جا سکا۔ تیسرے دن کالج جانے پر پتا چلا کہ نصیر بھی دو دن سے نہیں آ رہا ہے۔ میں اس رات کے واقعہ سے ویسے ہی خوف زدہ تھا۔ اس لئے میں نے نصیر کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا کہ میں نے نصیر کو کس حالت میں قبرستان سے نکلتے دیکھا تھا۔

اس واقعہ کو دو ماہ گزر گئے تھے لیکن نصیر کالج نہیں آیا اور نہ ہی میری ہمت ہوئی کہ اس سے ملاقات کرنے گھر جاؤں اور پوچھوں کہ وہ کالج کیوں نہیں آ رہا ہے؟

ایک دن سر راہ نصیر کے چھوٹے بھائی نثار سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''کیوں بھئی نثار تمہارا بھائی کالج نہیں آ رہا ہے خیریت تو ہے نا؟''

''نصیر بھائی کی دو ماہ سے طبیعت خراب ہے وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہیں۔ دوائیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے مولوی نظام سے روحانی علاج بھی کرا رہے ہیں لیکن طبیعت سنبھلے میں نہیں آ رہی ہے۔''

''لیکن مجھے اور کسی دوست کو بھی اس کی بیماری کا پتہ ہی نہیں چلا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

پھر میں ڈرتے ہوئے نثار کے ساتھ ان کے گھر گیا، نصیر کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا واقعی وہ ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا تھا۔

''نصیر یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے؟'' میں نے نثار کے کمرے سے جانے پر پوچھا۔

''یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے، میں بہت برا ہوں، میرا انجام اس سے برا ہونا چاہئے تھا۔'' نصیر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''نصیر صبر کرو، اللہ تعالیٰ سب بہتر کرے گا، تم ضرور صحت یاب ہو جاؤ گے۔'' میں نے اس کو تسلی دی۔

''نہیں میں ٹھیک نہیں ہو سکتا، تم مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو، جس نے مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا ہے کہ میں چند روز سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''نصیر یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

''تم سننا چاہتے ہو نا تو سنو! شاید تمہیں یہ سب سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔'' نصیر نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے کہتے تھے نا شریف اچھا لڑکا نہیں تھا تمہارے منع کرنے کے باوجود میں اس سے ملاقات کرتا تھا، ایک رات وہ مجھے قبرستان لے گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کیوں قبرستان لے آیا ہے رات کی تاریکی میں دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک تازہ قبر کا ایک حصہ کھود کر وہ اندر چلا گیا۔ اسے قبر میں گھسے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے سخت تشویش ہوئی کہ دیکھوں وہ کیا کر رہا ہے۔؟

قبر کے اندر اس نے چھوٹی سی ٹارچ جلا رکھی تھی ہلکی روشنی سے قبر کے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا قبر میں ایک نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش پڑی تھی، لڑکی کے کفن کو شریف نے پوٹلی بنا کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب وہ لڑکی کی لاش کے اوپر جھکا ہوا تھا اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی کہ شریف ایسی

گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاؤں جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے کہ میرے لئے پاؤں اٹھانا مشکل ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ قبر سے باہر نکل آیا اور مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں بھی وہی شرمناک حرکت کروں جو وہ قبر کے اندر لاش کے ساتھ کر کے آ چکا ہے۔ میرے انکار پر اس نے جیب سے پستول نکال لیا اور دھمکی دی کہ میں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کیا تو مجھے جان سے مار دے گا زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی کو بچانے کی خاطر میں قبر کے اندر اتر گیا اور قبر میں وہی حرکت کر بیٹھا جسے میں چند لمحے پہلے بہت برا سمجھ رہا تھا۔ شریف نے قبر سے کفن نکال کر قبر کو دوبارہ سے پہلے جیسی حالت میں کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شریف مجھے قبرستان سے باہر لے آیا اور دھمکی دی کہ یہ بات میں کسی کو نہیں بتاؤں ورنہ سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گا۔ میں کئی دن تک شریف سے نہیں ملا مجھے شریف پر شدید غصہ تھا۔ اس رات اس نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی تھی پھر ایک دن خود بخود میرے پاؤں شریف کے گھر کی طرف اٹھ گئے شریف مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور رات ہو جانے پر پھر مجھے قبرستان لے گیا۔ میں اس کے پیچھے ایسے چل پڑا جیسے اس کا غلام ہوں اور وہ میرا آقا ہے اس رات بھی شریف نے وہی رات والی حرکت کی اور قبر سے باہر آ گیا میں اس کے اشارے کا منتظر تھا اشارہ پاتے ہی میں قبر میں اتر گیا اور اپنے شیطانی عمل میں مصروف ہو گیا۔

اب ہم دونوں کی دوستی اور مضبوط ہو چکی تھی ہم ایک دوسرے کے راز دار بن گئے تھے۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا کہ جس رات شریف قبرستان نہیں جاتا میں اکیلا ہی پہنچ جاتا۔ قبر سے جو کفن ملتا تھا وہ ایک کفن بیچنے والے کو سستے داموں فروخت کر دیتا ایک رات شریف کو دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ میں اکیلا ہی قبرستان چلا گیا اور ایک تازہ قبر کھود کر اندر اترا۔ عورت کا کفن اتار کر میں جیسے ہی اس کی جانب بڑھا۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے منہ سے لمبے لمبے دانت باہر نکل آئے، میں گھبرا کر باہر نکلنے لگا لیکن اس عورت نے میرا پاؤں پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ میں نے بہت کوشش کی قبر سے باہر نکل جاؤں لیکن اس عورت نے مجھے اتنی سختی سے پکڑ لیا کہ میں خود کو چھڑا نہ سکا اور بے بس ہو کر رہ گیا۔

''جاتا کہاں ہے شیطان۔'' وہ عورت قہقہہ لگا کر بولی۔

''مم..... مم..... مجھے معاف کر دو۔'' میں نے التجا کی۔

''میں تجھے نہیں چھوڑ سکتی۔ تو میری حد میں آ گیا ہے۔ تیری جان تو اب مر کر ہی چھوٹ سکتی ہے۔'' وہ بولی

''خدا کے لئے مجھے جانے دو، میں پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔''

''ایسا کسی صورت میں ممکن نہیں ہے، تیرے دادا کا نام وکیل احمد ہی ہے نا۔''

''ہاں، ہاں لیکن تم انہیں کیسے جانتی ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہ بہت پرانا قصہ ہے میں تیرے دادا کے گھر نوکری کرتی تھی۔ ایک دن گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے تیرے دادا اور ان کے چند دوست گھر میں شراب میں دھت بیٹھے تھے وہ مجھے گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر تیرا دادا مجھ پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑا وہ مجھے نوچتا کھسوٹتا رہا میری سانس اکھڑنے لگی تو اسے ہوش آیا لیکن اس وقت تک دیر ہو گئی تھی مرتے مرتے میں نے دل میں عہد کیا تھا کہ جب تک وکیل احمد اور اس کے گھر کے فرد سے اپنا انتقام نہ لے لوں اس وقت تک میری روح کو قرار نہیں آئے گا، تو جب قبر میں اترا تھا میری روح خوش ہو گئی کہ میری مراد بر آنے والی ہے۔'' وہ عورت بولی۔

''لیکن یہ قبر تازہ ہے، پھر تم اس میں کیسے آ گئیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''روحوں کے لئے کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔ یہ قبر بہت پرانی ہے صرف تیری نظر کا دھوکہ تھا، میرے جسم پر جو کفن تھا وہ بھی تیری نظر کا دھوکہ تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا میں بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

ہوش آنے پر میں اس قبر میں اکیلا پڑا تھا۔ عورت غائب تھی۔ میں قبر سے نکل کر تیزی سے گھر بھاگا۔ دوسری رات نا چاہتے ہوئے بھی میرے قدم خود بخود قبرستان کی طرف اٹھنے لگے اور قبرستان پہنچ کر میں قبر کے اندر اتر گیا قبر میں وہ عورت موجود تھی اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آنے پر دوبارہ گھر آ گیا یہ سلسلہ روز ہونے لگا میں اب جسمانی طور پر کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ میں ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا۔''

''تم یہ بات اپنے والد کو نا سہی کسی دوست کو بتا سکتے تھے تا کہ اس کا بروقت علاج ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنا جرم اور یہ بات بتانا چاہتا تھا لیکن میں جب بھی یہ بات کسی کو بتانا چاہتا تھا تو دکھائی نہ دینے والے ہاتھ میرے گلے کو دبانا شروع کر دیتے تھے۔ میری سانس رکنا شروع ہو جاتی تھی۔ میرے خاموش ہو جانے پر گلے پر ہاتھوں کا دباؤ کم ہو جاتا پھر میں نے بہتر یہی جانا کہ یہ راز کسی کو نہ بتاؤں اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں۔'' نصیر نے بتایا۔

''کیا وہ عورت درست کہہ رہی تھی تمہارے دادا جان نے ایسی کوئی حرکت کی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میرے دادا جان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت عیاش تھے۔ نہ جانے کتنی عورتیں ان کی ہوس کا شکار ہو کر قبرستان کی زینت بن چکی تھیں، پیسہ ان کے پاس بہت تھا، پولیس رشوت لے کر کیس کو دوسرا رنگ دے کر دبا دیتی تھی تم حیران ہو رہے ہو کہ میں نے تمہیں پوری تفصیل بتا دی اور میرے گلے کو وہ ہاتھ نہیں دبا رہا۔'' نصیر نے کہا۔

''ہاں میں ابھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں اس قدر کمزور ہو چکا ہوں کہ خود سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ مجھے کوئی پکڑ کر اٹھاتا ہے تو اٹھ پاتا ہوں وہ قبر والی عورت خود یہاں آتی رہتی ہے لیکن کسی کو نظر نہیں آتی۔ دو دن پہلے ہی اس عورت نے مجھے بتایا تھا کہ تیرا دوست عمیر تیرے پاس آئے گا۔ تو اسے اپنا راز بتا دینا تا کہ دنیا والوں کو پتہ چل جائے کہ بشیراں نے اپنا انتقام لے لیا۔'' نصیر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نصیر بہت طویل سفر کر کے آیا ہو اور تھکن سے ہانپ رہا ہو۔

''نصیر تم ہمت نہ ہارو انشاء اللہ تم ضرور صحت یاب ہو جاؤ گے۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

''عمیر تم مجھے جھوٹے دلاسے مت دو، جو مولوی صاحب مجھ پر دم کرنے آتے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ میرے گھر والوں نے روحانی علاج کرانے میں بہت دیر کر دی ہے وہ کوشش کر رہے ہیں لیکن طبیعت بہتر ہونے کی امید نظر نہیں آ رہی ہے وہ عورت بھی کہہ رہی ہے کہ میں ایک ہفتے سے زیادہ نہ جی سکوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے نصیر کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

میں نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے اور اسے حوصلہ اور دلاسہ دے کر چلا آیا۔ میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

مجھے نصیر سے ملاقات کئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ نصیر کے انتقال کی خبر مجھے مل گئی۔ بشیراں نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ بقول بشیراں کے ایسے انتقام لینے پر اس کی روح کو چین آ جائے گا ممکن ہے ایسا ہو جائے ایسا ہونے پر نصیر کے خاندان کے لوگ اب محفوظ ہو جائیں گے اگر بشیراں کی روح کو چین نہ آیا تو پھر اس کے خاندان کے مزید لوگ بشیراں کے انتقام کی بھینٹ چڑھ سکتے ہیں۔

لاج ولا

راشد نذیر طاہر۔ کراچی

اچانک دلخراش چیخ بلند ہوئی جس نے قرب و جوار کے پورے علاقے کو دہلا کر رکھ دیا، ہر شخص انگشت بدنداں تھا، دہشت کی وجہ سے لوگوں پر لرزش طاری تھی، کہ پھر اچانک ایک اور پرہول منظر رونما ہوا۔

خوف کے لبادے میں لپٹی خونی وادی کی طرف محو پرواز ذہن پر سکتہ طاری کرتی کہانی

انسپکٹر جاوید نے چائے کا کپ اٹھا کر ایک طویل ترین چسکی بھری اور الٹے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار پہ دوبارہ نظریں جما دیں۔

یہ اس کا روزانہ کا خاص معمول تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ میں اخبار لازمی ہوتا تھا۔

اس کی بیوی نادیہ ناشتے کے برتن سمیٹنے کے بعد اب جاوید کے دفتری سامان کو ترتیب دے رہی تھی، تا کہ گھر سے نکلتے وقت جاوید کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو..... یہ نادیہ کا روز کا معمول تھا.....!!

دفعتاً ایک خبر پر اس کی نگاہیں جم سی گئیں، اس نے غور سے اس خبر کو پورا پڑھا اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

''تم واقعی پرنس ہو ..... کیا بات ہے

تمہاری.....!!

پھر اس نے اخبار ایک جانب رکھا اور قریبی ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اپنی جانب کھینچ لیا۔

جلد ہی وہ کسی کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

سلسلہ ملتے ہی ایک دلآویز سی مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی.....

"ہیلو.....السلام علیکم.....پرنس وقار احمد بول رہا ہوں.....آپ کون.....؟"

"میں جاوید بول رہا ہوں..... پرنس صاحب....."

"اوہ.....اوہ....." شاید چونک کر کہا گیا تھا۔

"اب میں آپ کو شیطان کہوں گا تو آپ برا مان جائیں گے.....قسم سے.....میں کل سے آپ کو بہت مس کر رہا ہوں....."

"ارے تو آفس آجاتے ناں....." جاوید نے جواب دیا۔"میں سرحد پہ تھوڑی تعینات ہوں....."

"آپ اکثر مصروف رہتے ہو.....یہی سوچ کر رہ گیا.....ویسے آپ نے آج کا اخبار دیکھا.....میرا مطلب ہے....."

"ہاں.....روزنامہ سویرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا.....اور تمہاری ہی رپورٹنگ کی خبر پڑھ کر میں نے تمہیں کال کی ہے....."

"وہی.....وہی....." دوسری طرف سے خوش ہو کر کہا گیا۔"آپ کو معلوم ہے کہ میں انوکھی قسم کی خبروں کے لئے پاگل رہتا ہوں....."

"اور میں اس کی وجہ اچھی طرح سمجھتا ہوں....." جاوید کی آواز معنی خیز تھی۔

"تاکہ سویرا کے ایڈیٹر پر تمہاری دھاک جمی رہے.....کیوں؟"

"ہا ہا ہا....." قہقہہ لگا تھا۔"آپ تو گرو ہو جناب....."

"بس.....مکھن نہیں....." جاوید نے مصنوعی غصہ دکھایا۔"یہ بتاؤ کہ اس خبر کی کیا کہانی ہے.....؟"

"خبر کی کہانی.....واہ.....جملہ خوب ہے آپ کا.....اس کہانی کے لئے مجھے آپ سے ایک عدد ملاقات کرنی پڑے گی.....کب مل رہے ہیں.....؟"

"میں آفس کے لئے نکلنے والا ہوں.....آجاؤ.....12 بجے تک.....!"

"او کے سر جی.....میں حاضر ہو جاؤں گا....."

"ٹھیک ہے....." جاوید نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اب اس نے دوبارہ اخبار اپنے سامنے پھیلا دیا۔ خبر تھی۔

کتنے ہوئے لاپتہ.....!

(رپورٹ: پرنس وقار) "قصبہ جوہر پور میں ایک خونی حویلی واقع ہے.....ذرائع سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جو شخص بھی اس حویلی میں ٹھہرتا ہے، پھر دوسرے دن اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا.....البتہ اس پراسرار حویلی کی دیواروں پر خون کے دھبے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔"

علاقے کے مکینوں نے اس حویلی کو آسیب زدہ اور دہشت کدہ قرار دے دیا ہے.....اگر آپ بھی کبھی قصبہ جوہر پور کا رخ کریں تو ذرا محتاط رہیے گا.....اندرونی صفحات پر فیچر دیکھئے.....!!"

انسپکٹر جاوید نے اخبار لپیٹ کر رکھ دیا۔ اور پھر ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

انسپکٹر جاوید.....محکمہ سراغ رسانی کا ایک ذہین اور قابل انسپکٹر تھا۔

وہ شادی شدہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔

شادی کے 4 سالہ عرصے میں یہ جوڑا ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا.....لیکن ان دونوں کی ذہنی یگانگی کی بنا پر اس محرومی نے کسی طور بھی مایوسی کا دامن نہیں تھاما تھا.....

ان دونوں کا یہی موقف تھا کہ جو نصیب میں ہوگا.....وہ ضرور ملے گا.....دنیا میں ہر چیز کا وقت مقرر

ہے.....اگر کوئی کام دیر سے ہوتا ہے تو اس میں بھی کوئی بہتری ہوتی ہے.....

انسپکٹر جاوید چند ضرور کام نمٹانے کے بعد ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ چپراسی نے ایک وزیٹنگ کارڈ پیش کر دیا۔

انسپکٹر جاوید نے کارڈ پر نظر ڈالتے ہی سر ہلا دیا۔

"اسے اندر بھیج دو.....اور چائے کی بھی ضرورت پڑے گی....."

چپراسی جیسے ہی باہر نکلا۔ فوراً ہی ایک گول مٹول سا نوجوان اندر داخل ہو گیا، اس کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ایک سوالیہ سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"کم ان.....سر.....؟" اس نے اپنی بھاری سی آواز میں پوچھا۔

"جون ایلیا کا ایک شعر ہے....." انسپکٹر جاوید نے مسکرا کر کہا۔

"جی.....ارشاد....."

وہ بڑی عجلت میں سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

جاوید نے بدستور مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔

اب مجھے ڈر ہے بس تو اس کا ہے
اندر آجائیں گے وہ اندر سے

"واہ.....واہ....." نوجوان نے دھیمی سی آواز میں نعرہ لگایا۔"کیا لاجواب شعر ہے.....اور اگر سموسے بھی منگائے ہوتے تو مزہ دوچند ہو جاتا....."

"بھائی پرنس وقار....." جاوید نے لمبی سانس لی۔"یہ آفس ہے.....کینٹین نہیں ہے....."

"اوہ.....سوری....." وہ جلدی سے بولا۔"میں چائے سے ہی گزارا کر لوں گا....."

"اب تم بتاؤ.....جو تم نے فیچر لکھا ہے.....اس کی کیا حقیقت ہے.....؟" انسپکٹر جاوید نے موضوع چھیڑا۔

"یہ بات گپ نہیں ہے.....بالکل ڈن ہے....." وقار جوش میں بولا تھا۔"آپ کو معلوم ہے کہ میں ایڈونچر کی تلاش میں رہتا ہوں.....اور ایسی چیزیں میری کمزوری ہیں.....میں نے اس معاملے کو جوہر پور کے سنجیدہ حلقوں میں بھی ڈسکس کیا ہے.....اور پھر حتمی رپورٹ بنا کر فیچر لکھ مارا....."

"ہوں....." انسپکٹر جاوید کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔"اب تک کتنے افراد موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں.....؟"

"کوئی حساب نہیں ہے....." وقار نے بتایا۔"لیکن مہینے میں ایک دو بار یہ واقعہ ضرور ہوتا ہے.....ویسے تو لوگ اب ادھر کا رخ نہیں کرتے.....لیکن جوہر پور چونکہ ایک خوب صورت علاقہ ہے.....اس لئے سیر و تفریح کے لئے آنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی اس حویلی کا نوالہ بنتا رہتا ہے.....

"ہوں....." انسپکٹر جاوید نے ہنکارا بھرا۔"اور وہاں کی پولیس.....؟ اس نے کوئی حل نہیں نکالا.....؟"

"یہ معاملہ خود ان کی سمجھ سے بالاتر ہے.....ویسے تو انہوں نے علاقے والوں کو سختی سے ادھر کا رخ کرنے سے منع کر رکھا ہے.....وہ بھی اس مسئلے میں کچھ کرنے سے قاصر ہیں....."

"او کے....." انسپکٹر جاوید نے سر ہلا دیا۔

اتنی دیر میں چائے آگئی، ساتھ میں سموسے بھی تھے، وقار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی، اس نے تعریفی نظروں سے چپراسی کی طرف دیکھا تو اس نے دانت نکال دیئے۔

جیسے کہہ رہا ہو کہ "مجھے معلوم ہے کہ سموسے آپ کے فیورٹ ہیں۔"گڈ شو....." وقار نے جلدی سے سموسوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔"بادشاہ سلامت کے تو درباری بھی انٹیلی جنٹ ہیں....."

"اب سموسے کھا کر جلدی سے بتاؤ کہ تم میرے ساتھ جوہر پور کب چل رہے ہو.....؟" انسپکٹر جاوید نے آگے جھک کر کہا۔

وقار کو اسی وقت ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کے ہاتھ سے سموسہ گرتے گرتے بچا۔

وہ آنکھیں پھاڑ کر انسپکٹر جاوید کو گھورنے لگا تھا۔

"ارے بھائی..... کس نے کہا تھا کہ گرم گرم کھالو..... ٹھنڈا تو ہونے دیتے..... بے چارے سموسے کو....."

"سموسہ تو بالکل معتدل ہے....." وقار بولا۔ "یہ ردعمل تو جوہر پور والی بات کا تھا....."

"کیوں.....؟" انسپکٹر جاوید نے اسے گھورا۔

"کون جائے گا وہاں.....؟" وقار نے گویا مکھی اڑائی۔ "مجھے ابھی زندگی میں نہ جانے کتنے سموسے..... مم میرا مطلب ہے..... نہ جانے کتنے کام کرنے ہیں....."

"یہ سارے سموسے تم ہی کھاؤ گے....." انسپکٹر جاوید نے اسے تسلی دی۔ "اور میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ کل صبح ہم دونوں جوہر پور جائیں گے..... میں اس معاملے میں دلچسپی محسوس کررہا ہوں..... اور چونکہ وہ تمہارا ہی لکھا ہوا فیچر ہے اس لئے تم بھی میرے ساتھ چلو گے....."

"ارے باپ رے....." وقار جیسے کراہتے ہوئے بولا۔ "مرگئے....."

جواباً انسپکٹر جاوید کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ عود کرآئی۔

یہ حقیقت تھی کہ ایک خوب صورت وادی کی مانند قصبہ جوہر پور اپنے قدرتی حسن کی بدولت لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ چاروں طرف سے ہرے بھرے درختوں اور آبشاروں سے گھرا ہوا یہ قصبہ اپنی مثال آپ تھا۔

آبی پرندوں کے شکار کے علاوہ دور تک پھیلی ہوئی جھیل میں لوگ مچھلیوں کے شکار سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

انسپکٹر جاوید اور وقار نے ایک مقامی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر حاصل کرنے کے بعد اپنا ضروری سامان وہاں رکھا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئے۔

"کہاں جائیں گے آپ.....؟" وقار نے چلتے ہوئے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو تھانے چلیں گے....." انسپکٹر جاوید نے جواب دیا۔ "پھر وہاں سے..... اس حویلی کا رخ ہوگا....."

"آل تو..... جلال تو....." وقار بڑبڑایا۔

انسپکٹر جاوید نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے نزدیک سے گزرنے والی خالی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

☆.....☆.....☆

تھانیدار نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر جب انسپکٹر جاوید نے اپنا تعارف کروایا تو اس نے بہت پرجوش انداز میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"بہت نام سنا ہے آپ کا جناب....." تھانیدار نے سر ہلا کر کہا۔ "آپ تو بہت مشہور اور قابل تعریف شخصیت ہیں....."

"شکریہ....." انسپکٹر جاوید نے سر کو خم کیا۔ "آپ سے مل کر مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی ہے....."

"کیا خدمت کروں آپ کی.....؟"

"میں دراصل لاج ولا نامی عمارت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں....."

انسپکٹر جاوید اس موضوع کی طرف آیا۔ "اس کا کیا قصہ ہے.....؟"

تھانیدار کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"آپ..... کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں.....؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ وہاں سے لوگ پراسرار طور پر غائب ہوجاتے ہیں..... اور ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا.....!"

"جی ہاں..... یہ بالکل درست ہے....."

"کیا آپ لوگوں نے اس معاملے کی چھان بین نہیں کی.....؟"

"ہم لوگوں نے سرتوڑ کوششیں کی ہیں سر.....! لیکن یہ کوئی اوپری معاملہ ہے..... ہم انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے یہ....."

"ہوں....."

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر تھانیدار نے پوچھا۔

"کیا آپ اخبار والی خبر دیکھ کر یہاں آئے ہیں.....؟"

"یہی سمجھ لو....." انسپکٹر جاوید مسکرایا: "یہ اخبار والوں کی ہی مہربانی ہے....."

"ان اخبار والوں کا تو کام ہی یہی ہے....." تھانیدار نے منہ بنایا۔ "ہم پولیس والوں کو نشانہ بنانے کے لئے ان لوگوں کو موقع درکار ہوتا ہے..... جہاں ہم لوگ کمزور پڑے نہیں، ان لوگوں کو موقع درکار ہوتا ہے..... جہاں ہم لوگ کمزور پڑے نہیں، ان لوگوں نے ہمیں پکڑا نہیں....."

وقار نے اسے گھور کر دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔

"میرا آنا تمہیں برا لگا.....؟" انسپکٹر جاوید نے تھانیدار کو بہ غور دیکھا۔

"نہیں سر....." وہ جلدی سے بولا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا..... بات تو یہ ہے کہ بھوت پریت کسی کے قابو میں تو آتے نہیں..... اب آپ بھی کیوں اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالیں..... ویسے تو ہم لوگوں نے عوام کو سختی سے ادھر کا رخ کرنے سے منع کردیا ہے..... اس لئے اب معاملہ اتنا سنگین نہیں رہا....."

"آخری آدمی کب غائب ہوا تھا.....؟"

"ایک ہفتہ پہلے....."

"اور اس سے قبل.....؟"

"اسی مہینے کے شروع کی تاریخوں میں ایک بندہ غائب ہوا تھا....."

"یعنی مہینے میں دو انسان....." انسپکٹر جاوید نے سر ہلایا۔ "یہ تناسب کم تو نہیں ہے.....!"

تھانیدار تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"اب نئے آنے والوں کا کیا کریں..... ہر ایک کے پیچھے تو ڈھول بجانے سے رہے....."

"ڈھول بجانا آپ کو شیوہ بھی نہیں دے گا....." انسپکٹر جاوید مسکرایا، پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا۔

"میں اپنے طور پر اس معاملے کو دیکھوں گا..... اگر کسی موقع پر ضرورت پڑی تو آپ کو ضرور تکلیف دوں گا..... اب میں چلتا ہوں....."

☆.....☆.....☆

لاج ولا..... یہ حویلی شہر کے جس حصے میں واقع تھی، وہاں زیادہ تر پرانی وضع قطع کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ اگر اس جگہ کو آثار قدیمہ سے جوڑ دیا جاتا، تو چند ایک گھر ہی ہوتے کہ جو قابل اعتراض ٹھہرتے.....

ایک وسیع چار دیواری کے اندر بنا ہوا چند کمروں پر مشتمل یہ لاج ولا اپنے نام ہی کی طرح پراسرار اور اپنی خاصیت کی طرح خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

لاج ولا میں داخل ہونے سے پہلے ان دونوں کو علاقے کے لوگوں کی تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔

انسپکٹر جاوید سادہ لباس میں ملبوس تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ عجیب سی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

"یار..... انسپکٹر صاحب" وقار نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔ "میرا خیال ہے کہ لوگ ہمیں پاگل سمجھ رہے ہیں....."

"اگر وہ ایسا سمجھ رہے ہیں....." انسپکٹر جاوید نے جواب دیا۔ "تو تمہیں کیا فرق پڑے گا.....؟"

"بات تو ٹھیک ہے..... لیکن....."

"کیا تم پہلے اس عمارت کے اندر گئے تھے.....؟"

"نن..... نہیں....." اس کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جاوید نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب.....؟" تم نے لاج ولا کا معائنہ نہیں کیا تھا؟"

"بالکل بھی نہیں....."

"تو پھر..... اتنا بڑا فیچر تم نے کیسے لکھ مارا.....؟"

"لوگوں کے تاثرات اور بیانات سے میں نے یہ کام کیا تھا..... لاج ولا کو دیکھا ضرور تھا..... لیکن دور سے....."

"واہ میرے شیر..... تم واقعی ماسٹر ہو....." انسپکٹر

جاوید نے ہنس کر اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کر دی۔
عمارت کی چار دیواری سے گزرنے کے بعد اب وہ لاج ولا کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔
پھر جیسے ہی انسپکٹر جاوید نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنا چاہا عقب سے ایک گونج دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔
"رک جاؤ..... اندر مت جانا..... خبردار....."
دونوں چونک کر مڑے۔
☆.....☆.....☆
چہار دیواری کے صدر دروازے پر ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا انہیں گھور رہا تھا۔
اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ کوئی غریب سا آدمی دکھائی دے رہا تھا، اس کے چہرے پر دونوں قدرتی رنگوں کی آمیزش لئے ہوئے داڑھی اور مونچھیں موجود تھیں.....
دونوں خاموش رہے تھے، اتنی دیر میں ادھیڑ عمر شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان کے قریب آن پہنچا۔
"کون ہو تم لوگ....." اس کا لہجہ درشت تھا۔
"سوچے سمجھے بغیر اندر گھسے۔" چلے جا رہے ہو..... اپنی زندگیوں سے بے زار ہو گیا.....؟"
"آپ کی تعریف.....؟" انسپکٹر جاوید نے خوش مزاجی سے پوچھا۔
"میری کیا تعریف ہو گی.....!" اس کا لہجہ نشتر کی مانند تھا۔ "میں تو ملازم ہوں نواب صاحب کا.....؟"
"یہ نواب صاحب کون ہیں.....؟"
"ان کی حویلی ساتھ میں ہے....." اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ بہت اچھے انسان ہیں..... اس لئے ان کا ملازم ہونے کے ناطے میرا ابھی یہ فرض ہے کہ میں کسی کو غلط راستے پر اور نقصان والا کام کرنے پر اسے روکوں..... میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اندر مت جاؤ..... ورنہ کسی انجانی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے....."
"ہم لوگ مصیبتیں مول لینے والوں میں سے ہیں....." انسپکٹر جاوید مسکرایا۔ "اس لئے اندر تو ضرور جائیں گے....."
"تمہاری ضد..... تمہاری نادانی ہے..... اچھا..... تم دونوں جاؤ..... میں اب نہیں روکوں گا..... جو میرا فرض تھا..... میں نے پورا کر دیا..... میں جا رہا ہوں....."
اتنا کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا..... اس طرح چلنا شاید اس کی عادت تھی۔
انسپکٹر جاوید اور وقار اندر داخل ہو گئے، دن کا وقت ہونے کے باوجود یہاں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک راہداری سے گزرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔
چاروں طرف ایک ہیبت ناک قسم کی خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔
اس کمرے میں پرانی وضع کا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ جو ٹوٹا پھوٹا بھی تھا۔ اسی کمرے کے کونے میں ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔
انسپکٹر جاوید نے اسی جانب قدم بڑھا دیئے۔
وقار نے فوراً ہی اس کا بازو پکڑ لیا۔
"اب کہاں.....؟"
"اندر چلو..... ادھر بھی دیکھتے ہیں....."
"خدا کے لئے....." وقار نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
"اب واپس چلیں..... آپ کی شادی تو ہو چکی ہے، لیکن میں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں اور یہ حسرت لے کر دنیا سے نہیں جانا چاہتا....."
"چلو اندر....." انسپکٹر جاوید نے اسے دھکا دیا۔
"کیوں کسی بے چاری لڑکی کے نصیب پھوڑنے کے چکر میں ہو....."
وقار نے منہ بسورا اور اس طرح قدم اٹھا دیئے، جیسے بادل نخواستہ آگے بڑھ رہا ہو.....
انسپکٹر جاوید نے دروازہ کھول دیا۔ یہ کمرہ پہلے کی نسبت کافی بڑا تھا..... یہاں بھی اندھیرا تھا۔
لیکن یہاں دو کھڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جو

بند تھیں۔
انسپکٹر جاوید نے انہیں کھول دیا، کمرہ گویا روشن ہو گیا۔ یہاں بھی اسی ٹائپ کا سامان موجود تھا۔
اس کمرے کی دیواروں پر لال لال دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ جو شاید خون کے دھبے تھے۔ اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی رنگت سیاہ مائل ہو گئی تھی۔
یہ منظر دیکھ کر وقار کی آنکھوں میں حقیقت میں خوف دوڑ گیا..... اس نے ایک جھرجھری لی اور آہستہ سے بولا۔
"یہ..... یہ تو خون ہے....."
"ہاں....." انسپکٹر جاوید نے مختصر جواب دیا۔
اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا، وہ کافی محتاط اور چوکنا دکھائی دے رہا تھا۔
"یہ..... یہ..... کس کا خون ہو گا..... جاوید صاحب.....؟" وقار نے پھر کہا۔
"مجھے کیا پتا....." انسپکٹر جاوید جھلا سا گیا۔ "میری کوئی لیبارٹری تو ہے نہیں..... ہاں البتہ..... معلوم کرنا پڑے گا....."
وقار پھر کچھ نہیں بولا۔ وہ انسپکٹر جاوید کے موڈ کو کافی حد تک سمجھتا تھا کیونکہ وہ کافی مہمات میں انسپکٹر جاوید کے ساتھ کام کر چکا تھا۔
وہ ایک کرائم رپورٹر تھا، اسی وجہ سے ایک موقع پر دونوں کی ملاقات ہوئی تھی، اور پھر یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔
چند کیسز میں دونوں نے ساتھ مل کر کام کیا تھا، اور آج بھی اتفاق سے دونوں ساتھ تھے۔
وقار اس وقت اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ انسپکٹر جاوید کی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے، لہٰذا اسے چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔
"چلو..... فی الحال تو اتنا ہی کافی ہے..... پھر کسی وقت آئیں گے....."
یہ کہہ کر انسپکٹر جاوید نے وقار کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پھر دونوں آگے بڑھے۔

معلومات عامہ پر 10 بہترین کتابیں
معلومات تاریخ اسلام
اسلامی معلومات
معلومات سائنس
معلومات پاکستان
معلومات کھیل
معلومات تاریخ
معلومات ممالک
جدید معلومات
معلومات جغرافیہ
عالمی معلومات
مرتب: شاعر علی شاعر
قیمت:-/40 روپے
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
شمع بک ایجنسی
نوید اسکوائر اردو بازار کراچی
Ph:32773302

دفعتاً دروازے کے قریب پہنچ کر انسپکٹر جاوید جھکا اور کونے میں پڑی ہوئی چھوٹی سی کوئی چیز اٹھالی۔

وقار نے دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا مجسمہ تھا..... جو شاید کسی جانور کا تھا۔

انسپکٹر جاوید نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر جیب میں ڈال لیا۔

واپسی میں انسپکٹر جاوید نے ہوٹل کے بجائے ایک بار پھر تھانے کا رخ کیا۔

تھانیدار نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... مجھے ایک بار پھر آنا پڑا....." انسپکٹر جاوید نے سر ہلایا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ لاج ولا کی دیواروں پر جو خون کے نشانات ہیں..... مجھے خون کی میڈیکل رپورٹ درکار ہے..... مل جائے گی.....؟"

"نوسر....." وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "ہم لوگوں کو تو اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی....."

"لیکن میں اشد ضرورت محسوس کر رہا ہوں....." انسپکٹر جاوید بولا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے غائب ہونے والے تمام لوگوں کا ریکارڈ چاہئے..... دن اور تاریخ کے ساتھ....."

"کیا آپ نے کوئی اندازہ لگایا ہے.....؟"

"نہیں..... ابھی تو میں مکمل اندھیرے میں ہوں..... اچھا..... اب یہ بتاؤ کہ مجھے لاج ولا کے بارے میں صحیح اور واضح معلومات کون دے سکتا ہے..... میرا مطلب ہے کہ اس کے مالک کے بارے میں اور....."

"آپ نواب دولت مرزا سے رابطہ کریں....." تھانیدار نے فوراً اس کی بات کاٹی: "آپ ان سے مل لیں..... میں انہیں اطلاع کروا دیتا ہوں، وہ آپ سے ہر ممکن تعاون کریں گے..... ویسے کیا آپ کو شک ہے کہ لاج ولا میں کوئی اوپری چیز ہے.....؟"

"ابھی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں....." انسپکٹر جاوید بولا۔ "سب کچھ ممکن ہے..... ناممکن کچھ بھی نہیں ہے....."

"یہ بھی ٹھیک ہے....." تھانیدار نے سر ہلایا۔

"نواب دولت مرزا سے کہاں ملاقات ہو سکے گی.....؟"

☆.....☆.....☆

دولت کا دوسرا مطلب ہوتا ہے غرور..... لیکن نواب دولت مرزا اپنے نام کے بالکل برعکس ثابت ہوا۔

لاج ولا کے عقب میں اس کی شاندار حویلی تھی۔ جو اس نے چند سال قبل ہی بنوائی تھی، اگرچہ یہ اس کے پرکھوں کی نشانی تھی..... لیکن وہ خود چند سال پہلے ہی اس حویلی میں مقیم ہوا تھا۔

40 اور 50 سال کی درمیانی عمر میں ابھی تک نواب نے شادی نہیں کی تھی۔

اپنے 4 نوکروں کے ساتھ وہ اس حویلی میں تن تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ البتہ اس کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت رہتی تھی، جن میں زیادہ تر تعداد اس کے دوستوں کی ہوتی تھی۔

اس کے چوڑے چکلے اور بھرے ہوئے جسم کے باعث وہ اپنی عمر سے کافی کم کا دکھائی دیتا تھا۔ انسپکٹر جاوید نے خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بات نوٹ کی تھی۔

جب وہ ہنستا تھا تو آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ اس کی آنکھیں کسی اجاڑ اور بیابان کی طرح کرب میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

جب انسپکٹر جاوید نے تعارف کروایا تو وہ بہت والہانہ انداز میں ان دونوں سے ملا۔

پھر وہ انہیں اپنے ساتھ مہمان خانے میں لے آیا۔

"ہم تم سے اور تمہارے کارناموں سے پہلے ہی واقف تھے....." نواب کا انداز شاہانہ تھا۔ "اور آج قسمت نے تم سے ملاقات بھی کروا دی..... بہت خوب..... تم تو کافی مشہور شخصیت کے مالک ہے....."

"شکریہ....." انسپکٹر جاوید نے سر کو خم کیا۔

مہمان خانے میں بڑے بڑے آرام دہ اور صاف ستھرے بستر موجود تھے۔

آرام سے بیٹھنے کے بعد انسپکٹر جاوید نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا:

"اگر تم لاج ولا کو نہ چھیڑو تو بہتر ہے....." نواب کے لہجے میں تشویش تھی: "کیونکہ اس کی بناء پر خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے..... اس میں کوئی انسانی ہاتھ برسر پیکار نہیں ہے..... تم کیا کر سکو گے اس معاملے میں.....؟"

"اپنی کوشش....." انسپکٹر جاوید کا جواب تھا۔

"انسانی جان بہت قیمتی ہوتی ہے....."

"تمہاری بات درست ہے..... لیکن کیا تم ہوا سے لڑو گے.....؟"

"لڑائی کا فیصلہ تو بعد میں ہی ہو سکے گا..... پہلے تو اسباب کا پتہ چلے....."

"میں تم کو بتاتا ہوں کہ اصل کہانی کیا ہے.....!" نواب نے کہا۔

"جی....." انسپکٹر جاوید ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وقار بھی نواب کی شکل دیکھنے لگا۔

"ایسے نہیں بتاؤں گا....." نواب مسکرایا۔ "پہلے دسترخوان لگے گا..... پھر باتیں ہوں گی....."

ایک پر تکلف سی دعوت کے بعد وہ لوگ اٹھ کر دالان میں آ کر بیٹھ گئے۔

یہاں چائے کا دور چلا، اس دوران نواب نے بتایا۔

"کسی زمانے میں رانگا نامی ایک ڈاکو تھا..... وہ اپنی لوٹا ماری کی دولت اور مال و متاع اسی لاج ولا میں چھپایا کرتا تھا..... کہاں.....؟ یہ خود اسے ہی معلوم تھا..... وہ ایک ذہین اور ماہر شخص تھا، اس کی دشمنیاں بھی بہت تھیں، جہاں اس کے گرد دوستوں کا گھیرا ہوتا تھا، وہیں اس نے دشمن بھی پال رکھے تھے..... پھر یوں ہوا کہ وہ کسی کے ہاتھوں اس لاج ولا میں مارا گیا..... کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑتا تھا کہ جس سے پولیس اس پر ہاتھ ڈال سکے..... اس لئے یہ بھی کہا جانے لگا کہ پولیس والوں نے ہی اسے غیر سرکاری طور پر مروایا تھا.....

وقت گزرتا رہا..... اور پھر حالات و واقعات نے یہ ثابت کیا کہ لاج ولا میں رانگا ڈاکو کی روح بھٹکتی ہے..... اور جو شخص وہاں جاتا ہے وہ اسے موت کی آغوش میں سلا دیتی ہے....."

"نواب کے الفاظ سنسنی خیز تھے..... کم از کم وقار تو مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جاوید نے پوچھا۔

"لیکن..... جو لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، وہ ادھر کا رخ ہی کیوں کرتے ہیں.....؟"

"لالچ.....؟" نواب عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "یہ بات بھی مشہور ہے کہ لاج ولا میں آج بھی رانگا ڈاکو کی چھپائی ہوئی دولت اور لوٹا ہوا مال موجود ہے..... شاید لوگ اسی چکر میں ادھر کا رخ کرتے ہیں اور مارے جاتے ہیں.....!!"

ایک بار پھر فضاء میں خاموشی کے بادل چھا گئے.....

"بڑی عجیب و غریب کہانی ہے....." تھوڑی دیر بعد وقار بڑبڑایا۔

"اور دلچسپ بھی....." انسپکٹر جاوید نے لقمہ دیا۔

"ارے ہاں....." دفعتاً نواب چونکا۔ "تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو.....؟"

"ہوٹل سب رنگ میں.....!"

"کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں رہنے کی....." نواب نے کہا۔ "اپنا سامان یہاں لے آؤ..... پہلی فرصت میں ہوٹل چھوڑ دو..... نوکروں کو لے جاؤ اور اپنا سامان اٹھالاؤ....."

"ارے نہیں نواب صاحب.....!" انسپکٹر جاوید نے ٹال مٹول کی: "ہمارا سامان تو بہت مختصر سا ہے اور ہم وہیں ٹھیک ہیں....."

"بالکل ٹھیک نہیں ہے....." نواب کا لہجہ سخت

ہوگیا۔ ''تم غیروں والی بات مت کرو..... ادھر ہی آجاؤ..... اور ہاں..... اب تمہارا کیا ارادہ ہے.....؟ تم لاج ولا کے لئے کیا کرو گے.....؟''

''میری آج کی رات.....'' انسپکٹر جاوید کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ''وہیں گزرے گی.....''

دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد نواب کے ہونٹ ہلے۔

''ہمارے کانوں نے کہیں..... دھوکا تو نہیں کھایا.....؟''

''نہیں نواب صاحب..... آپ نے وہی سنا، جو میں نے کہا ہے.....''

''برخوردار.....'' نواب کا لہجہ نرم تھا۔ ''تمہارے بارے میں تو سنا تھا کہ تم بہت ذہین اور موقع شناس انسپکٹر ہو..... تمہارے کارنامے تو خود ہم بھی بڑے شوق سے اخبارات میں پڑھتے ہیں..... پھر یہ عقل سے ماورا جملہ تم نے کیوں بولا.....؟''

''میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں.....'' انسپکٹر جاوید نے جواب دیا۔ ''میری آج کی رات لاج ولا میں ہی گزرے گی..... میں نے فیصلہ کرلیا ہے.....''

''جو کچھ وہاں ہے..... وہ تو دور کی بات ہے انسپکٹر صاحب.....'' نواب نے کہا۔

رات کو بسا اوقات وہاں جو آوازیں گونجتی ہیں..... وہی تمہیں پریشان کردیں گی..... یقین کرو.....!''

''ٹھیک ہے..... میں آپ کی بات پر غور کروں گا.....'' انسپکٹر جاوید نے اسے دیکھا۔ ''ویسے ان آوازوں کا ذکر آپ نے پہلے نہیں کیا.....؟''

''تم نے رات کو رکنے والی بات بھی تو اب کی ہے.....'' وہ فوراً بولا۔ ''ہمیں کہاں علم تھا کہ تم یہ فیصلہ بھی کر گزرو گے.....''

''اوکے..... اب یہ سوچنا پڑے گا.....''

تھوڑی دیر بعد دونوں وہاں سے رخصت ہوگئے، باہر نکلتے وقت ان کی نظر حویلی کے پائیں باغ پر پڑی۔

وہاں ایک مالی پیڑوں میں پانی ڈال رہا تھا۔ انسپکٹر جاوید نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو انہیں لاج ولا میں جانے سے روک رہا تھا۔

وہ حویلی کے احاطے سے نکل آئے۔

☆.....☆.....☆

خون کی رپورٹ کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی، البتہ تھانیدار نے ایک چھوٹی سی فائل انسپکٹر جاوید کے حوالے کردی۔

''اس میں ان سب لوگوں کے نام وغیرہ درج ہیں..... جو لاج ولا کا شکار ہوئے ہیں.....''

''ٹھیک ہے.....'' انسپکٹر جاوید بولا۔ ''اب مجھے کچھ ضروری سامان بھی مہیا کردو..... تاکہ میں اپنے آپ کام کا آغاز کرسکوں.....''

''بالکل جناب..... آپ حکم کریں.....'' تھانیدار نے جواب دیا۔

انسپکٹر جاوید نے سر ہلا دیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اسے کون سا سامان درکار ہے۔

''آپ..... ایک بار پھر سوچ لیں.....'' تھانیدار نے چلتے چلتے اسے کہا۔ ''لاج ولا میں موت کا رقص ہوتا ہے..... کیا آپ کسی اندیکھی مصیبت یا طاقت کا مقابلہ کرسکیں گے.....؟''

''دشمن وہ ہوتا ہے جو دکھائی دیتا ہے.....'' انسپکٹر جاوید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''پھر مقابلہ کس بات کا.....؟''

تھانیدار خاموش ہوگیا۔ ویسے اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انسپکٹر جاوید کو اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے روکنا چاہ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جاوید کو سامان مہیا کردیا گیا اور وہ سامان لے کر روانہ ہوگیا۔

اس کے جاتے ہی تھانیدار نے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھالیا اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

لاج ولا میں شاید آج پہلی بار اتنی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

یہ لائٹس انسپکٹر جاوید تھانے سے لے کر آیا تھا۔ اب یہ اور بات تھی کہ روشن ہونے کے بعد لاج ولا کی ویرانی میں مزید اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔

عمارت کے احاطے سے گزرتے ہوئے وقار نے سرگوشی کی۔

''استاد.....! اب تو میں بھی یہی کہوں گا..... اندر جانے سے پہلے تھوڑا سا غور فرمالیجئے.....!''

''کیا تم کو بھی ڈر لگ رہا ہے.....؟''

''ڈر تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے..... میں تشریح نہیں کرسکتا کہ کیا لگ رہا ہے.....''

''تو پھر..... تم واپس ہوٹل پہنچو.....'' انسپکٹر جاوید نے سنجیدگی سے کہا۔ ''زندگی رہی تو صبح ملاقات ہوگی.....''

''آپ بھی چلو.....''

''میری واپسی اب صبح ہوگی.....''

''تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا.....'' وقار نے جواب دیا۔ ''جو کچھ بھی ہوگا۔ دونوں کے ساتھ ہوگا.....''

''تو پھر..... بسم اللہ کرتے ہیں.....''

''انسپکٹر جاوید چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا، پھر وہ لاج ولا کے صدر دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے.....'' جیسے..... کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو.....

وقار نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کیوں ڈرا رہے ہیں سر جی.....!'' وہ بولا۔

''ابھی تو ہم لوگ باہر ہی کھڑے ہیں..... چلئے واپس چلتے ہیں.....''

''نہیں..... اندر چلو.....''

انسپکٹر جاوید نے ایک باور پھر چاروں طرف دیکھا اور پھر دروازے کو دھکا دیا۔

ایک گونجدار سی چرچراہٹ کے بعد دروازہ کھل گیا۔

انسپکٹر جاوید نے اندر قدم رکھ دیا، روشنی کا دائرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

پھر وہ دونوں اندر آپہنچے، دن کے مقابلے میں اس وقت یہاں کے در و دیوار کئی گنا زیادہ ہیبت ناک دکھائی دے رہے تھے۔

دیواروں پر پڑنے والے ان کے اپنے سائے بھی اس ماحول میں بھوت پریت سے کم نہیں لگ رہے تھے۔

انسپکٹر جاوید نے محسوس کیا کہ وقار اس سے لگ کر چل رہا تھا، بزدل یا ڈرپوک تو وہ بھی نہیں تھا..... لیکن اس وقت شاید لاشعوری طور پر وہ لاج ولا سے منسلک ہونے والی داستانوں سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

دن کی نسبت اس وقت انسپکٹر جاوید کافی باریک بینی سے ہر طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

دوسرے کمرے سے گزرتے ہوئے داہنی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا۔

انسپکٹر جاوید نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھول دیا..... سامنے سیڑھیاں نیچے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔

''تہہ..... خانہ.....'' انسپکٹر جاوید بڑبڑایا۔

''یہ کیا ہے سر جی.....'' وقار بھی آگے جھک آیا۔

''آؤ..... دیکھتے ہیں.....'' انسپکٹر جاوید آگے بڑھا۔

''خبردار..... جو آگے بڑھے.....'' دفعتاً عقب سے آواز آئی۔

دونوں تیزی سے گھومے۔

سامنے نواب دولت مرزا اپنے چاروں نوکروں کے ساتھ کھڑا تھا، اور سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

وقار ہکا بکا رہ گیا۔ البتہ انسپکٹر جاوید بڑے سکون سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

اس وقت یہ وہ نواب تو نہیں لگ رہا تھا۔ جس سے انہوں نے دن کے وقت ملاقات کی تھی۔

آنکھوں میں عیاری اور چہرے پر سفاکی بکھیرے ہوئے نواب دو قدم آگے بڑھا۔

"تم ایک نامور پولیس انسپکٹر ہو......" نواب نے اسے مخاطب کیا۔ "اس لئے ہم نے پوری کوشش کی، کہ تم زندہ سلامت یہاں سے واپس چلے جاؤ...... لیکن تم نے ہماری باتوں پر نہ تو عمل کیا اور نہ ہی یقین کیا...... اور اب تم یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے......"

"اس تہہ خانے میں ہے کیا......؟" انسپکٹر جاوید نے اس کی باتوں کو یکسر نظر انداز کر کے پوچھا۔

"مرنے والے کو ان سب باتوں سے کیا سرو کار......" نواب نے خفگی ظاہر کی۔

"میں بتادوں......؟" انسپکٹر جاوید نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

یہ سن کر نواب اور اس کے ساتھی چونک اٹھے، خود وقار بھی حیرت سے انسپکٹر جاوید کی شکل دیکھنے لگا۔

"ت...... تم کیا جانو......؟" نواب کے منہ سے نکلا۔

"آج سے پہلے تو میں واقعی کچھ نہیں جانتا تھا......" انسپکٹر جاوید نے جواب دیا۔ "لیکن ایک ہی دن میں، میں بہت کچھ جان چکا ہوں......

لاج ولا میں یہ میرا دوسرا نہیں...... بلکہ تیسرا چکر ہے...... میں شام کے وقت تنہا یہاں آیا تھا......"

"اوہ...... جب میں سو رہا تھا......؟" وقار نے لقمہ دیا۔

"ہاں......" انسپکٹر جاوید نے اسے جواب دیا اور پھر دوبارہ نواب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "میں جب پہلی بار یہاں آیا تھا تو مجھے ایک کمرے سے تمہارا وزیٹنگ کارڈ ملا تھا...... وہ میں نے جیب میں ڈال لیا...... یہ ایک عجیب سی بات تھی...... کہ تمہارا کارڈ یہاں پڑا ہوا تھا...... تم تو خود یہاں کے بھوتوں کی کہانی سنا رہے تھے...... پھر تمہارے کارڈ کا یہاں کیا کام......؟ دوسری بار یہاں آ کر میں نے یہ تہہ خانہ دریافت کیا...... جہاں تم نے جعلی نوٹ بنانے کا کارخانہ کھول رکھا ہے......!"

"جعلی نوٹوں کا کارخانہ......!" وقار نے منہ پھاڑ کر کہا۔

"ہاں...... یہ لوگ یہاں پر یہی گھناؤنا کام کرتے ہیں...... اور وہ بھی کافی بڑے پیمانے پر...... یہاں پر خوف و ہراس پھیلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں زمین دوز رہ کر سکون سے یہ کام ہوتا رہے...... اور کوئی ادھر جھانکنے بھی نہ آئے...... یہ بالکل غلط اور من گھڑت بات ہے کہ یہاں پر آ کر لوگ غائب ہوجاتے ہیں...... جو لسٹ اس تھانیدار نے مجھے دی تھی...... اس پر میں نے کافی حد تک انکوائری کرلی ہے...... وہ لسٹ بالکل جھوٹی اور بکواس ہے...... کیوں نواب......؟ وہ تھانیدار بھی تمہارے ساتھ ملوث ہے نا......؟"

"ہاں......" نواب نے سکون سے جواب دیا۔

"اور اب تم اپنی فکر کرو...... تم اب اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں دیکھ رہے ہو......"

"اپنے بارے میں یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتی......" انسپکٹر جاوید نے جواب دیا۔

پھر وہ بلند آواز سے بولا۔

"آجاؤ بھئی...... گھوڑا تیار ہے......"

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی بیرونی دروازے سے کئی افراد ہاتھوں میں اسلحہ لئے ہوئے اندر داخل ہوگئے، ان کے جسموں پر سادہ لباس تھے۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو تم لوگ......" انسپکٹر جاوید نے نواب وغیرہ کو مخاطب کیا۔ "یہ بھی انٹیلی جنس کی فورس ہے...... شاباش......"

نواب اس اچانک افتاد کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھا، اس کے ساتھیوں کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

نواب کے چہرے سے پسینہ پھوٹ پڑا، اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بے چارگی کے عالم میں اپنی پستول فرش پر پھینک دی۔

اس کے ساتھیوں نے بھی فوراً اسی بات پر عمل کیا، جلد ہی وہ لوگ جانبازوں کے نرغے میں تھے۔

لاج ولا کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا......

نیوو کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے

پرہول لمحہ

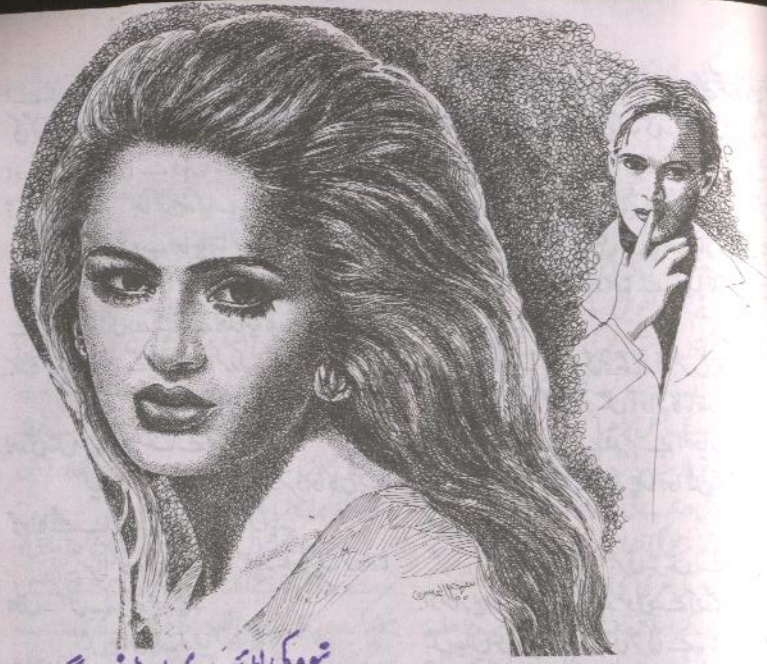

ساحل دعا بخاری - بصیر پور سیالکوٹ

دفعتاً گڑگڑاہٹ کا دیوتا عالم اشتعال میں گرجا، آسمانی بجلیاں چار سو سے زمین کی طرف لپکیں، لڑکی نے ایک خوفزدہ چیخ ماری اس کا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا پھر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی اور اس کی ہیت بدلنے لگی۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی دل کو دہلاتی ایک ناقابل فراموش حقیقی کہانی

26 ستمبر کی وہ رات بڑی ہولناک تھی۔ شیفرڈ میرا کولیگ ہونے کے علاوہ اچھا دوست بھی تھا۔ اس کے بھائی کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔ میں اس کے پاس ہی تھا جب اسے فون پر یہ اطلاع ملی۔ شیفرڈ اپنے چھوٹے بھائی جان سے بہت پیار کرتا تھا۔ یہ سنتے ہی وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں آیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔ جان کی میت آبنوسی تابوت میں تھی۔ اس کے چہرے پہ خوف و ہراس منجمد ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر جب اجتماعی دعا مانگی گئی تو شیفرڈ سے اجازت لے کر میں واپسی کے لئے نکلا۔

قبرستان کے دروازے کے پاس شاہ بلوط کے درخت سے ٹیک لگائے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سیاہ لباس میں حزن و ملال میں ڈوبا وہ حسین مجسمہ بڑا دلفریب تھا۔

اسے میں کچھ دیر قبل قبرستان میں دیکھ چکا تھا۔ غالباً یہ جان کی گرل فرینڈ تھی۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہورہی تھیں۔ میں نے وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر بیٹھ گیا۔ جب ہم وہاں سے راونہ ہوئے تو سورج غروب ہوا چاہتا تھا کہ یکا یک بادلوں کو نجانے کیا سوجھی کہ یکجا ہو کر جارحانہ انداز میں گرجنے لگے۔ مزید تھوڑی دور چلنے کے بعد اچانک ٹیکسی نے ایک جھٹکا کھایا اور اس کے ٹائر چرچرا کر رک گئے۔

"اوہ نو۔" ڈرائیور کچھ دیر بونٹ سے چھیڑ چھاڑ کے بعد نفی میں سر ہلا کر تاسف سے بولا۔

"کیا ہوا؟" میں بھی باہر نکل آیا۔ سرد ہوا کا یخ بستہ جھونکا مجھے بے اختیار کپکپانے پہ مجبور کر گیا۔

"سر! انجن میں کچھ فالٹ ہے۔ میں ٹھیک کروالاتا ہوں۔" اس نے ہاتھ پونچھے۔

"میں یہاں رک کر کیا کروں گا؟"

"او کے سر! آپ بھی آجائیں، ویسے بھی یہاں رکنا کمزور دل لوگوں کے لئے مناسب نہیں؟" وہ ہنسا۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔ "یہاں بھوت پریت اور بھٹکی ہوئی روحیں منڈلاتی رہتی ہیں۔"

"واہ! تو پھر تم جاؤ۔ میں یہاں رک کر ویٹ کرنا پسند کروں گا۔ ہوسکتا ہے کسی چڑیل حسینہ سے ملاقات ہوجائے۔" میں نے شوخی سے کہا۔

وہ ہنستا ہوا گاڑی دھکیلتا چلا گیا۔ قریباً ایک کلومیٹر پیچھے ایک ورکشاپ تھی، وہ وہیں جارہا تھا.....

شام کا ملگجا اندھیرا چار سو پھیلا تھا۔ وہ سڑک سے اوجھل ہوا تو میں گنگناتے ہوئے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

سڑک کے دونوں اطراف درخت تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنا فیورٹ سانگ گنگنانے لگا۔ درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک شاخ کو تھاما۔ میرے ہاتھ میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں نے بے اختیار ہاتھ جھٹکا۔ میری یہ حرکت اضطراری تھی۔ میں نے موبائل کی ٹارچ آن کی اور ششدر رہ گیا۔

ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ میں نے چند منٹ میں اپنے بھاری بوٹ سے اس کا پھن کچل ڈالا۔ میں ابھی فارغ ہوا ہی تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ بادل کڑک رہے تھے۔ گاہے بگاہے بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ جنگل کی بارش کا آہنگ ہی اور ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔

معاً ایک چیخ ابھری تو میں بری طرح چونکا۔

چیخ پھر ابھری تو میں آواز کا ماخذ جاننے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے قدم بے اختیار اس طرف اٹھنے لگے۔ درختوں کے بیچ چلتا ہوا میں کافی حد تک بھیگ چکا تھا۔

چیخ ایک بار پھر ابھری۔ میں نے بیلٹ میں اڑسا ریوالور نکالا اور محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ یہ تو میں جان ہی گیا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ تاہم وہ کیوں چیخ رہی تھی؟ یہ جاننے تک مجھے از حد احتیاط سے کام لینا تھا۔ ممکن تھا وہ کسی ڈاکو وغیرہ.....

بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ وہ اکیلی تھی۔

"کون ہو تم اور چیخ کیوں رہی ہو؟" وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"وہ مجھے..... ایک شخص..... میں نے ایک شخص سے لفٹ لی، راستے میں اس کی نیت خراب ہوگئی، اور میں اسے زخمی کر کے فرار ہوگئی اور یہاں چھپ گئی۔"

"لیکن تم چیخ کیوں رہی تھیں؟" میں نے ٹارچ آن کی۔ اس نے سیاہ میکسی پہن رکھی تھی۔ اس کا سفید بدن آنکھوں کو خیرہ کررہا تھا۔ "مجھے تنہائی سے اور..... بارش سے بہت ڈر لگتا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی تو میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

دفعتاً گڑگڑاہٹ کا دیوتا عالم اشتعال میں گرجا۔ آسمانی بجلیاں چار سو سے زمین کی جانب لپکیں اور نورانی کسی انجانے خوف کے زیر اثر واپس اس سمت پرواز کر گئیں جدھر سے آئی تھیں۔

لڑکی نے ایک خوفزدہ چیخ ماری اور مجھ سے آن واحد میں لپٹ گئی۔ اس کا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بارش میں شرابور اس کے وجود سے اٹھتی مسحور کن مہک مجھے مدہوش کرنے لگی۔ سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے ہوتے ہوئے پورے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔

اچانک وہ لڑکی گویا کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے حلق سے زبردست گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی تھی۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور بے اختیار ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگا۔ بجلی پھر لہرائی اور میں دھک سے رہ گیا۔ اس حسین ترین لڑکی کی جگہ اب ایک بھیانک شکل بڑھیا تھی۔ جھریوں بھرا کٹا پھٹا چہرہ اور ادھ کھلا پوپلا منہ..... "گلے میں کیا پہنا ہے؟" اس کی آواز میں جنگلی درندے کی سی غراہٹ تھی۔

میرا ہاتھ میکانکی انداز میں لاکٹ کو چھو گیا۔ نفیس چین کے سرے پر لٹکی نقرئی ننھی سی صلیب.....

میں اک گہرا سانس لے کر سڑک کی جانب بڑھا۔ مجھے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گردن ترچھی کر کے دیکھا تو وہ خوفناک تیوروں سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ میں اتنا بزدل تو کبھی بھی نہ رہا تھا۔ مگر نجانے کیا ہوا کہ میں ہراساں ہو کر بھاگ اٹھا۔ زندگی میں پہلی بار میرا واسطہ کسی مافوق الفطرت شے سے پڑا تھا، شاید اسی لئے میں حواس باختہ ہوگیا تھا۔ میں کافی دیر تک بھاگتا رہا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ جنگلی جھاڑیاں میرے پیروں سے الجھتی رہیں۔ میرا سانس بھری طرح پھول رہا تھا۔ سینہ یوں پھول پچک رہا تھا گویا ایک زوردار دھماکے سے بے شمار ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ بالآخر میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دفعتاً میرے پیر سے کوئی شے ٹکرائی میں خوفزدہ ہو کر اچھلا۔ میرے دائیں ہاتھ نے ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔

روشنی کا دائرہ اس شے پر پڑا اور میں ٹھٹک گیا۔ وہ ایک انسانی سر تھا۔ نسوانی سر..... سنہری ریشمی بال، لپ اسٹک میں لتھڑے ہونٹ، سفید دہکتے گال اور نیلی آنکھیں جو یک ٹک مجھ پر جمی تھیں۔ ایسا حسین چہرہ جتنا دلفریب لگتا ہے، اس وقت اتنا ہی بھیانک اور کریہہ لگ رہا تھا۔ مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ دھیرے دھیرے چمک دار کھال پگھلنے لگی اور خوب صورت نقوش بگڑنے لگے۔ جگہ جگہ سے ادھڑی کھال اور اس سے جھانکتے خون بھرے گوشت نے میرا جی متلا دیا۔ معاً وہ ہوا میں معلق ہوا، میرے سر پر جھپٹا۔ یعین ایسا لگا کہ بجلی کا کوندا سا لپک گیا ہو۔ ٹارچ پھر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑکھڑاتی ہوئی نم زمین پر گری اور میں اضطراری انداز میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ میرا سر کسی درخت کے تنے سے ٹکرایا۔ شدید ترین درد کی ایک لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میری آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچ گئے اور ذہن پاتال کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا اور میں نے حرکت کرنا چاہی تو سر سے درد کا غبار اٹھنے لگا۔ میں نے چند ساعت کو آنکھیں موند کر درد پہ قابو پایا اور اٹھا۔ بارش جی بھر کے برسنے کے بعد تھم چکی تھی۔ ہوا دم سادھے ساکن تھی اور تاریکی کسی نابینا عقاب کی مانند ارد گرد چکراتی پھرتی تھی۔ میں نے لائٹر کی روشنی میں ٹارچ ڈھونڈی اور گھنے درختوں میں سے گزرنے لگا، ہر اس میرے قدموں سے لپٹا پڑا تھا۔

بے قراری کسی زہریلی ناگن کی صورت میں پھن پھیلائے مجھے ڈس لینے کو بے تاب تھی۔ سڑک پر پہنچ کر بے قراری پرسکون کی مہین سی دھند لپٹ گئی۔ میں سڑک پر چلنے لگا۔ قد آدم درخت کسی انجانے خوف کے زیر اثر دم سادھے ہوئے تھے۔ ہوا وقت کے طلسم میں جکڑی بے بس پڑی تھی۔ پختہ سڑک پر میرے قدموں کی گونج سناٹے کی دیوار میں دور دور تک شگاف ڈالتی گئی۔

دفعتاً ایک کڑاکا ہوا، کسی درخت کی شاخ ٹوٹی تھی۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر سڑک پر بکھر رہی تھی۔ معاً ارد گرد سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ میرا وجود یکا یک چلا اٹھا کہ کوئی ہے۔ اگرچہ کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا..... مگر کسی نادیدہ وجود کی موجودگی اس قدر قوی تھی کہ میں لاکھ کوشش کے باوجود جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ نادیدہ قدموں کی

آہٹیں اور کسی ملبوس کی سرسراہٹیں۔

پھر یوں ہوا کہ خشک لکڑیاں سڑک کے عین بیچوں بیچ جمع ہونے لگیں۔ کوئی انہیں سڑک کے درمیان مجتمع کر رہا تھا۔ پھر قدموں کی آہٹ بائیں جانب گھنے درختوں میں معدوم ہوگئی۔ میں نے بٹن پش کیا۔ ٹارچ کی روشنی تاریکی کا کھوکھلا سینہ چیر گئی۔ میرا دل روئیں روئیں میں دھڑک رہا تھا اور رگیں ایسے تناؤ کا شکار تھیں گویا فوراً ایک دھماکے سے ہزاروں ٹکڑے ہوکر بکھر جائیں گی۔

آنے والے لمحات اپنے جلو میں کیا لے کر آنے والے تھے؟ میں بے خبر تھا۔ لحہ بہ لحہ میرے اضطراب میں اضافہ ہوا جارہا تھا۔ ذہن میں اندیشے پھنکارنے لگے تھے۔ ایک بوجھل سکوت جیسے اندھیرے میں گھلا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے قدموں کی آہٹ ابھرنے لگی۔ ساتھ ہی فضا میں ایک عجیب سی مہک پھیلنے لگی۔ اک نفیس مگر تیز مہک جو تمام قوت کو بے حس کئے دے رہی تھی۔ نادیدہ وجود لکڑیوں کے پاس رک گیا۔ میرے جسم کا تمام خون جھٹکے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔

اچانک ایک شعلہ لپکا اور لپکڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ شعلے لپکتے اور فضا میں ہی غائب ہوجاتے۔ معاً اس آگ سے چیخیں ابھرنے لگیں۔ خوف گزیدہ، اذیت بھری چیخیں..... دھیرے دھیرے آگ میں اک شبیہہ نمودار ہوئی۔ ایک بھیانک چہرہ جس کی کھال پگھل پگھل کر اسے مزید کریہہ بنا رہی تھی۔ اس چہرے سے طویل اذیت ناک چیخیں ابھر ابھر کر خاموشی کو زخمی کر رہی تھیں۔

یکلخت وہ شبیہ آگ سمیت مجھ پر جھپٹی۔ مجھے اپنے سینے کے اندر ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ دل ایک جھٹکے سے حلق میں آن پھنسا اور شہ رگ دھڑک اٹھی۔ میری آنکھیں بند ہوگئیں مجھے اپنے دائیں کندھے میں شدید ترین اذیت کے انگارے گھستے محسوس ہوئے۔ درد تھا، بہت بے درد، درد تھا..... جلن تھی، بے حساب جلن تھی، اذیت تھی، بے پناہ اذیت تھی۔ وہ ناقابل فراموش لمحات تھے اور ناقابل بیان جلن تھی۔ بے بسی میرے ارد گرد رقصاں تھیں۔ درد میری رگ رگ میں پھیلا ہوا تھا۔

اذیت ہر مسام سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور جسم کے زنداں میں مقید روح بری طرح تڑپ رہی تھی۔

لاشعوری طور پر میرا ہاتھ لاکٹ کو تھام کر چین سمیت کندھے کی جانب لے گیا۔ ایک کریہہ چیخ سکوت کو مجروح کرتی فضا میں تحلیل ہوگئی۔ اسی لمحے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی..... اس کے ساتھ ہی میرا ذہن بوجھل ہونے لگا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا مگر میرے قدم ڈگمگا گئے..... پورے وجود میں جیسے کسی نے پارہ بھر دیا تھا۔ مجھے اتنا احساس ہوا کہ میں گر رہا ہوں۔ اس کے بعد میری کھوپڑی میں اندھیرے گھس گئے۔ آنکھوں میں دبیز دھند اتر آئی اور میں بے حسی کے تاریک کنوئیں میں اتر گیا۔

☆.....☆.....☆

بے حسی اور لاعلمی کے سیاہ پردے نجانے کتنی دیر مجھے لپیٹے رہے۔ جب سیاہیاں چھٹیں تو میں نے محسوس کیا کہ میں ہاسپٹل کے کمرے میں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور وہی لڑکی جسے میں نے قبرستان میں دیکھا تھا، میرے پاس تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جان کی گرل فرینڈ تھی اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے لفٹ لی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا دایاں کندھا مفلوج ہوگیا ہے۔

آج تین سال بعد بھی اس بھیانک رات کا پر ہول لحہ میری آنکھوں میں منجمد ہے۔ جہاں وہ رات میرے لئے منحوس ہے۔ وہیں لکی بھی کہ اس رات مجھے جولی ملی۔

جی ہاں! جولی وہی لڑکی ہے جو کہ اب میری بیوی ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کی ایک شرط رکھی تھی۔ اور وہ یہ شرط تھی کہ ہم اپنا ہنی مون اسی جنگل میں منائیں گے۔ میں اس کی اس بے تکی اور واہیات شرط سے اختلاف رکھتا تھا۔ اور وہ اپنی ضد چھوڑنے کو کسی صورت راضی نہ تھی۔ ہماری شادی اس لئے اتنا عرصہ التوا کا شکار رہی۔

بہر حال میں نے شرط مان لی۔ پچھلے ہفتے ہی جولی میری زندگی میں آئی ہے..... اب کل ہم لوگ ہنی مون کے لئے نکل رہے ہیں۔ آپ سب دعا کریں خیریت رہے.....

بے آواز دنیا

عامر ملک - راولپنڈی

عجیب و غریب اچنبھے میں ڈالتا منظر تھا، بہت سارے لوگ بے چوں و چراں اپنے کام میں لگے پڑے تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ گونگے اور بہرے ہوں، کسی کو کسی کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا، لیکن پھر دل کو دھلاتا منظر نظر آیا۔

دلفریب..... دل آویز..... دلکش..... دلنشین اور حقیقت سے روشناس کراتی حقیقی کہانی

اگر کوئی اجنبی شینا کا کے دور افتادہ علاقے میں واقعہ اس پہاڑی وادی تک کسی نہ کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا تھا تو وہ ایک ایسا منظر دیکھتا تھا جسے وہ ساری زندگی بھلا نہیں سکتا تھا۔ بشرطیکہ اسے یہ منظر دیکھنے کے بعد زندہ رہنے کی مہلت بھی دی جاتی۔

شینا کا کی اونچی پہاڑیوں کے درمیان واقع وادی میں جہاں تک نگاہ جاتی۔ وادی کے گھیرے میں لینے والی ایک ایسی عمارت کو دیکھتا۔ جس کی بیرونی دیواریں ازمنہ وسطیٰ کے قلعوں کے فصیلوں کی یاد دلاتی تھیں۔ اونچی مضبوط اور حیران کردینے والی فصیلیں۔ انسان سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ یہ دیواریں کس نے بنائی ہوں گی۔ اہرام مصر کی طرح ان دیواروں میں سینکڑوں من وزنی پتھروں کی مکعب سلیں چنی ہوئی تھیں۔ آخر وہ کون سی مشینیں تھیں۔ جو کہ ان

پتھروں کو پہاڑوں سے کاٹتی، تراشتی اور پھر اٹھا کر دیوار کی شکل میں نصب کر دیتی تھیں۔ ان اونچی فصیلوں پر جہاں تک نگاہ جاتی تھی سرخ پرچم ہزاروں کی تعداد میں لہرا رہے ہوتے تھے۔ ہر پرچم کے وسط میں ایک شبیہ بنی ہوئی تھی۔ ایک طاقتور منہ زور اڑیل بھینسے کی تصویر جس کے سینگ بڑے اور نوک دار تھے اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ ایک مشتعل طاقتور بھینسا۔ قدیم دیوتاؤں کی نشانی اور علامت جسے انسان صدیوں پہلے فراموش کر چکا تھا۔ یہاں ان پرچموں پر اسے پھر زندہ کر دیا گیا تھا۔

فصیل لمبی اور اونچی تھی۔ جس پر سیاہ بھینسے کی شبیہ والے ہزاروں سرخ پرچم لہراتے اور پھڑ پھڑاتے رہتے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا ملتا۔ جیسے یہ ایک آسیب زدہ قلعہ ہو۔ کوئی ذی نفس یہاں موجود نہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ فصیل کے پیچھے ایک دنیا آباد تھی۔ اس دنیا تک پہنچنے کے لئے صرف ایک بڑا دروازہ تھا۔ بہت بڑا پھاٹک، لکڑی اور مختلف دھاتوں کا بنا ہوا۔ جس کے طول وعرض کو دیکھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ کیا اس نے کبھی اتنا بڑا دروازہ دیکھا ہے؟ کیا ایسے دروازے کے بارے میں اس نے کہیں پڑھا ہے؟ جواب دونوں صورتوں میں نفی میں ملتا۔

یہ دروازہ اکثر بند رہتا ہے۔ خاص خاص اوقات میں کھولا جاتا ہے کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کب اور کیوں کھولا جائے گا؟ اس دروازے کے کھلنے کے وقت اگر مسافر وہاں موجود ہے اور اسے اندر جانے کی اجازت مل جائے تو وہ اس دنیا کو دیکھ سکتا ہے جو اس طویل وعریض فصیل اور بند دروازے کے پیچھے آباد ہے۔

یہ ایک انوکھی ناقابل یقین دنیا ہے۔

دروازہ بے آواز کھلتا ہے۔ کھولنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ شاید کھل جاسم سم کی طرح کا کوئی اسم ہے۔ جسے کوئی دل میں یا زیر لب دوہراتا ہے۔ اور دروازہ آہستہ سے ہلکی سی آواز پیدا کئے بغیر خود بخود کھل اور بند ہو جاتا ہے، سامنے ایک انوکھا منظر دکھائی دیتا ہے۔

کھلے کھیتوں میں بے موسم کی فصلیں لہرا رہی ہیں۔ گیہوں چاول اور گنے کے کھیت دکھائی دے رہے ہیں۔ اسی طرح جوں جوں آگے بڑھتے ہیں ہر موسم کے پھل دار درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جن پر پھل لگے ہوئے ہیں جو کہ پک چکے ہیں یا پکنے والے ہیں۔ آم، سیب، آلوچہ، انگور، ناشپاتی، خربوزے، تربوز، دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

اسے حیران کرنے کے لئے ابھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ ہزاروں انسان ان کھیتوں اور باغوں میں سر جھکائے ایک دوسرے کی طرف دیکھے بنا اور ایک لفظ زبان سے کہے بغیر کام میں مصروف ہیں۔ کوئی کٹائی کر رہا ہے۔ کوئی پانی دے رہا ہے۔ کوئی بوائی میں مصروف ہے۔ ہر شخص ہی مصروف ہے۔ ایک ایسے استغراق کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جس نے اسے دوسرے انسانوں کی موجودگی سے یکسر بے خبر کر دیا ہے۔

مسافر حیرت سے اس منظر کو دیکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ اسے بہت سے ایسے ملکیت دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ہر موسم کی سبزی نظر آتی ہے۔ بند گوبھی، آلو، مولی، مٹر، ٹماٹر، کدو، پیاز، ہر سبزی جس کا تصور موسموں کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک ہی وقت میں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں لوگ سر جھکائے ایک دوسرے سے قطعاً بے خبر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہزاروں انسان کام کر رہے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ لیکن ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کوئی کھانستا اور چھینکتا تک نہیں۔

مسافر آگے بڑھتا ہے ہر لحظہ اس کی حیرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ درجنوں بڑے بڑے شیڈ دیکھتا ہے ان شیڈوں میں سینکڑوں افراد کام میں جتے ہوئے ہیں۔ کوئی کرگھے پر کپڑے بن رہا ہے کوئی جوتے اور کوئی کپڑا سی رہا ہے کوئی لوہے کے زرعی آلات بنا رہا ہے اور کوئی فرنیچر، پلنگ کرسیاں میز وغیرہ۔

کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گھمبیر خوف زدہ کر دینے والا سناٹا..... حتیٰ کہ لوہے کے کھوٹنے، کرگھوں

کے چلنے اور چیزوں کے کٹنے، گھسنے، اٹھنے، رکھنے اور گرنے تک کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر آواز کو جیسے کسی دکھائی نہ دینے والی طاقت نے جذب کر لیا ہے ہر آواز کا جیسے گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

مسافر کا اپنا دم گھٹنے لگتا ہے یوں لگتا ہے جیسے زبان تالو سے چپک گئی ہے ہونٹ منجمد ہو کر رہ گئے ہیں آواز گلے میں پھنس گئی ہے۔

کیسی دنیا ہے یہ..... سرسبز پھلوں، سبزیوں اور فصلوں سے سرسبز، جہاں تک نظر اٹھتی ہے ہریالی ہی ہریالی لیکن جلد ہی مسافر کو اس نئی دنیا کی کچھ انوکھی اور حیران کن حقیقتوں کا علم ہوتا ہے۔

یہ سبزی سیاہی مائل ہے سبزی نے مجموعی طور پر سیاہی کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ مسافر بہت کچھ دیکھ چکا ہے جیسے اس نے سنا ہوتا تو کبھی یقین نہ ہوتا۔ اچانک مسافر کے دل کا خوف بڑھ جاتا ہے۔ اس کا وجود کانپتا ہے اس ہری بھری دنیا میں اسے کوئی کسی قسم کا بھی پرندہ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ ہی کسی پرندے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس دنیا میں پھولوں کا کئی پودا نہیں۔ گلاب نہیں، موتیا نہیں، سورج مکھی نہیں کسی طرح کا کوئی پھول نہیں کوئی بھونرا نہیں شہد کی مکھی نہیں، تتلی نہیں، مکھی نہیں۔

یہ عجیب دنیا ہے۔

مسافر خاموش، حیرت زدہ، ششدر کھڑا ہے۔

اس کی حیرت لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی ہے۔

کوئی آواز سنائی نہیں دی، کوئی حکم صادر نہیں کیا گیا، کوئی سائرن نہیں بجایا گیا، کوئی گھنٹی نہیں بجی، لیکن کھیتوں باغوں اور شیڈوں میں کام کرنے والے ہزاروں افراد خاموشی سے سر جھکائے کوئی آواز پیدا کئے بغیر قطار در قطار ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر چلے آ رہے ہیں۔

سب کے لباس ایک جیسے ہیں لمبے سرخ چغے، کندھوں سے ڈھلکتے ہوئے پاؤں کے ٹخنوں تک..... اور مسافر دیکھتا ہے ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن ان کے چہرے بے رنگ ہیں ایک جیسا تاثر، گھمبیرتا، خاموشی اور سکتے کا تاثر۔

مسافر انہیں دیکھ رہا ہے، دیکھتا رہتا ہے اور پھر ان کے پیچھے چل پڑتا ہے۔

وہ ایک بہت بڑے ہال میں جا رہے ہیں۔ جہاں لمبی لمبی میزیں ہیں اور لمبے لمبے لکڑی کے بینچ، ایک ایک بینچ پر پچاس پچاس آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ وہ سب ان بینچوں پر بیٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھے بغیر پھر ہال کے اندر ایک دروازہ کھلتا ہے۔ سینکڑوں افراد بڑے بڑے طشت اور برتن لئے چلے آ رہے ہیں۔ میزوں پر رکھتے چلے جاتے ہیں، ہر شخص سر جھکائے کھانا کھا رہا ہے ہر شخص کی نگاہیں اپنے کھانے پر گڑی ہیں۔

مسافر کا سر گھومنے لگتا ہے۔

سینکڑوں افراد ہزاروں افراد کو کھانا تقسیم کر رہے ہیں، ہزاروں افراد بیک وقت کھانا کھا رہے ہیں لیکن کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی، برتن میز پر رکھے جا رہے ہیں، چھری کانٹے برتنوں سے ٹکراتے ہیں، لیکن کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی، ہزاروں افراد منہ چلا رہے ہیں، کھا رہے ہیں، لیکن معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی۔

مسافر کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔

اس کی آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں۔

اس کا دھڑکتا دل کہہ رہا ہے۔

"تم نے جب سے اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ تم گونگے اور بہرے ہو گئے ہو۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں افراد موجود ہیں اور آواز نہ آئے، برتن ٹکرائیں اور آواز پیدا نہ ہو۔

نہیں..... یہ آفت تم پر ٹوٹی ہے، ہم قوت گویائی اور قوت سماعت سے محروم ہو چکے ہیں، ہاں..... ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ....."

وہ ہزاروں افراد سب ایک ساتھ، کسی دکھائی نہ دینے والے اشارے کے تحت اٹھ کھڑے ہو گئے ہیں، جیسے آئے تھے ویسے ہی قطار در قطار۔ خاموشی سے ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر اپنے اپنے

کھیتوں، اپنے اپنے باغوں اور اپنے اپنے شیڈوں میں چلے گئے ہیں۔

مسافر ہال سے باہر کھڑا انہیں جاتے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر وہ چل پڑا ہے۔ اس انوکھی دنیا میں جو فصیلوں کے اندر آباد ہے..... وہ دیکھتا ہے..... یہاں کوئی مویشی اور جانور نہیں..... وہ طنز سے مسکراتا ہے..... اپنے آپ سے کہتا ہے۔

''جہاں انسانوں کو پالتو جانور بنالیا گیا ہو، وہاں مویشیوں اور جانوروں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے.....''

مسافر پر ایک اور انکشاف ہوتا ہے..... اس انوکھی دنیا میں کوئی مسجد، گردوارہ، مندر اور گرجا نہیں ہے۔

اس دنیا کے اندر مختلف مقامات پر طیش میں آئے ہوئے۔ جھاگ چھوڑتے کالے طاقتور بھینسے کے مجسمے جگہ جگہ نصب نظر آتے ہیں..... یہ دنیا خدا سے خالی اور عبادت گاہوں سے محروم ہے۔

اچانک ایک ٹھہرا دینے والا سوال مسافر کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔

''میں یہاں کیسے آیا۔ میرے لئے دروازہ کیوں کھلا؟ کیوں..... ''آخر کیوں.....؟''

وہ چیخ کر اپنے آپ سے..... کسی سے پوچھنا چاہتا ہے لیکن اس کے ہونٹ نہیں ہلتے۔ اس کی زبان تالو سے چپٹی ہوئی ہے اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اسے دھکیل رہی ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے۔ سمت کا اندازہ نہیں، منزل کا احساس نہیں۔ کچھ نہیں جانتا۔ ذہن ماؤف ہے۔ لیکن وہ چل رہا ہے اسے دھکیلا جارہا ہے تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب عمارت کے سامنے کھڑا پاتا ہے۔

پتھر کی وہ سلیں جن سے یہ عمارت بنائی گئی تھی۔ ان کا رنگ گہرا سرخ تھا، جیسے تازہ تازہ گرم خون ہو، یہ عمارت جو بہت اونچی اور مربع شکل میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھرنے لگی۔ وہ دیکھتا ہے اس عمارت میں کوئی کھڑکی اور دروازہ نہیں، سرخ گہرا رنگ اس کی آنکھوں میں گھستا چلا جاتا ہے..... وہ اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے، کتنا وقت گزر گیا..... کتنے لمحے، کتنے منٹ، اسے کچھ یاد نہیں، جب وہ آنکھیں کھولتا ہے تو اپنے آپ کو ایک ہال کمرے میں کھڑا پاتا ہے..... وہ چونکتا ہے وہ عمارت کے باہر کھڑا تھا یہاں کیسے آ گیا.....

ہال کمرے میں شاندار لیکن بہت پرانے انداز کا فرنیچر رکھا ہے۔ ایک طرف ایک بہت اونچی منقش کرسی ہے۔ اس کرسی کے دونوں بازوؤں کے قریب بھینسے کے ویسے ہی مجسمے بنے ہوئے ہیں۔ جیسے اس نے پرچموں پر دیکھے تھے۔ وہ فرش کی طرف دیکھتا ہے۔ جو لکڑی کا بنا ہوا، چمکدار اور بہت چکنا ہے۔

وہ اچھل پڑتا ہے یا محسوس کرتا ہے کہ وہ اچھلنے لگا تھا..... سانپ کی سرسراہٹ جیسی آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز جو پہلی بار اس انوکھی دنیا میں سن رہا ہے۔ بولنے والا اسے دکھائی نہیں دیتا۔ سرسراتی ہوئی آواز اس کے دل کو خوف سے بھر رہی ہے۔

''ہماری مرضی کے مطابق تم اس شہر بے آواز میں آئے ہے، ہماری ہدایت کے مطابق تم نے اس شہر کی سیر کی اور ہمارے ہی اشارے سے تم یہاں اندر پہنچ گئے ہو..... خزانہ چھپا رہے ہو تو اس کی قیمت کا کیسے اندازہ ہوسکتا ہے، طاقت کا مظاہرہ نہ ہو تو طاقت بے معنی ہوتی ہے۔ ہم نے تمہیں وہ انوکھی اور حیران کن دنیا دکھائی۔ جس کے بارے میں اگر تمہیں بتایا یا پڑھایا جاتا تو تم کبھی یقین نہ کرتے۔ اب تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ یہ دنیا، ہماری تخلیق ہے..... میری جنت ہے۔ آج یہ دنیا اس وادی کے اندر تک محدود ہے۔ بہت جلد..... چند برسوں میں اس دنیا کی لپیٹ میں ساری دنیا آجائے گی۔ اور ساری دنیا ہماری جنت بن جائے گی۔ جہاں سب انسان خاموشی سے سر اٹھائے بغیر کام کریں گے، انہیں حکم دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ خود بخود کام کرتے اور ہماری ہدایات پر عمل کرتے چلے جائیں گے..... اگر تم انسان کو غلام بنانا چاہتے ہو۔ اگر تم اپنے لئے جنت تخلیق

کرنا چاہتے ہو تو تمہیں آواز کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہر طرح کی آوازیں سناٹے میں تبدیل کردینی ہوں گی۔ یہ آوازیں ہی انسان کو بغاوت اور نافرمانی پر آمادہ کرتی ہیں۔ جب میں نے اس حقیقت کو پالیا۔ تو میں نے اپنی جنت کی تعمیر کا آغاز کردیا۔

''سنو! میں تمہیں ایک انوکھی بات بتاؤں۔ انسان کا دل خاموش ہوجائے اپنے آپ سے باتیں نہ کرے۔ انسان کو سناٹے کے علاوہ کچھ سنائی نہ دے۔ تو اس کی جبلتیں تک دم توڑ دیتی ہیں۔ میں ایک سائنس دان ہوں۔ میں نے حقیقت کو پالیا، میرے تجربات صحیح ثابت ہوئے اور ان کا حاصل۔ میری تخلیق کردہ یہ جنت ہے..... میں نے ایک خاص قسم کا محلول ایجاد کیا ہے۔ اس کے چند قطرے ہزاروں گیلن پانی میں ملا کر پلا دو۔ تو لوگ ایک دوسرے سے بے خبر ہوجائیں گے، کبھی ایک لفظ زبان سے نہیں نکالیں گے۔ اس محلول کو سفوف کی صورت زمین پر چھڑک دو، ہوا میں کوئی پرندہ زندہ نہیں رہے گا۔ کوئی مویشی زندہ نہیں رہے گا۔ جھینگروں تک کا خاتمہ ہوجائے گا مکھی بھی بھنبھنانے کے لئے اس علاقے میں نہ آئے گی۔ جہاں یہ سفوف بکھیرا گیا ہو..... زمین موسموں کی آواز سنتی اور بولتی ہے زمین میں کھاد کے ساتھ اس سفوف کو بھی اتار دو۔ زمین موسموں سے بے نیاز ہوجائے گی۔ جو بوؤ گے وہ اگے گا خواہ موسم کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

بیس برس ہوئے ہیں، جب میں نے یہ خاص چیز ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ دو برس میں نے چھوٹے چھوٹے تجربوں کے ذریعے اپنی ایجاد کی تصدیق کی۔ اس کے بعد اپنی جنت کے لئے زمین کا ٹکڑا انتخاب کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اور پھر میں نے اس وادی کا انتخاب کرلیا۔ میں نے مہذب دنیا ہی سے ان گنت بے روزگاروں سے فرداً فرداً ملاقات کی اور ان کا انتخاب کرکے انہیں یہاں اس وادی میں لے آیا۔ چھ ہزار افراد..... یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ کسی شاندار پکنک پر جارہے ہیں، سب یہاں جمع ہوگئے تو میں نے ان

بزرگان دین اور علمائے کرام کے مستند عملیات اور وظائف پر مشتمل منفرد کتاب

جادو کا توڑ خود کیجئے

مولف: مفتی محمد حسام اللہ شریفی

قرآن مجید میں جادو کو سحر کہا گیا ہے لفظ سحر کا تذکرہ قرآن مجید میں ۲۳ مقامات پر ہوا ہے۔ میں ذیل میں ان آیات کا جن میں کہ لفظ سحر استعمال ہوا ہے، صرف ترجمہ پیش ہے تاکہ میرے قارئین ان پر خود ہی غور وفکر کریں یہ کام بھی الحمدللہ پہلی مرتبہ میں خاکسار پیش کررہا ہوں۔

قیمت:-/200 روپے

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

شمع بک ایجنسی
نوید اسکوائر
اردو بازار
کراچی
Ph:32773302

کے پانی، ان کی شراب اور ان کے ہر مشروب میں اپنی ایجاد کے محلول کو شامل کردیا۔

اور وہ سب ایسے ہوگئے، جیسے اب تم دکھائی دیتے ہو۔ اس زمین کو میں نے اپنی ایجاد سے گونگا اور بے زبان کردیا، اس ہوا سے پرندے اڑ گئے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

میں نے ان سے پہاڑ ترشوائے اور پتھروں کی سلیں بنوائیں اور فرعنہ مصر کی طرح ان سے یہ شہر تعمیر کروایا۔ تم اسے دیکھ چکے ہو۔ یہاں ہر شخص خودکار مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ انہیں بے زبان اور آوازوں سے محروم کرکے میں ان کی جبلتیں تک تسخیر کرچکا ہوں۔ یہ خود بخود میرے ٹائم ٹیبل کے مطابق اٹھتے، جاگتے، سوتے کھاتے اور کام کرتے ہیں۔'' مسافر حیرت سے کھڑا سن رہا ہے اسے آواز سنائی دے رہی ہے لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ اسے یاد آتا ہے کہ وہ ایک سیاح تھا۔ جو اس دور افتادہ وادی میں آنکلا تھا اور اب یہاں کھڑا دنیا کے سب سے بڑے عجوبے کا ذکر سن رہا تھا، کچھ سوا حیرت انگیز زندگی کے باوجود اس کے ذہن میں پیدا ہونے لگے تھے۔

یہ شخص ہمیشہ زندہ تو نہیں رہ سکتا۔ پھر ان چھ ہزار انسانوں کا کیا بنے گا۔ کیا یہاں یہ گونگے مرتے ہیں؟

اسے پھر وہی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ دنیا میں نے کیوں بنائی ہے؟..... ہاں یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے..... سنو! دوسروں کو غلام بنا کر۔ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچا کر۔ مطلق العنان بن کر۔ اقتدار کا مظہر بن کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا تم اندازہ نہیں لگاسکتے۔ میں بچپن ہی سے چاہتا تھا کہ انسان میرے غلام ہوں اور میرے اشاروں پر ناچیں۔ میری اپنی دنیا ہو جس پر میں حکمرانی کروں۔ میں نے جو چاہا اور سوچا تھا اسے پالیا۔ ایک جنت بنا چکا ہوں۔ اب اس کا دائرہ وسیع کروں گا۔ ایک دن آئے گا جب ساری دنیا کے انسان میرے غلام ہوں گے، سب گونگے ہوں گے۔ خودکار مشینوں کی طرح کام کررہے ہوں گے۔ ساری دنیا پر میرا حکم چلے گا۔ وہ دن ضرور آئے گا۔

مسافر نے بولنا چاہا، لیکن وہ بول نہ سکا۔ زبان ساکت تھی۔

''میں سائنسدان ہوں۔'' آواز آرہی تھی۔ ''دنیا کا سب سے بڑا سائنسدان، میں ابھی بہت دنوں زندہ رہوں گا جب تک میں پوری دنیا پر حکمرانی نہیں کرلیتا۔ میں مر نہیں سکتا۔ دس برس میں یہاں کوئی غلام نہیں مرا۔ ایک ایجاد اور دوائی کے ذریعے میرے یہ غلام صحت مند رہتے ہیں۔ یہ طویل عمر پائیں گے اور پھر انسان کا جینا مرنا میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل چیز تو حکمرانی ہے..... میری حکمرانی اور جب تک پوری دنیا میری مطیع نہیں ہوجاتی میں زندہ رہوں گا۔''

چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔ مسافر خاموش کھڑا تھا۔ دم بخود، ششدر، حیرت زدہ۔

''صرف میں ہی بول سکتا ہوں اور میری آواز بھی اس عمارت کے مخصوص حصے میں ہی سنی جاسکتی ہے۔ اور میں خود کلامی کرتا ہوں۔ تم یہاں آئے ہو تو تمہیں یہ اعزاز بخشا ہے کہ تم سے باتیں کررہا ہوں..... آج رات تم یہاں رہوگے، کل جب تم صبح اٹھوگے تو اپنے آپ کو فصیل سے باہر پاؤ گے اور تم بھی ہمیشہ کے لئے گونگے اور بہرے ہوجاؤ گے تم کبھی بول نہ سکوگے نہ کچھ سن سکوگے۔ تم نے یہاں جو کچھ دیکھا اور سنا وہ دیکھ کر دوسروں کو بتانے کی کوشش کروگے۔ تو کوئی تمہاری بات پر یقین نہ کرسکے گا۔''

مسافر کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ اچھا تو میں گونگا اور بہرہ ہوجاؤں گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخے۔ چلائے کوسنے دے لیکن اس کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

وہی پراسرار اور سرسراتی ہوئی آواز پھر اسے سنائی دی۔

''تم نے محسوس نہیں کیا ہوگا کہ میری دنیا خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے قائم ہے۔ کسی پرندے، کسی مویشی، کسی دوسری بولنے والی چیز مثلاً انسان کے بس

میں نہیں کہ وہ میری اس دنیا میں بول سکے۔ آواز کی ایک حد ہوتی ہے ایک خاص فاصلے تک کی آوازیں کان سن سکتے ہیں ہوا کی لہریں ایک خاص مقام سے دوسری جگہ تک آواز کو اڑا کر لے جاسکتی ہیں۔ میں نے اپنی اس دنیا کو محفوظ بنانے کے لئے اس پار چاروں طرف بیس بیس میل کے پہاڑی علاقے کو اپنی ایجاد سے گونگا اور خاموش بنادیا ہے۔ اس قلعے کے باہر چاروں طرف بیس بیس میل کا علاقہ بھی خاموش کردیا گیا ہے۔ اس علاقے میں کوئی پرندہ نہیں آسکتا۔ کوئی انسان چاہے بھی تو بول نہیں سکتا۔ ہر چیز جو بول سکتی ہے اس وادی میں آکر بے آواز ہوجاتی ہے۔''

مسافر اپنی آنکھیں بند ہوتے محسوس کرتا ہے۔ جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ وہ اس بڑی عمارت کے اندر نہیں بلکہ باہر کھڑا ہے وہ ایک ایسی عمارت سے کیسے واپس آگیا۔ جس کا کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی، وہ کئی منٹ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر دو آدمی اچانک اس کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اس کا ایک ایک بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چل دیئے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک اور عمارت تھی۔ جس کا ایک کمرہ اس کے لئے کھول دیا گیا۔ اسے کمرے کے اندر داخل کرکے وہ دونوں افراد جس خاموشی سے آئے تھے ویسے ہی چپ چاپ چلے گئے۔

کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا جس کے اوپر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ پلنگ کے سرہانے ایک میز تھی۔ جس پر کچھ برتن رکھے تھے جس میں اس کے لئے کھانا رکھا تھا۔ پانی کا ایک جگ گلاس بھی میز پر پڑے تھے۔ وہ اس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کے خیالات بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں ترتیب اور ربط پیدا ہونے لگا اسے یاد آیا کہ اس نے دوپہر کو پانی پیا تھا۔ لیکن کھانا نہیں کھایا تھا۔ تب سے اب تک اسے نہ پیاس لگی تھی نہ بھوک۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ اسے پراسرار بے آواز دنیا میں داخل ہوئے کتنا وقت ہوگیا ہے۔ وہ وقت کا تعین نہ کرسکا یوں لگتا تھا۔ جیسے صدیوں سے نہیں تو برسہا برس سے وہ یہاں ہے۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''یہ غلام یہ چھ ہزار خاموش اور بہرے۔ کیا وہ بھی میری طرح سوچتے ہیں.....؟

اس سوال کا کوئی حتمی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ تاہم اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ممکن ہے ابتدا میں وہ کچھ سوچتے ہیں۔ اب تو وہ عادی ہوچکے ہوں گے اور ان کی سوچیں بھی سلب کی جاچکی ہوں گی۔''

''یہ کیسی دنیا ہے؟'' اس نے پورا زور لگا کر منہ کھولنے، بولنے اور چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش ناکام ہوگئی سرسراتی ہوئی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

آواز جس کا بولنے والا اسے دکھائی نہ دیا تھا۔ کیا واقعی وہ انسان تھا۔ سائنسدان یا شیطان..... شاید وہ تینوں کا امتزاج تھا۔ حیران کن ناقابل یقین شخصیت..... اس کی عمر کیا ہوگی.....؟ اسے کتنا اعتماد اور یقین ہے کہ وہ اس وقت تک وہ نہیں مرے گا جب تک پوری دنیا کا حکمران نہیں بن جاتا۔ تو کیا ساری دنیا اس کی غلام بن جائے گی؟ کیا انسان کی یہ دنیا خاموش گونگی اور بہری ہوجائے گی؟ ہر طرح کی آوازوں سے خالی اور محروم۔

نغمے، موسیقی، بچے کی کلکاری، بے ساختہ قہقہے چیخیں، سرگوشیاں، پرندوں کی چہچہاہٹ، جھرنوں کی آوازیں، سائرن، سیٹیاں، گڑگڑاہٹ، گھنٹیاں، ان گنت آوازیں، مختلف النوع صدائیں، کوئی انسان کسی کو مدد کے لئے نہ پکار سکے گا۔ کوئی انسان اپنا درد دل کسی سے بیان نہ کرسکے گا۔ کسی انسان کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ وہ محبت کا نغمہ کسی کے کانوں تک پہنچا سکے۔

کیا ایسی دنیا کا تصور بھی ممکن ہے۔

''ہاں۔'' مسافر نے اپنے آپ سے کہا۔

''اگر میں اس دنیا میں نہ ہوتا۔ جہاں اس وقت بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں، تو شاید ایسی بے آواز دنیا کا تصور کسی دیوانے اور فاتر العقل کا خواب قرار دیتا۔ لیکن

اب میں کہہ سکتا ہوں..... ہاں ایسا ممکن ہے۔''

طاقتور، خوف ناک اڑیل کالا بھینسا..... اس کی شبیہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی اور پہلی بار مسافر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''جھوٹے خدا، جھوٹے صنم، خدائی کے باطل دعویدار۔''

مسافر پلنگ سے اٹھا۔ اس نے پانی کے جگ پر ایک نگاہ ڈالی، خوش رنگ کھانوں کو دیکھا۔ اور پھر وہ فرش پر بیٹھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر گیا۔

وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس کی زبان حرکت نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کا دل بول رہا تھا۔ اس کا دل اپنے رب، اپنے اللہ اور کائنات کے اصلی اور حقیقی خالق کو پکار رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

''اے میرے رب! کیسے کیسے لوگ آئے، جنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا، فراعنہ، نمرود اور شداد..... ہاں میرے رب..... شداد نے بھی اپنی جنت تعمیر کروائی تھی۔ میرے رب..... کائنات کے مالک..... سب کے خالق۔ تو نے ایک آن ان کا غرور توڑ دیا تھا۔ کوئی اشارہ..... کوئی کرشمہ..... کوئی معجزہ..... چھ ہزار انسان یہاں غلام بنے۔ تیری کبریائی کا انتظار کر رہے ہیں..... تیری بے نیازی مسلم لیکن کب تک.....؟

اس نے تیری طاقت کو للکارا ہے۔ اس نے فطرت کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کی ہے۔ اے میرے خدا! یہ دل جس کے ساتھ چھ ہزار دل پکار رہے ہیں۔ ان کی فریاد سن لے..... تیرے اشارے پر..... تیرے حکم پر کسی آواز کے منتظر ہیں۔ ایک آواز جو اس جھوٹے خدا کی دنیا کے سناٹے کو پاش پاش کر دے۔ جو خاموشی کا طلسم توڑ دے اور انسان..... جن کا تو خالق ہے..... آزاد ہو جائیں اور تیرا شکر بجا لائیں.....'' مسافر سجدے میں جھکا رہا۔ روتا رہا۔ گڑگڑتا رہا اور دعا کرتا رہا۔

اسے ایک عجیب سا اطمینان قلب محسوس ہوا۔ اضطراب جاتا رہا۔ اس نے فرش سے سر اٹھایا..... اٹھا اور بے اختیار دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

تاریکی..... گھپ اندھیرا..... سناٹا..... خاموشی کا جادو..... روشنی کہاں گئی تھی..... ایسا اندھیرا کہاں سے آیا تھا اس کے دل نے کہا..... کچھ ہونے والا ہے..... میرے رب نے میری دعا قبول کر لی ہے..... آنکھیں اٹھائے وہ تاریکی کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھیں اندھیروں سے بھر گئیں..... اسے یوں لگا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہے..... اور پھر اچانک۔

آسمان پر بجلی کا آتشیں کوڑا لہرایا..... جس نے تاریکی کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر اس کی کڑک جس نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک چیخ ابھری..... جیسے کوئی درندہ..... کوئی شیطان مرنے سے قبل ناقابل قیاس اذیت کے ساتھ چیخ رہا ہو۔

بجلی کا کوڑا پھر آسمان پر لہرایا اور روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور پھر رعد کی کڑک نے جیسے مردہ زمین کو زندہ کر دیا اور پھر مسافر کو ان کی گنت آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ انسانوں کے چیخنے کی آوازیں..... حیرت بھری آوازیں قہقہے لگاتی آوازیں..... چیزوں کے دھڑام دھڑام گرنے کی آوازیں..... قدموں کی آوازیں..... اور موسلا دار بارش کی آوازیں۔ ان آوازوں میں بجلی کی کڑک بھی شامل تھی۔

مسافر وہاں کھڑا تھا۔ وہیں سجدے میں گر گیا۔

وہ دیر تک سجدے میں گرا رہا۔ اپنے رب کے حضور..... جو قادر مطلق ہے جو رحمن بھی ہے رحیم بھی..... جبار بھی ہے قہار بھی..... جس کی قدرت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

چھ ہزار انسان بول رہے تھے..... گا رہے تھے..... بارش میں بھیگتے ہوئے اپنی آزادی کا جشن منا رہے تھے اور اس صنم کدے..... اس ایک اور جنت شداد کا ہر بت گر رہا تھا ہر فصیل ٹوٹ رہی تھی..... ہر زنجیر کھل گئی تھی..... ان کی آواز اس دنیا میں گونجنے لگی تھی۔

کرکٹ میچ

ساجدہ راجا- ہندواں سرگودھا

ویرانے میں ہر سو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا مسلط تھا کہ اچانک اس کی کار خراب ہوگئی، لاکھ کوشش کے باوجود بھی کار ٹھیک ہوکر نہ دی، اسی اثناء میں ایک پرہیبت شخص نظر آیا جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ روحیں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں- ثبوت کہانی میں موجود ہے

چلتی ہوئی کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے نوجوان ''جس کا نام پیٹرسن تھا'' اس نے پریشانی سے اسٹیئرنگ کی طرف دیکھا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، وہ گاڑی کے اگلے حصے کی طرف آیا اور بونٹ اٹھا کر خرابی کا جائزہ لینے لگا جس کی وجہ سے کار نے اسے عین راستے میں دھوکہ دیا تھا لیکن باوجود کوشش کے اسے اس میں ایسی کوئی خرابی نظر نہ آئی جس کی وجہ سے کار نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا آخر تھک ہار کر اس نے بونٹ بند کیا اور اس سے ٹیک لگا کر آس پاس نگاہ دوڑائی۔

بہت ویران علاقہ تھا وہ، اونچے نیچے ٹیلے اور تاحد نگاہ پھیلی ہوئی خاردار جھاڑیاں اس علاقے کو رات کے اس وقت نہایت پراسرار بنا رہی تھیں، آسمان پر چاند کی موجودگی زمین کو بڑی حد تک

روشن رکھے ہوئے تھی اور دھیمی دھیمی ہوا بڑی فرحت بخش تھی لیکن پیٹر کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا وہ کار کی خرابی کی وجہ سے بہت تھا اور رات اس ویرانے میں بسر کرنے کے خیال سے ہی ایسے وحشت ہو رہی تھی وہ پھر دروازہ کھول کر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا اور اگنیشن میں چابی گھمائی لیکن کار آہستہ سے غرا کر خاموش ہوگئی دو تین بار ایسا ہی ہوا اور پیٹر نے غصے سے اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔

رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا اور دور دور تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں وہ رات بسر کرسکتا کچھ دیر ایسے ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ انہی سیٹوں پر لیٹ گیا، آڑا ترچھا لیٹے ہوئے وہ بڑی مشکل محسوس کر رہا تھا لیکن اب بیٹھے بیٹھے کیسے رات گزرتی پھر کسی نہ کسی طرح اس کی آنکھ لگ گئی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزرا تھا کہ کچھ عجیب سے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی پھر اس کی نظر باہر کار کے شیشے پر گئی تو اس کی آنکھیں فرط خوف سے پھیل گئیں شیشے کے باہر ایک خوف ناک شکل کا آدمی اپنی سرخ آنکھوں سے اسے ہی تکے جا رہا تھا بکھرے بال کندھوں سے نیچے تک آرہے تھے اور بھدے ہونٹ نہایت کراہیت آمیز تھے اور یک ٹک ساکت نظروں سے وہ پیٹر کو تکے جا رہا تھا۔

پیٹر بے حس و حرکت اس خوف ناک شکل والے آدمی کو تکے جا رہا تھا اسے اپنا جسم مفلوج سا لگ رہا تھا اچانک اس آدمی نے انگلی سے اسے کار سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا پیٹر کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں برقی رو دوڑ گئی ہو، وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا حالانکہ اس کی شدت سے خواہش تھی کہ وہ کار سے باہر نہ نکلے لیکن کوئی ان دیکھی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

باہر نکل کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا، وہ آدمی مکمل طور پر کرکٹ پلیئر کے لباس میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بیٹ بھی نظر آرہا تھا۔

پیٹر کے کار سے باہر نکلتے ہی وہ آدمی اور ان ٹیلوں کی طرف چل پڑا جو سڑک سے کچھ دور واقع تھے۔

پیٹر مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا لیکن اس کا دماغ اس کے قابو میں تھا اور وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ”کرکٹ تو مجھے بھی پسند ہے لیکن یہ آدمی تو کچھ زیادہ ہی کرکٹ کا دیوانہ لگ رہا ہے جو آدمی رات کو بھی اس لباس میں بیٹ کے ہمراہ موجود ہے اور شاید کسی اور ہی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔

چلتے چلتے پیٹر کو زوردار ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل پر گر گیا اور جب کچھ دیر بعد وہ اٹھا تو آس پاس کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک کرکٹ گراؤنڈ نما جگہ تھی جو مکمل طور پر لوگوں سے پر تھی لیکن اس کے باوجود وہاں اب بھیانک خاموشی طاری تھی۔ سارے لوگ مجسموں کی مانند ساکت تھے اور سامنے گراؤنڈ میں نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں گیارہ کھلاڑی فیلڈنگ کے لئے موجود تھے۔

ساکت کھڑا امپائر بہت ہیبت ناک لگ رہا تھا اور حیرت انگیز طور پر بیٹنگ پیڈ پر وہی آدمی موجود تھا جو پیٹر کو یہاں لایا تھا۔

دوسرا بیٹسمین نظر نہیں آرہا تھا اور سب سے حیرانگی کی بات ان سب کا مجسموں کی مانند ساکت ہونا تھا۔ پیٹر کو وہ کسی اور ہی دنیا کے باشندے لگ رہے تھے۔ پیٹر چونک کے مڑا ایک آدمی اپنے ہاتھ میں کھیل کا لباس بیٹ وغیرہ اٹھائے کھڑا تھا اور اپنی پھٹی ہوئی آواز میں پیٹر کو وہ لباس پہننے کا کہہ رہا تھا پیٹر نے خوف زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا جس کے ہونٹ ساکت تھے لیکن آواز آرہی تھی۔

”لیکن..... کیوں.....؟ میں یہ لباس کیوں پہنوں۔؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے اس آدمی سے سوال کیا۔

”بالکل فضول سوال..... یہ لباس پہنو اور بیٹ پکڑ کر بیٹنگ کے لئے جاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے ہمیں آخری بال پر چھ رنز درکار ہیں اور ہماری یہ آخری

ہٹ ہے، ہمارا بیٹسمین زخمی ہونے کی وجہ سے کھیل جاری نہیں رکھ سکتا اس لئے تمہیں کھیلنا پڑے گا چونکہ تم کرکٹ کے شوقین ہو اس لئے تمہارے لئے یہ مشکل بھی نہیں ہوگا اب جاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس بال پر چھ رنز ہر حال میں.....

ورنہ ہمارے ساتھ تمہارا وجود بھی ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا۔“ اس آدمی کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ پیٹر کے جسم میں خوف کی سنسنی دوڑ گئی اس نے اور کچھ بھی پوچھنے کی بجائے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور کریز کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے کریز کی جانب بڑھنے کی دیر تھی کہ اس ساکت ماحول میں یکا یک اتنا شور بڑھ گیا کہ پیٹر کو اپنے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

پیٹر نے خوف زدہ نظروں سے آس پاس دیکھا حیرت انگیز طور پر سب تماشائی خاموش اور ساکت بیٹھے تھے لیکن اس کے باوجود شور ہو رہا تھا پیٹر کو بہت حیرانی تھی لیکن فکر نہیں تھی کیونکہ وہ سب پیٹر کے حق میں نعرے لگا رہے تھے بیٹنگ اسپاٹ پر پہنچ کر اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی اور پھر بولر کی طرف دیکھا جو بال کروانے کے لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔ پیٹر نے زور سے سانس کھینچ کر خود کو پوز کرنے کی کوشش کی اور بولر کو اشارہ کیا کہ وہ گیند پھینکے، حیرت انگیز طور پر شور بھی تھم گیا، سب کی نظریں بولر اور پیٹر پر جمی ہوئی تھیں۔

بال اچھل کر آئی، پیٹر نے آگے بڑھ کر زور سے ہٹ ماری اور بال باؤنڈری وال کے باہر جا گری، پیٹر سانس روکے کھڑا تھا لیکن جونہی بال باؤنڈری وال کے باہر گری، ایک کان پھاڑ دینے والا شور جاری ہو گیا، تب پیٹر کو یقین آیا کہ اس نے اپنے زندہ رہنے کی شرط جیت لی۔

لیکن پھر ایک حیران کن منظر سامنے آیا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہجوم تھا تماشائی، امپائر بالر سمیت سب موجود تھے وہاں اب ایک ویرانی کا عالم طاری تھا اور ایک بھی ذی نفس وہاں موجود نہیں رہا تھا۔

پیٹر نے خوف زدہ نظروں سے آس پاس دیکھا کیونکہ آس پاس تاحد نگاہ جھاڑیوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور وہ کرکٹ کا میدان جہاں وہ موجود تھا وہ بھی غائب تھا، پیٹر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اور شاید کوئی اسے بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔

لیکن یہ خواب تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ اس کے جسم پر وہی کرکٹ کا لباس موجود تھا جو اسے پہنایا گیا تھا بالکل سفید، پیٹر نے زور سے سانس کھینچی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا جو کچھ ہی دور کھڑی تھی،! جب وہ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تو اس کی نظر سیٹ پر رکھی چیزوں پر پڑی۔

پیٹر چونک گیا کیونکہ وہ چیزیں پہلے موجود نہیں تھیں وہ ایک سیاہ جلد کی پرانی ڈائری تھی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تھیلی تھی، پیٹر نے اسے کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے پھٹنے کے قریب ہوگئیں، وہ تھیلی ہیروں سے بھری ہوئی تھی، ان کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی پیٹر نے تھیلی بند کی اور ڈائری کھول لیا، اس کے پاس موبائل ٹارچ موجود تھی جو اس نے روشن کرلی اور دیکھا کہ ایک بالکل نئے کاغذ پر کچھ لکھا ہوا تھا حالانکہ باقی ڈائری کافی خستہ حال تھی۔ پیٹر نے وہ کاغذ کھولا لکھا تھا۔

”اے اجنبی نوجوان! تمہارا شکریہ جو تم نے ہمیں ابدی عذاب سے نجات دلا دی ورنہ ہم پتہ نہیں کب تک بھٹکتے رہتے۔ تمہاری محنت کا معاوضہ تھیلی میں موجود ہے، یہ ڈائری بھی پڑھ لینا اس میں تمام تفصیل درج ہے جس کا تمہیں تجسس ہو رہا ہوگا۔

اب ہم اس دنیا سے جا رہے ہیں لیکن تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے کہ تمہارا سلیکشن ضرور قومی ٹیم میں ہو جائے گا، یہ جوہان کا وعدہ ہے۔“ اس کے بعد کاغذ خالی تھا۔

پیٹر حیران تھا کہ اس کو کیسے پتہ چلا کہ قومی ٹیم میں میری سلیکشن ہو جائے گی یا میں کرکٹ میں دل چسپی رکھتا ہوں؟ خیر یہ سب باتیں بعد کی ہیں پہلے ذرا ڈائری تو پڑھ لوں۔ پیٹر کو اتنا تجسس ہو رہا تھا کہ اسے اس جگہ سے نکلنے کا خیال بھی دل سے نکل گیا۔ اس نے جلدی سے ڈائری کھولی اور پہلے صفحے پر نظریں جمادیں جہاں پرانی تحریر نظر آ رہی تھی۔

لکھا تھا۔ ''آج پھر سارے قصبے والے خوف میں ڈوبے ہوئے ہیں اور خوف زدہ کیوں نہ ہوں قبیلے کا سردار ظالم ترین آدمی ایلن دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر وہ آج کا کرکٹ میچ نہ جیتے تو پھر ہماری خیر نہیں اور کوئی بھی ہماری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا اور وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا اس سے کچھ بعید نہیں وہ جتنا ظالم ہے یقیناً ایسا ہی کرے گا، چونکہ وہ بستی کا سردار بھی ہے اس لئے کوئی بھی اس کے خلاف چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ہمارے قبیلے کے اصولوں کے خلاف ہے اگر کوئی عام فرد ایسا سردار کے ساتھ کرنے کی کوشش کرے گا تو خود بخود وہ اذیت ناک موت مر جائے گا۔ اس لئے کوئی بھی سردار ایلن کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ قبیلے میں چیدہ چیدہ افراد ہی پڑھے لکھے ہیں جن میں، میں بھی شامل ہوں اور مجھے ڈائری لکھنے کا بہت شوق ہے۔

دراصل سردار ایلن ایک عجیب و غریب صورتحال کا شکار ہے اسے کرکٹ جنون کی حد تک پسند ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کرکٹ اس کا جنون ہے۔

وہ خود بھی کرکٹ کھیلتا ہے اور اس نے اپنا شوق اپنے بیٹے میں منتقل کر دیا ہے بلکہ کر دیا تھا کیونکہ اس کا جواں سال بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے کچھ عرصے پہلے وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے گزر چکا ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ چند ماہ پہلے ہمارا دوسرے قبیلے والوں کے ساتھ کرکٹ میچ ہوا جس میں سردار کا بیٹا بھی کھیل رہا تھا سب کی جان توڑ کوششوں بلکہ زیادہ محنت تو سردار کے بیٹے کی تھی لیکن اس کے باوجود ہم وہ میچ ہار گئے جس کا ہمیں بہت افسوس تھا۔

لیکن پیٹر یعنی سردار کے بیٹے کو تو بہت دکھ تھا اس نے اس بات کو دل پر لے لیا تھا میچ جیتنے کے بعد دوسرے قبیلے والے جب خوشیاں مناتے ہوئے واپس جا رہے تھے، صدمے کے زیر اثر پتہ نہیں کیسے دریا کی طرف جا نکلا۔

دوسرے دن اس کی لاش دریا میں تیرتی ہوئی پائی گئی چونکہ وہ ایک جگہ اٹک گئی تھی اس لئے آگے نہ جا سکی۔

سردار کا تو غم و غصے سے برا حال ہو گیا۔ وہ بیٹے کی موت کا ذمہ دار دوسرے قبیلے والوں کو سمجھتا تھا حالانکہ بظاہر تو لگتا تھا کہ پیٹر نے خودکشی کی ہے یا پھر یہ دھیانی میں اس کا پیر پھسلا ہوگا لیکن سردار ایلن کا کہنا تھا کہ چونکہ وہ میچ ہارا ہوا تھا اور دوسرے قبیلے والوں نے ہمیں ہرایا ہے اس لئے وہی پیٹر کی موت کے ذمہ دار ہیں اور اب اگلے میچ میں ان کو ہرا کر اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لینا ہے۔

اس لئے سردار نے سب کو دھمکی دی ہے کہ اگر ہم یہ میچ ہارتے ہیں تو پھر کسی کی بھی گردن سلامت نہیں رہے گی۔ کھیلنے والے سارے لڑکوں پر بہت پریشر ہے لہٰذا وہ جیتنے کے لئے مسلسل محنت کر رہے ہیں کیونکہ یہ جیت صرف میچ کی ہی نہیں ان کی بلکہ ہم سب کی زندگی کی جیت ہے۔

آج ہم کھیلنے کے لئے جا رہے ہیں سب کے چہرے موت کی زردی سے پٹے ہوئے ہیں کیونکہ ہار کی صورت میں ایک دردناک موت ہمارا مقدر بنے گی کیونکہ ہمارے قبیلے کے رواج کے مطابق قبیلے کا سردار مافوق الفطرت قوت کا مالک ہوتا ہے اور وہ جو چاہے اپنے قبیلے کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔

ہم سب بھی آنے والے وقت سے لرزیدہ ہیں کیونکہ سردار کے مطابق اگر ہم میچ ہارے تو دردناک موت کے علاوہ ہماری روحیں اس وقت تک ابدی عذاب میں مبتلا رہیں گی جب تک ہم پیٹر کی موت کا

بدلہ نہیں لیں گے اور سب سے اذیت والی بات کہ مرنے کے بعد بھی ہمیں کسی نہ کسی طرح پیٹر کی موت کا بدلہ لینا ہوگا جو ایک نہایت کٹھن مرحلہ ہوگا، بھلا مرنے کے بعد ہم زندہ لوگوں سے کیسے کھیلتے؟

لیکن بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ سردار نے ہمارے ساتھ ساتھ دوسرے قبیلے والوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ اس نے اس سلسلے میں ایک خطرناک عمل بھی کیا ہے جس کے نتیجے میں میچ جیتنے کے بعد موت کے گھاٹ وہ بھی اتر جائیں گے اگر ہم جیت گئے تو پھر سردار ہمیں اتنا کچھ دے گا کہ ہمیں کچھ کام کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی لیکن وہ سب اس صورت میں ہوگا جب ہم جیتیں گے۔ دوسرے قبیلے والے جیتنے کے باوجود موت کے گھاٹ اتر جائیں گے چونکہ میچ ہارنے کی صورت میں سردار ہمیں بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا تو مرنے کے بعد دونوں قبیلوں کی روحوں میں میچ ہوگا۔

''ہے تو یہ عجیب سی بات لیکن کالا جادو سب ممکن کروا دیتا ہے اگر مرنے کے بعد بھی ہم پیٹر کی موت کا بدلہ نہ لے سکے تو پھر ہماری روحیں ابدی آگ کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گی لیکن وہ بعد کی باتیں ہوں گی کیونکہ فی الحال ہمیں زندگی میں یہ میچ جیتنا ہے۔''

اس کے بعد ڈائری کے کچھ صفحات خالی تھے لیکن پھر آگے ایک نئی اور کافی نئی تحریر نظر آ رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے بہت بعد میں اسے تحریر کیا ہو۔

''ہماری روحیں ایک ابدی عذاب میں گرفتار ہیں، مرنے کے بعد بھی ہم مسلسل دوسری بار دوسرے قبیلے سے میچ ہار چکے ہیں اور ہماری روحیں نامعلوم بھیانک عذاب میں جکڑتی جا رہی ہیں اوپر سے ستم ظریفی کہ ہمارا ایک بیٹسمین بری طرح زخمی ہو گیا ہے اور سردار کی شرط ہے کہ انسانی زندہ دنیا سے کوئی نوجوان جس کا نام بھی پیٹر ہو وہ آ کر اس کھلاڑی کی جگہ کھیلے گا یہ شرط بہت کٹھن ہے، اب کون پیٹر نامی نوجوان اس علاقے سے گزرے گا اور پتہ نہیں کب گزرے گا پتہ نہیں گزرے گا بھی کہ نہیں۔؟''

یہاں تک آنے کے بعد ڈائری مکمل طور پر خالی تھی اور پیٹر کار میں بیٹھا واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا یقیناً وہ لوگ میچ ہار گئے ہوں گے تبھی سردار ایلن نے انہیں موت کی سزا دی اور پھر مرنے کے بعد ان کی روحیں بھی آگ کے ابدی عذاب میں گرفتار ہو گئی ہوں گی جیسا کہ اس روح نے ڈائری میں تحریری کیا تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی دوبارہ میچ ہار چکے ہیں اور اس تیسرے میچ میں ان کا آخری بیٹسمین زخمی ہو گیا ہوگا تب ان کے سردار نے یہ شرط رکھی کہ زندہ انسانوں سے کوئی نوجوان جس کا نام پیٹر ہو کیونکہ سردار کے بیٹے کا نام بھی پیٹر تھا۔

آ کر اس زخمی کی جگہ کھیلے گا اور خوش قسمتی سے پیٹر خود اس علاقے سے گزر رہا تھا۔

جب اس کی کار خراب ہو گئی اور تب وہ آدمی یا روح اسے لینے آئی اور پھر آخر کار وہ اس صدمے اور اذیت ناک عذاب سے نکل گئے کیونکہ بالآخر انہوں نے اتنے سالوں پر محیط انتقام کی آگ کو ٹھنڈا جو کر دیا تھا میچ جیت کر.....!

ہو سکتا ہے میری کار کو بھی جان بوجھ کر خراب کیا گیا ہو کیونکہ روحوں سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہوتا، انہیں میری اس علاقے میں آمد کا پتہ چل گیا ہوگا اور انہوں نے نادیدہ قوت کے سہارے میری کار میں کوئی خرابی پیدا کر دی ہو؟ یہ سوچ کر پیٹر نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور کار جتنی آسانی سے اسٹارٹ ہو گئی جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پیٹر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے کار آگے بڑھائی اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کو بہت سے لوگ اونچی آواز میں اس کا شکریہ ادا کر رہے ہوں۔

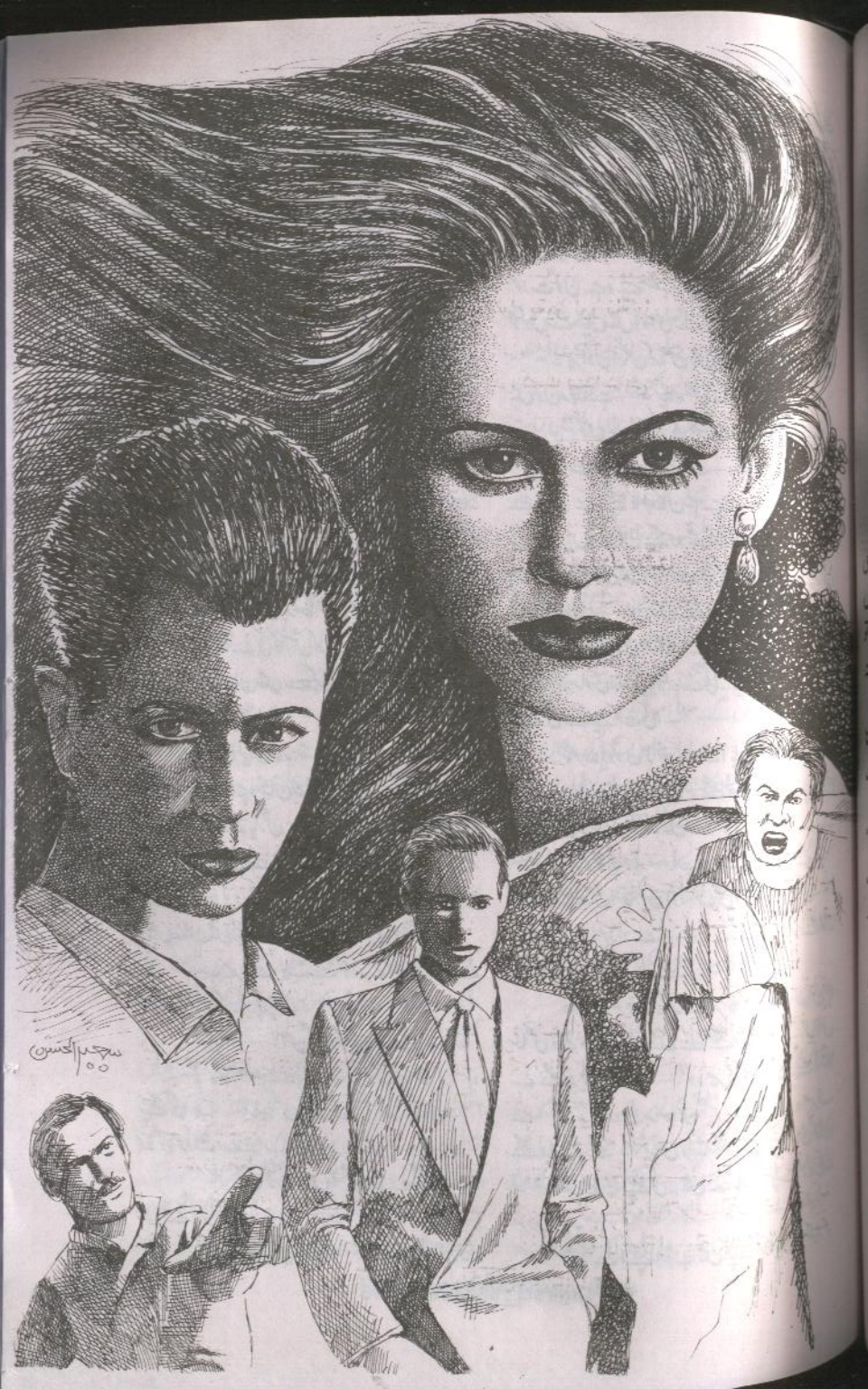

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 12

دھشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

لیکن میں نے خود کو فوراً سنبھال لیا۔

میں نے جھونپڑی کی دیوار کی جھری سے جھانکا۔ اس کی دیوار چٹائیوں کی تھی۔ ان میں ان گنت جھریاں تھیں۔ ایک جھری قدرے بڑی تھی۔ میں نے اس میں آنکھ چپکایا..... یہ تینوں وہی بدمعاش تھے جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ نہ صرف میری تلاش میں تھے بلکہ میرے پتاجی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

وہ شراب نوشی کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان سے کیسے بدلہ لوں..... انہیں کیفر کردار تک پہنچادوں..... میرے پاس ہتھیار تک نہ تھا..... میں نہتی تھی..... ماچس تک نہ تھی کہ اس جھونپڑی کو آگ لگادوں۔ اس کا حصول بھی ممکن نہ تھا..... ایک تو یہ جھونپڑی ویرانے میں تھی..... اور اس علاقے میں شاید کہیں کوئی دکان خاصی دور تھی..... میرے پاس پیسے نہ تھے جو میں خرید کر لاتی..... اور آگ لگا دیتی مجھے بعد میں شناخت کرلیا جاتا.....

پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کشتی کے کیبن میں چائے بنانے کا سامان موجود ہے۔ ایک اسٹو..... ایک کین جو کیروسین کا تھا اور ماچس بھی تھی..... چائے پتی..... خشک دودھ اور چینی..... اس خیال کے آتے ہی میں لپکی..... مجھے کشتی تک جانے اور واپس آنے میں نصف گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے سوچا..... کہیں وہ چلے تو نہیں گئے..... لیکن میں نے جھری سے جھانکا۔ وہ ناشتہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

''ہمیں جلد سے جلد نہ صرف لڑکی کو تلاش کرنا ہے بلکہ اس کے باپ کو قتل کرنا ہے..... ورنہ مصیبت آجائے گی۔''

''لڑکی مل جائے تو موج بھی اڑانا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''سنا ہے کہ باس نے تین دن خوب عیش کیے..... اب ہم بھی کریں گے تو باس کو اعتراض نہ ہوگا.....''

''بھئی.....! کیا غضب کی لڑکی ہے.....؟ باس کا خوف نہ ہوتا تو میں اس پر ہاتھ صاف کر چکا ہوتا.....'' تیسرا بولا۔ ''اس کا چہرہ، جسم اور..... سراپا نظروں میں گھوم رہا ہے.....''

ان کی باتوں نے میری نس نس میں خون کھولا دیا..... پھر میں نے لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔ کیروسین میں نے تینوں اطراف چھڑک دیا۔ پھر میں نے ایک سوکھی ٹہنی کو سلگایا..... پھر جہاں جہاں میں نے

کیروسین چھڑکا تھا اسے آگ دکھادی..... پھر ٹہنی پھینک کر میں نے مین روڈ کی طرف دوڑ لگادی..... میں اندھا دھند بھاگی۔

پھر میں نے سڑک کے قریب گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہوکر تنے سے پشت لگادی۔ میں نے مڑکر نہیں دیکھا تھا۔ میری سانس سینے میں بری طرح پھولنے لگی تھی۔ میرا سینہ دھڑک رہا تھا۔ میرا بدن پسینے میں شرابور ہوگیا اور کپڑے بدن سے چپکنے لگے..... ایک دم سے شور اٹھا.....

آگ..... آگ..... آگ.....

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جھونپڑی شعلوں کی لپیٹ میں جل رہی تھی۔ اس وقت بارش کے آثار تھے۔ افق تا گھرے بادل چاروں سمتوں سے امڈ امڈ کر آرہے تھے۔ اس جھونپڑی کے باہر لوگ جمع ہورہے تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ ان بدمعاشوں کا کیا حشر نشر ہوا..... لوگ آگ بجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ ویسے میرے خیال میں تھا کہ ان میں سے کوئی بدمعاش جل کر نہیں مرا تھا۔ جھلس ضرور گیا تھا۔

سڑک ویران اور سنسان پڑی تھی۔ دور دور تک کسی سواری کا نام ونشان نہ تھا۔ یہاں سے میرا گھر کافی دور تھا۔ میں نے بارش ہونے کے ڈر سے تیز تیز چلنا شروع کیا۔ اتفاق سے میں نے دو عورتوں کو دیکھا جو جلتے ہوئے مکان کو دیکھنے والوں کی بھیڑ سے نکل کر آرہی تھیں۔ ان میں ایک جواں سال اور دوسری بوڑھی تھی۔

جب میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں نے ان کا راستہ روک کر پوچھا۔

"کیا ہوا.....؟ اس گھر کو آگ کیسے لگی.....؟"

"کچھ معلوم نہ ہوسکا..... کوئی کہہ رہا تھا کہ اسٹو پھٹنے کی وجہ..... شاید کسی لڑکی نے آگ لگادی....." بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"لیکن کوئی لڑکی کیوں آگ لگانے لگی.....؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"شاید کوئی دشمنی ہوگی....." جواں سال عورت نے درمیان میں کہا۔ "ایک بوڑھے شخص نے ایک عورت کو اس مکان کے عقبی حصے میں دور سے دیکھا کہ تیزی سے چھڑک رہی ہے..... تھوڑی دیر بعد اس نے ٹہنی جلا کر پورے مکان کو نذر آتش کردیا..... بوڑھے نے بتایا کہ چوں کہ اس کی بینائی کمزور ہے اس وجہ سے وہ یہ دیکھ نہ سکا کہ وہ عورت کون ہے ویسے مشتبہ لڑکی کو تلاش کیا جارہا ہے۔ لوگوں کے خیال میں وہ اسی محلے کی ہے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "اس جھونپڑی میں کون رہتا ہے.....؟ کیا وہ جل گئے۔"

"نہیں....." بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ "چار دوست اس میں رہتے تھے..... وہ بری طرح جھلس گئے۔ ان کے بچنے کا امکان کم ہے..... وہ خطرے سے باہر نہیں ہیں..... ان کے دو تین دوست آگئے جو اپنے دوستوں کو اسپتال لے جارہے ہیں۔ انہوں نے اسپتال فون کردیا ہے..... ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ یہ کس لڑکی کی حرکت ہے..... وہ اسے ایسا سبق دے گا کہ ساری زندگی یاد کرے گی۔ یہ پرانی دشمنی ہے جو اس لڑکی نے یہ حرکت کی....."

پھر وہ دونوں مخالف سمت آبادی کی طرف بڑھ گئیں..... ایک طرف یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ چاروں بدمعاشوں کو سزا مل گئی۔ میں نے ان سے بدلہ لے لیا۔ کیفر کردار کو پہنچادیا..... اب وہ بچتے سے رہے..... میرے سینے میں انتقام کی جو آگ تھی وہ ٹھنڈی ہوگئی..... یہ کمینے..... حرام زادے..... میرے باپ کو قتل کرنے اور مجھے تلاش کرنے والے تھے۔

دوسری طرف مجھے یہ دھڑکا لگ گیا کہ ان کا ساتھی مجھے تلاش کرنے کے لئے نکلنے والا ہے..... کیا اس نے مجھے دیکھ رکھا ہے.....؟ وہ میری صورت سے آشنا ہے.....؟ یہ چاروں بدمعاش جھلس گئے تھے وہ صرف مجھے جانتے تھے..... یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا..... میں تیز تیز چلنے لگی۔ میں نے بار بار پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔

میں نے اپنے عقب میں لپک کر ایک اسکوٹر کو

جیزی سے آتے دیکھا۔ چوں کہ سائے گہرے ہورہے تھے۔ اس لئے اس نے بتی جلا رکھی تھی۔ اس لئے میں اس روشنی کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے اسکوٹر میرے پاس لاکر روک دی۔

"مس.....! کیا آپ اس سنسان سڑک پر سواری تلاش کررہی ہیں؟"

میں نے اسے دیکھا۔ وہ تیس برس کی عمر کا تھا..... وضع قطع اور چہرے مہرے سے تعلیم یافتہ اور مہذب دکھائی دیا..... اس کا لہجہ بھی شائستہ تھا۔

"جی ہاں....." میں نے سر ہلایا۔ "میں راستہ بھول گئی ہوں....."

"آیئے..... میں آپ کو آپ کے گھر پہنچادوں..... میں شہر کی طرف جارہا ہوں۔"

اس کی لفٹ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا..... اس لئے کہ وہ بدمعاش میری تلاش میں آسکتا تھا۔ اس نے اسکوٹر کی رفتار تیز کردی..... آسمان پر کالے کالے گہرے بادل تیر رہے تھے۔ کسی بھی لمحے برس سکتے تھے۔ ابھی تھوڑی دور گئے ہوں گے۔ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ اس نے موٹر سائیکل..... مہاراجہ کالونی کے ایک مکان کے سامنے روک دی جو آبادی سے قدرے ہٹ کر تھا۔

"یہ میرا مکان ہے۔" اس نے کہا۔ "بارش شروع ہوچکی ہے۔ آپ میرے ہاں آجائیں۔ جب بارش تھم جائے گی تب میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گا....."

میں نے مکان پر تالا دیکھا تو ہچکچائی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ مکان میں اکیلے رہتے ہیں.....؟ بیوی بچے نہیں ہیں؟"

"جی نہیں....." اس نے سر ہلایا۔ "معلوم نہیں وہ بچوں کو لے کر کہاں چلی گئی.....؟ شاید پڑوس میں یا پھر اپنا بیمار ماں کو دیکھنے گئی ہوگی..... وہ آتی ہی ہوگی۔ کیوں کہ یہ میرے دفتر سے آنے کا وقت ہوتا ہے۔"

اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا.....

اس وقت آسمان برس پڑا۔ میں جلدی میں بلکہ سراسیمگی میں اپنا بیگ بھول آئی۔ اس میں چھری بھی تھی۔ وہ اپنا اسکوٹر اندر لے گیا۔ یہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ مجھے اندر کا اشارہ کیا۔ اس نے روشنی کردی۔ میں بھی اندر داخل ہوگئی۔ اس نے دروازہ بند کرکے چٹخنی لگانے کے بجائے دروازہ بھیڑ دیا۔ پھر اندر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے روشنی کی تو میں بھی اندر داخل ہوگئی۔ یہ ڈائننگ روم تھا۔ وسط میں ایک کھانے کی میز تھی جس کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ ایک شوکیس دیوار سے لگا تھا جس میں کانچ کی کراکری تھی۔ سامنے ایک ماسٹر بیڈ روم تھا۔ ڈائننگ روم کی روشنی اندر جارہی تھی۔ بیڈ کے سامنے ایک بہت بڑی سنگار میز تھی جس کے بڑے آئینے میں بیڈ نظر آتا تھا۔

اس نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ نمبر ملا کر رابطہ ہونے پر بات کرنے لگا۔

"ڈارلنگ!..... کہاں ہو تم.....؟ میں گھر آگیا ہوں..... ایک شریمتی جی بارش سے پناہ لینے آئی ہوئی ہیں..... جلدی سے آجاؤ..... پڑوس میں ہو تو بھیگنے کا کیا ڈر..... اچھا..... اچھا..... دس پندرہ منٹ میں آرہی ہو..... میں اتنی دیر میں کافی بنالیتا ہوں۔ دودھ کیا فریج میں ہے.....؟"

وہ موبائل آف کرکے اپنے بیڈ روم میں رکھ کر آیا اور بولا۔

"میری بیوی پچھلی گلی کے مکان میں ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ پندرہ بیس منٹ میں بارش تھمنے لگے گی..... میں اتنی دیر میں کافی بنالوں..... موسم بھی بارش بھی کافی پینے کا ہے....."

وہ اتنا کہہ کر باہر کے کمرے میں گیا۔ جہاں اسکوٹر کھڑی تھی۔ اس میں سے ایک بڑا سا چرمی بیگ نکال کر لایا۔ اسے میز پر رکھ کر اس کی زپ کھولی۔ اس میں سے ایک ویڈیو کیمرا..... ڈیجیٹل کیمرا..... اور ایک بڑا سا کیمرا نکالا..... ایک بھورے رنگ کا لفافہ جو پھولا ہوا تھا۔ اس نے یہ سامان رکھنے کے بعد بیگ کی زپ لگا

کرا سے شوکیس کے سائیڈ بورڈ کی دراز میں رکھ دیا۔

"کیا آپ کیمرا مین ہیں.....؟" میں نے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔

"میں ایک کمرشل فوٹو گرافر ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں شادی بیاہ اور ہر قسم کی تقریبات میں تصویر بناتا ہوں..... میری ایک دکان کرشن نگر میں بھی ہے..... دن میں جو گاہک آ کر تصویریں کھنچواتے ہیں گھر لے آتا ہوں۔ یہاں ان کے پرنٹ بناتا ہوں..... تقریبات میں ڈیجیٹل کیمرے سے جو تصویریں کھینچتا ہوں ان کے بھی کئی پرنٹ بناتا ہوں۔ میں نے گھر میں ایک کمرے میں ڈاک روم بھی بنا رکھا ہے..... رات ایک بجے تک کام کرتا ہوں۔ یہ میرا ذریعہ معاش ہے۔"

پھر وہ سامان سمیٹ کر بیڈ روم میں گیا۔ اس میں شاید کونے میں میز ہوگی جو مجھے یہاں سے نظر نہیں آئی اس پر رکھ کر باہر آیا۔

"میں چوں کہ ایک کمرشل فوٹو گرافر بھی ہوں مجھے ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سا چہرہ فوٹو جینک ہے۔" اس نے کہا۔

آپ کا چہرہ بھی ایسا ہی ہے..... بڑے تیکھے نقش و نگار ہیں..... آپ جو اپنی تصویریں کھنچواتی ہیں وہ بہت شان دار آتی ہوں گی..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں.....!"

"جی ہاں....." میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے واقعی صحیح اندازہ لگایا تھا۔

"اچھا..... میں کافی بنالوں....." اس نے کہا۔

"کافی کے ساتھ..... کچھ اور چلے گا۔ پتی ہوتی تو وہ پکوڑے یا اپماؤ (جنوبی ہند کی سوجی کی نمکین ڈش..... جو میٹھی سوجی کے حلوے کی طرح بنتی ہے۔ ان میں لہسن، سرخ ثابت گول مرچوں اور پیاز، کری پتا کا بگھار دیا جاتا ہے) بنا لیتی..... ویسے میں بسکٹ اور نمکو حاضر کر دوں گا۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں....." میں بولی۔

"صرف کافی..... کافی ہے....."

پھر اس نے تپائی میں سے اخبارات اور مختلف رسائل رکھے ہوئے تھے ان میں سے ایک رسالہ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"میں جب تک کافی بنالوں آپ انہیں دیکھیے..... اس میں شاہکار تصویریں چھپی ہیں۔"

پھر وہ کچن میں گھس گیا جو سامنے ہی تھا لیکن وہ اندر سے دکھائی نہ دیتا تھا..... اس رسالے کا نام فوٹو گرافی تھا۔ یہ انگریزی کا رسالہ تھا۔ امریکہ کا تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگی..... اس میں لڑکیوں عورتوں کی عریاں تصاویر کے علاوہ مرد اور لڑکیوں کی نامناسب تصویروں کی بھرمار تھی۔ میں نے اس رسالے کو رکھ دیا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں کافی بنانے میں اس کی مدد کروں۔ میں کچن کی طرف بڑھی اور ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کی حرکت مجھے بڑی عجیب اور پراسرار سی لگی۔ وہ ایک لال رنگ کے پلاسٹک مگ میں ایک پڑیا سے سفوف ڈال رہا تھا..... باقی تین مگ اور بھی تھے..... وہ سفید رنگ کے تھے..... میرے دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا۔ وہ چار کپ کافی کیوں بنا رہا ہے.....؟ اس نے یہ سفوف لال رنگ کے مگ میں کیوں ڈالا.....

میں اس کی حرکت کی تہہ میں پہنچ گئی..... یہ بے ہوشی کا سفوف ہے..... وہ فوٹو گرافر ہے..... وہ بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف میری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے..... بلکہ میری تصویریں بھی بنانا.....

میں اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گئی..... سوچا کہ میں ایک خطرناک بدمعاش کے جال میں پھنس گئی ہوں..... اب مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے..... لیکن اس موسلا دھار بارش میں کہاں جاؤں.....؟ میں سوچ رہی تھی کہ ایک آہٹ سی ہوئی۔ جیسے باہر کا دروازہ کھلا ہو..... دوسرے لمحے دو آدمی اندر آئے۔ وہ دونوں ہی بدمعاش قسم کے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور ان کے چہرے دمک گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"کشن لال کہاں ہے.....؟ کیا وہ کسی کام سے

گیا ہوا ہے.....؟"

"میں کچن میں ہوں..... میں کافی لا رہا ہوں۔ ایک منٹ....."

وہ دوسرے لمحے ایک ٹرے میں چار مگ رکھ کر لے آیا..... بھاپ اڑاتی ہوئی کافی..... پھر اس نے میز پہ رکھ کر مجھ سے کہا۔

"میز پر آ جائیں..... کافی پی لیں....."

ایک لمحے میں میں نے بہت کچھ سوچ لیا..... اس نے اپنے دوستوں کو فون پر کوڈ میں یہ اطلاع دی تھی کہ اس نے ایک شکار پھانسا ہے۔ میرے ذہن میں فرار کی ایک ترکیب آئی تھی۔ گو کہ اس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات فٹی فٹی تھے..... کوشش کرنے میں حرج نہیں تھا۔ ناکامی کی صورت میں مجھے نہ صرف اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننا پڑتا بلکہ میری ویسی فلم بنتی جو اس شیطان کے ہاں بنی تھی۔

جب میں میز پر آئی تھی وہ تینوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے مجھے للچائی نظروں سے گھور رہے تھے۔ کشن لال نے میرے سامنے لال مگ رکھ دیا۔ ان میں سے ایک بدمعاش نے کشن لال سے پوچھا۔

"یار..... شانتی بھابھی کہاں.....! نرملا بھابھی..... بھی نہیں نظر آ رہی ہیں..... ہم سمجھے وہ دونوں ہوں گی۔"

"وہ دونوں اولڈ ہو چکی ہیں..... لیکن یہ نئی بھابھی ہیں..... سچ سچ بتاؤ..... یہ بھابھی کیسی ہیں.....؟"

"ونڈر فلم....." ایک نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"یار.....! اب تک ایسی بھابھی نہیں آئی..... یہ کہاں سے دریافت ہوئی ہیں۔"

"یہ سیکسی بم ہے....." دوسرا بھونڈے پن سے بولا۔ "تم کہاں سے ڈھونڈ کر لائے..... برسات کی شے ہے۔"

کشن لال میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا..... پہلا بدمعاش میرے دائیں ہاتھ پر..... دوسرا بدمعاش روبرو.....

میں نے کشن لال سے پوچھا۔ "سچ سچ بتائیں..... آپ لوگوں کے ارادے کیا ہیں.....؟"

"ارادے صاف ظاہر ہیں....." وہ استہزائی انداز سے بولا..... "ہم تینوں باری باری تم سے فائدہ اٹھانا، فلم اور تصویریں بنانا چاہتے ہیں..... تم تعاون کرو گی تو تم پر تشدد نہیں کیا جائے گا۔"

"میں ایک شرط پر آمادہ ہو سکتی ہوں..... تعاون بھی کروں گی۔" میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

"کیا شرط ہے تمہاری میری جان.....!"

"مجھے ایک ہزار روپے چاہئیں..... تاکہ میں اپنی بیمار ماں کا علاج کرا سکوں....." میں نے کہا۔ "اس لئے میں اپنی عزت بھینٹ چڑھانے کو تیار ہوں..... مجھے اپنی عزت سے زیادہ ماں کی زندگی عزیز ہے..... ایک ہزار روپے نہ ملے تو اس کے لئے خون اور دوسری ادویات خرید نہ سکوں گی..... ماں کی خاطر جسم کا سودا بہت سستا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں ایک اداکارہ تھی..... اسکول اور کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتی رہی تھی۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا اور جھوٹ موٹ جذباتی ہو کر آنکھوں میں آنسو لے آئی اور سسک پڑی۔

کشن لال نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے قریب کر کے میرا گال چوم لیا..... وہ مجھے بازوؤں کی گرفت میں لینا چاہتا تھا..... میں کسمسا کر غیر محسوس انداز سے الگ ہو کر دوپٹے میں آنسو جذب کرنے لگی۔

پھر میں نے کافی کا مگ اٹھا کر جھوٹ موٹ اسے سپ کیا اور بولی۔

"میں زیادہ چینی لیتی ہوں..... اس میں کم ہے..... تلخ ہو گئی ہے کافی....."

پھر میں ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مگ اٹھانے لگی تو وہ بولا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"کچن میں جا کر چینی ملا کر لا رہی ہوں....."

میں جواب دے کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

میرا خیال تھا کہ کشن لال مجھے روکے گا بلکہ خود چینی ملا کر لانے کو کہے گا..... لیکن اس نے کچھ نہیں

کہا..... کچن میں پلاسٹک کا وہ ڈبا نظر آ گیا جس میں پسی سرخ مرچ بھری ہوئی تھی۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ میں نے پہلے تو کافی میں تین چمچے سرخ مرچ ملائی۔ پھر دائیں ہاتھ کی مٹھی میں بھری۔ پھر میں واپس کمرے میں آئی۔

وہ تینوں سر جوڑے آپس میں کسر پھسر کر رہے تھے..... مجھے دیکھتے ہی سیدھے ہو گئے۔

جب میں میز پر بیٹھی تو وہ کافی پینے لگے۔ میں نے پھر چشم زدن میں کافی سب سے پہلے کشن لال کی آنکھوں پر..... پھر دوسرے اور پہلے بدمعاش کی آنکھوں پر ڈال دی..... پھر سرخ پسی مرچ ان تینوں کی آنکھوں میں ڈال دی..... وہ تینوں چیخنے اور چلانے لگے..... پھر میں نے باری باری ان تینوں کی کرسیاں الٹ دیں..... فرش پر قالین نہیں تھا۔ موزائیک کا فرش تھا..... ان کی کھوپڑیاں بج اٹھی تھیں..... پھر میں فوراً ہی باہر آئی..... اس کمرے کے باہر بھی کنڈی لگی ہوئی تھی..... باہر کے دروازے پر بھی..... بارش بہت تیز ہو رہی تھی..... مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا..... میں حواس باختہ سی تھی۔

پھر میرا منہ جدھر اٹھا ادھر میں دوڑنے لگی۔ گلی سنسان، تاریک اور ویران پڑی تھی..... میں نے کافی اور مرچیں ان کی آنکھوں میں ڈال دی تھیں وہ اس قابل نہیں تھے کہ میرا تعاقب کر سکیں..... ایک تو ان کی آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ فرش پر تڑپ رہے تھے..... فرش پر گرنے سے ان کی کھوپڑیاں بج اٹھی تھیں..... پھر بھی جانے کیوں ایک خوف سا دامن گیر تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں..... حالاں کہ میں کمروں کی کنڈیاں لگا کر نکلی..... میں ہر طرح محفوظ تھی۔ پھر بھی عدم تحفظ کا سایہ تعاقب میں محسوس ہو رہا تھا۔ میں آپ کے مکان کی گلی میں آ گئی..... میں نے ایشور کا نام لے کر آپ کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا..... اس خیال سے کہ دنیا جو بدکاروں سے بھری ہوئی ہے وہاں نیک انسانوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ ان کے دم سے دنیا قائم ہے..... اور پھر آپ نیک آدمی نکلے..... مجھے یہ سب کچھ سپنا معلوم دیتا ہے..... آپ میرے لئے کسی اوتار سے کم نہیں ہیں۔"

"میں انسان ہوں انسان ہی رہنے دو....." میں نے کہا۔ "تمہاری کہانی بڑی دردناک ہے کہ اس شیطان کے ہاتھوں چڑھ گئی..... وہ انسان کے روپ میں آدم خور ہے..... عورتوں لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ شب بسری کرتا ہے..... ان لمحات میں ان کا خون بھی پیتا ہے..... پھر ان کی فلمیں بناتا ہے تاکہ انہیں فروخت کر کے دولت کماتا ہے..... پھر انہیں قتل کر کے ان کا کچا گوشت مزے لے لے کر کھا جاتا ہے..... ایسی بربریت، سفاکی اور درندگی کے بارے میں، میں نے نہیں سنا..... اس کا وجود پاک کر دینا، انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی..... اور ہاں..... تم نہ صرف بڑی ذہین بلکہ بہادر بھی ہو..... تم نے اپنی عزت بچانے لئے جو مقابلہ کیا میں عش عش کر بیٹھا ہوں۔ تمہاری دیدہ دلیری اور حوصلے اور ذہانت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"اب آپ کیا قدم اٹھائیں گے.....؟" بملا کماری نے پوچھا۔

"میں اکیلا اس شیطان سے مقابلہ کرنے جاؤں گا....." میں نے جواب دیا۔

"آپ تنہا جائیں گے.....؟" بملا کماری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ "نہیں..... نہیں..... آپ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کتنا خطرناک شخص ہے۔"

"تو کیا اس آدم خور شیطان کو کھلا چھوڑ دیا جائے.....؟" ٹائیگر کہنے لگا۔ وہ لڑکیوں عورتوں کو اغوا کر کے ان کی عزت پامال کرتا رہے..... ان کا خون پیتا رہے..... ان کی گھناؤنی فلمیں بنا کر..... انہیں قتل کر دیتا ہے..... ان کا کچا گوشت کھا جاتا ہے..... اس آدم خور شیطان کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے..... کیا تم چاہو گی یہ سلسلہ جاری رہے.....؟"

"نہیں..... میں کیا کوئی بھی نہیں چاہے گا....."

وہ بولی۔ "لیکن آپ کیسے اسے اس دنیا سے پاک کر دیں گے....." اس کے لئے نہ صرف طاقت ور آدمی بلکہ کئی لوگ ساتھ چاہئیں۔"

"یوں تو میں ایک شوقیہ شکاری ہوں..... میں ممبئی شہر میں رہتا ہوں..... سال دو سال میں بنگلور آتا ہوں..... یہاں میرے شکاری دوست ہیں۔ میں ان کے ساتھ شکار کھیلنے جاتا ہوں..... اس مرتبہ دو برس کے بعد آیا تو اس آدم خور شیطان کے بارے میں پتا چلا..... وہاں سے فرار ہونے میں تم اور میرا دوست کامیاب ہوا ہے..... وہ یہاں آیا تو اس شیطان کے آدمی اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔" پھر ٹائیگر نے اسے اروندا کے بارے میں قدرے تفصیل سے بتایا۔

"کیا امید ہے کہ آپ اس آدم خور شیطان پر قابو پالیں گے.....؟" بملا کماری نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"امید پر دنیا قائم ہے....." ٹائیگر نے جواب دیا۔ "مجھے کامیابی کی اس لئے سو فیصد امید ہے کہ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں..... میری زندگی خطرناک مجرموں، قاتلوں اور مافیاؤں سے مقابلہ کرتے..... انہیں خس کم جہاں پاک کرتے گزر رہی ہے۔ لہٰذا میں اس پر قابو پا کر کیفر کردار تک پہنچا کر دم لوں گا۔"

"آپ پرائیویٹ سراغ رساں ہیں.....!" وہ متعجب لہجے میں بولی۔ "آپ کا نام کیا ہے.....؟"

"مجھے میرے دوست اور ملنے والے ٹائیگر کے نام سے جانتے ہیں اور میں بلیک ٹائیگر کے نام سے مشہور ہوں..... میں نے بڑے خطرناک اور خوفناک مجرموں کو قانون کے حوالے کیا ہے..... مافیا تنظیموں کا صفایا کیا ہے۔"

"آپ ٹائیگر ہیں.....؟" وہ حیرت اور مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں..... آپ واقعی ٹائیگر ہیں..... اوہ بھگوان..... میں کتنی خوش نصیب ہوں۔"

"تم مجھے کیسے جانتی ہو.....؟" ٹائیگر نے پوچھا۔

"میں اخبارات میں آپ کے کارناموں کے بارے میں پڑھتی رہی ہوں....." اس نے جواب دیا۔ "میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ سے مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے..... آپ نہ صرف بڑے بہادر آدمی ہیں بلکہ شریف بھی....."

"شریف کیسے.....؟" ٹائیگر مسکرایا۔

"وہ ایسے کہ آپ نے میری مجبوری اور مصیبت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا..... آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھیڑیا بن جاتا۔" اس نے پرستائش نظروں سے دیکھا۔

"دراصل تمہاری جوانی..... اور تمہارا حسن آدمی کو بہکا دیتا ہے..... اس لئے کسی آدمی کا خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ اس شیطان کے جزیرے پر چلوں گی.....؟"

"وہ کس لئے.....؟" ٹائیگر نے کہا۔ "میں جانوروں کے شکار پر تھوڑی جاؤں گا..... میں اس آدم خور شیطان شکاری کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"اس لئے کہ اس آدم خور شیطان کا گوشت میں بھی اس طرح کھاؤں جس طرح وہ لڑکیوں عورتوں کا کھا جاتا ہے۔" اس نے نفرت، غصے اور حقارت بھری تو اس کا سینہ سانسوں کے زیر و بم سے دھڑکنے لگا۔

"تو گویا تم بھی آدم خورنی بننا چاہتی ہو.....؟" ٹائیگر ہنس پڑا۔

"میں اسے کسی ستون سے باندھ کر ایک چھرے سے اس کے جسم کا گوشت کھاتی جاؤں گی اور اس سے پوچھوں گی اب کیسا مزا آ رہا ہے..... بملا کماری ہیجانی لہجے میں بولی۔

"اس کا گوشت کتوں کو تو کھلایا جا سکتا ہے لیکن کھایا نہیں جا سکتا.....؟"

"کتے.....!" وہ ایک دم سے چونکی۔ "آپ اس کے جزیرے پر کیسے قدم رکھیں گے.....؟ جزیرے پر بڑے خطرناک اور خون خوار کتے موجود ہیں..... وہ آپ

کی بو سونگھتے ہی آپ پر حملہ آور ہو کر چیر پھاڑ کر آپ کی بوٹی بوٹی کھا جائیں گے..... ہڈی بھی چبا جائیں گے..... اس لئے جزیرے پر قدم رکھنا اور گھسنا ناممکن سا ہے۔"

"لیکن میرے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا..... وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے.....؟"

"وہ کیسے.....؟" بملا کماری کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا، وہ معصومیت سے بولی۔ "کیا آپ جادو جانتے ہیں؟"

"ایسے کہ میرے پاس ایک طلسماتی چیز ہے..... کتے تو کیا شیر، گیدڑ، چیتا، گینڈا اور کوئی بھی موذی جانور..... سانپ اور اژدھا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے....."

"ایسی کون سی طلسماتی چیز ہے.....؟" بملا کماری نے تجسس آمیز اشتیاق سے پوچھا۔

"ایک منٹ ٹھہرو....." ٹائیگر نے کہا۔ "تمہیں دکھاتا ہوں۔"

ٹائیگر نے الماری سے وہ چرمی منقش بیج نکال کر اسے دکھایا جو اروندا نے اسے دیا تھا جس کی مدد سے وہ جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا..... کتوں نے اس کا بال تک بیکا نہیں کیا تھا..... اس بیج کے کھانے سے کتے مسحور ہو جاتے ہیں..... اس میں سے جو شعاعیں خارج ہوتی تھیں وہ درندوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔ بملا کماری نے اس بیج کو لے کر الٹ پلٹ کر حیرت سے دیکھا اور بولی۔

"میں نے وہاں اس شیطان کے کمرے میں دیکھا تھا۔ مجھے اس کی خصوصیت کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو دیا تھا اس سے کہا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھنا..... تمہارا جو بیج کھو گیا ہے اسے تلاش کرو..... اس لئے کہ یہ کل سات عدد تھے۔ اب چھ عدد رہ گئے ہیں..... ایسے بیج کا بننا اور حصول ناممکن ہے..... اگر تم نے یا کسی اور نے بیج کھو دیا تو پھر میں اس پر کتے چھوڑ دوں گا..... کیا تم لوگ ایک بیج کی حفاظت نہیں کر سکتے اسے سنبھال نہیں سکتے..... اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ بیج کیا بلا ہے..... میں نے وہاں قیدلڑکیوں عورتوں سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا..... اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ کیا چیز ہے..... بارش نے مدد کی تو میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی..... میں نے وہاں ایک محافظ سے سنا تھا کہ یہ کتے جتنے خون خوار ہیں اتنے ڈرپوک..... پانی اور بارش سے ڈرتے ہیں..... اس کی اس بات پر میں موسلا دھار بارش کے موقع سے فائدہ اٹھایا..... یہ بات اس محافظ نے اس شرط پر بتائی تھی کہ میں اسے من مانیاں کرنے دوں..... لیکن وہ ذلیل حد سے تجاوز کر گیا۔"

"یہ تمہاری ہی ہمت تھی جو تم نے فرار ہونے کا عزم کیا....." ٹائیگر بولا۔

"لیکن یہ بیج آپ کو کیسے اور کس سے ملا.....؟" اس نے پوچھا۔ "اس کی خصوصیات کے بارے میں کیسے پتا چلا....."

"اروندا سے....." ٹائیگر نے اسے بتایا۔ "وہ وہاں ایک مہینے قید رکھا ہے..... میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ وہی بیج ہے جو اروندا کو ملا..... وہ یہاں دو دن پہلے تو پہنچا۔"

"اب جب کہ ایک بیج ہے تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں تاکہ اس بھیڑیا سے بدلہ لوں۔" وہ بولی۔

"میں نے کہا نا کہ میں اکیلا ہی اس مشن پر جاؤں گا۔" ٹائیگر نے کہا۔ "تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو..... میں تمہارے جذبے اور بہادری کی قدر کرتا ہوں....."

لیکن آپ کیسے اس آدم خور شیطان سے مقابلہ کریں گے.....؟ اس لئے کہ اس جزیرے پر اس کے بہت سارے بدمعاش ہیں..... وہ قاتل اور ایک نمبر بدمعاش ہیں..... جیل سے مفرور مجرم بھی ہیں..... کیا آپ ان سے اکیلے کیسے مقابلہ کریں گے..... آپ تو تنہا ہوں گے..... وہ بڑے خطرناک ہیں۔"

"میں ٹائیگر ہوں اور میں بدمعاشوں کے لئے بے حد خطرناک ہوں۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "میں چھ سات برس سے زیرزمین کے خطرناک بدمعاشوں اور

قاتلوں اور مافیا سے لڑتا رہا ہوں..... دراصل میرے پاس ذہانت کا ہتھیار ہے..... وہ تمہارے پاس بھی ہے..... تمہارے پاس بھی ذہانت تھی جس نے تمہیں اور بار بار لٹنے سے بچایا....."

"میں آپ کی کامیابی کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کروں گی۔" وہ بولی۔

"تم کسی کو نہیں بتانا کہ میں اس مشن پر اکیلا جا رہا ہوں....." ٹائیگر نے کہا۔

"اس میں حرج کیا ہے....." بملا کماری بولی۔ "وہ شیطان آپ کے نام اور کارناموں سے یقیناً واقف ہوگا..... آپ کا نام سنتے ہی خوف زدہ ہو جائے گا....."

"میں دشمن کو کمزور سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔" ٹائیگر نے کہا۔ "اسے جیسے ہی میری آمد کی خبر پہنچے گی وہ چوکنا اور ہوشیار ہو جائے گا۔ اور میرے لئے مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش کرے گا..... بارش رک گئی ہے..... چلو..... میں تمہارے گھر چھوڑ آؤں..... لیکن جانے سے پہلے آبی راستے اور جزیرے کے محل وقوع کا نقشہ بنا دینا۔"

☆.....☆.....☆

جب ٹائیگر بملا کماری کو لے کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے گھر والے بیٹی کو صحیح سلامت پا کر بے انتہا خوش ہو گئے..... وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جس طرح اور لڑکیاں عورتیں پراسرار طور پر گمشدہ ہونے کے بعد ان کا جس طرح نام ونشان اور سراغ نہیں ملا اس طرح بیٹی کا بھی نہیں ملے گا۔ وہاں ایک جذباتی رقت آمیز مناظر تھا۔ گھر والے بیٹی کو گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ بملا کماری بھی ایک بچی کی طرح رو رہی تھی..... اس پر کیا قیامت بیتی وہی جانتی اور اس کا دل اور اس کے بنانے والے۔

ٹائیگر نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ اور بملا کماری ایک ہفتہ تک کہیں روپوش رہیں اور اس کی واپسی کی خبر کسی کو معلوم نہ ہو..... حتیٰ کہ پولیس اور رشتہ داروں تک کو نہ دی جائے..... چوں کہ وہ فرار ہو کر آئی ہے۔ اس لئے وہ آدم خور شیطان بہت غصے اور خار اور طیش میں ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو سخت احکام جاری کئے ہوئے ہیں کہ کسی بھی قیمت پر بملا کماری اور اروندا کو اغوا کر کے دوبارہ جزیرے پر پہنچا دیا جائے..... آج تک ان دو میں سے کوئی بھی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا..... اروندا نے زبردست چوٹ دی ہے..... نہ صرف اس کا پرس جس میں لاکھوں مالیت کے ڈالر اور اتنی ہی مالیت کی ہیروں کی انگوٹھی کے علاوہ ایک کشتی بھی لے کر فرار ہوا ہے..... بملا کماری بھی نہ صرف اس کی لانچ بلکہ اس جزیرے کے راز بھی لے گئی ہے..... اس شیطان کے کارندے پورے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پولیس میں جو کالی بھیڑیں ہیں وہ اس کے پالتو کتوں کی طرح ہیں۔

اسے رخصت کرنے بملا کماری دروازے تک آئی تھی۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں رہا۔ بملا کماری نے پرنم آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا اور پھر گالوں پر بوسے ثبت کئے۔

"یہ کیا.....؟" ٹائیگر نے کہا۔

"یہ بوسے غلیظ نہیں ہیں..... ان میں کوئی میل نہیں ہے..... دودھ کی طرح صاف وشفاف ہیں..... ان میں پاکیزگی ہے..... خلوص اور جذبے کا اظہار ہے..... آپ کی عظمت کا اظہار ہے..... آپ دیوتا ہیں..... کس قدر عظیم ہیں..... آپ نے مجھ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا..... میں آپ کو زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کروں گی..... ایک انسان وہ ہے..... اور ایک انسان آپ ہیں۔" پھر وہ ٹائیگر کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں کا عنوان بنانے لگی۔

اسی اثنا میں اس کے گھر والے بھی آ گئے۔ انہوں نے ٹائیگر کو بڑی محبت اور گرم جوشی اور اشکبار آنکھوں سے رخصت کیا..... اس سے وعدہ لیا کہ وہ ان سے ملنے آئے گا..... ہماری پرارتھنا ہے کہ وہ آپ کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچے۔ ہمارے پاس آپ کو دینے کے لئے دعاؤں کے سوا کچھ نہیں.....

ٹائیگر ان کی محبت، گرم جوشی اور خلوص بھرے جذبات سے متاثر ہو کر باہر آیا اور پھر پیدل ہی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر زیادہ دور نہیں آیا تھا..... وہ بملا کماری کو بھی پیدل ہی لے کر آیا تھا۔ کیوں کہ موسلا دھار بارش کی وجہ سے ٹیکسیاں اور آٹو رکشا غائب تھے..... اور پھر رات بھی خاصی ہو رہی تھی۔

وہ ایک ایسی کالونی سے گزر رہا تھا جس میں متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ اس نے ایک نسوانی آواز سنی وہ ہذیانی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ماں..... یہ وہی ذلیل اور کمینہ جو مجھے ایک ہفتہ قبل اپنے ساتھیوں کی مدد سے اغوا کر کے لے گیا تھا جب میں رات کے وقت ڈانسنگ کلب سے آ رہی تھی اور پھر انہوں نے مجھے دو گھنٹے تک جس بے جا میں رکھا اور میری تصویریں بے لباسی کی بنائیں..... میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ رات ایک بجے گھر لوٹی تھی۔"

"تم لوگوں نے اس کی تصویریں بے لباسی کی حالت میں کیوں اتاریں....." یہ لڑکی کی ماں کی کرخت آواز تھی۔

"صرف تصویریں مختلف زاویوں سے اتاری تھیں۔" مرد نے جواب دیا۔ "اس کی عزت برباد نہیں کی..... اپنی بیٹی سے پوچھ لیں۔ ہم چاہتے تو اسے قابو میں کر کے بے بس کر سکتے تھے..... ہم کل تین تھے..... ایک سترہ برس کی لڑکی بے نیام تلوار کی طرح دیکھ کر ہمارے جذبات کیسے تند ہو گئے ہوں گے شریمتی جی.....! آپ اندازہ کر سکتی ہیں۔"

لیکن یہ تصویریں کیوں اور کس لئے.....؟" لڑکی کی ماں بولی۔ "کیا یہ بری اور قابل اعتراض بات نہیں ہے کہ اسے اغوا کیا جائے اور اسے دہشت زدہ کیا جائے؟"

"اس لئے کہ ہمارا باس ایک فلم ساز اور ہدایت کار ہے جو ممبئی میں فلمیں بناتا ہے۔ وہ آج کل نئے چہروں کی تلاش میں میسور آیا ہوا ہے۔" وہ شخص بتانے لگا۔ "دراصل اسے اپنی فلم کے لئے ایسی ہیروئن کی ضرورت ہے جو بولڈ سین کر سکے..... جیسے سین ہندوستانی فلموں میں ہیروئن کر رہی ہیں..... لاکھوں نہیں کروڑوں کما رہی ہیں..... آپ کی بیٹی بھی بولڈ لگتی ہے..... یہ کیا آج کل ستر فیصد لڑکیاں بولڈ لگتی ہیں..... ڈانسنگ کلب میں آپ کی بیٹی کو دیکھا۔ وہاں دس بارہ نہایت حسین اور پرکشش بھی تھیں۔ ہم نے ان سب کی تصویریں ڈیجیٹل کیمرے سے اتار کر باس کو بھیجیں۔ اس نے آپ کی بیٹی کو فلم کی ہیروئن کے لئے منتخب کر لیا..... پھر ہم سے کہا گیا کہ صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس کی بے لباسی کی تصویریں مختلف زاویوں سے چاہئیں..... ہم نے اسے اٹھا کر لے جانے سے پہلے آپ کی بیٹی سے درخواست کی اور بتایا کہ ہمارے فلم ساز باس کو کس قسم کی تصویروں کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کی بیٹی نے صاف انکار کر دیا..... ہم نے باس کو آپ کی بیٹی کے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ اسے سمجھاؤ..... نہ مانے تو جبر و زیادتی سے تصویریں اتار کر بھیجو..... اس لئے ہم نے اغوا کر کے اس کی تصویریں بنائیں..... ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔"

"اچھا تمہارا باس میری بیٹی کو فلم میں کام کرنے کا کیا معاوضہ دے گا.....!" ماں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پہلی فلم، میں کام کرنے کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے....." اس شخص نے جواب دیا۔ "ہم کنٹریکٹ سائن کرنے لائے ہیں اور پچیس لاکھ پیشگی رقم..... بڑے نوٹوں میں یہ رقم اس لفافے میں ہے..... کنٹریکٹ سائن کر کے رقم لے لیں..... ہم کل سہ پہر کے وقت آ کر ہم شانتی کو لے جائیں گے۔"

"کہاں لے جائیں گے.....؟" ماں نے دریافت کیا۔

"میسور....." اس نے جواب دیا۔ "وہاں کے جنگل میں آؤٹ ڈور شوٹنگ ہو گی..... ان کے تین رقص فلمائے جائیں گے..... پھر انہیں ممبئی شہر لے جایا جائے گا..... جہاں ہیرو شاہ رخ کے ساتھ کام کرنا ہو گا....."

"سچ.....!" لڑکی مسرت آمیز لہجے میں بولی۔

"پچاس لاکھ روپے.....؟ پچیس لاکھ روپے پیشگی..... کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں..... لائیے کنٹریکٹ..... اس پر دستخط کر دوں....."

"پہلے آپ رقم گن لیں....." اس نے کہا۔ "پھر دستخط کر دیں....."

"میں رقم گنتی ہوں اتنے میں تم کنٹریکٹ پر دستخط کر دو....." ماں نے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے بعد مرد نے کہا۔ "مس شانتی.....! آپ کے دن پھر گئے..... آپ راتوں رات ہندوستان کی چوٹی کی ہیروئن میں شمار ہوں گی..... بلکہ انہیں پیچھے چھوڑ دیں گی..... میں یہ بات اس لئے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کا جیسا بدن کسی بھی ہیروئن کا نہیں ہے..... بس..... آپ کو بولڈ رقص اور بولڈ محبت بھرے سین کرنا ہوں گے..... جو فلم میں ہر ہیروئن کرتی ہے..... اس کے لئے آپ تیار ہیں نا.....؟"

"کیوں نہیں..... کیوں نہیں....." لڑکی کا لہجہ خوشی سے سرشار ہو رہا تھا۔ "اگر باس کہے گا تو میں لباس اتار کر بھینکنے کو بھی تیار ہوں..... بس مجھے دولت، شہرت اور عزت اور مقبولیت چاہیے..... جیسے کترینہ کیف..... کرینہ کپور..... ایشوریہ رائے اور دیپکا وغیرہ ہیں..... کل میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"کیا میں بیٹی کے ساتھ چل سکتی ہوں.....؟" ماں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں....." اس شخص نے جواب دیا۔ "آپ بھی اپنی بیٹی کی بڑی بہن لگ رہی ہیں..... آپ کا بدن اور سراپا اور حسن قیامت خیز ہے..... اچھا اب میں چلتا ہوں..... کل سہ پہر چار بجے میں کار لے کر پہنچ رہا ہوں..... آپ دونوں تیار رہیں..... دیر نہ کریں۔"

"ٹائیگر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیوں کہ وہ شخص باہر آ رہا تھا..... اب ٹائیگر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص انہیں چارہ ڈال کر جا رہا ہے۔ وہ بدمعاش باہر آیا۔ پھر چند قدم چلا تھا کہ بغلی گلی سے ایک شخص آیا۔

"کیا رہا رام چندر.....!" بغلی گلی سے آنے والے نے پوچھا۔ "وہ تیار ہو گئی.....؟"

"کیسے نہ تیار ہوتی....." وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "پچاس لاکھ کی آفر..... اس کی ماں بھی تیار ہو گئی..... وہ ساتھ چلنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ باس خوش ہو جائے گا..... کہ میں نے ایک تیر سے دو شکار کئے....."

"اس کی ماں کیسی ہے.....؟" اس نے سوال کیا۔

"زیادہ عمر کی تو نہیں ہے.....؟"

"وہ بھی لاکھوں میں ایک ہے..... چھتیس برس کی ہو گی..... اس میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے..... باس بہت خوش ہو جائے گا..... کل دونوں سہ پہر چار بجے تیار ہو کر انتظار کریں..... اجیت! تم کار کا بندوبست کر لینا....."

"اب کیا پروگرام ہے.....؟ ہم ہوٹل چلیں.....؟" اجیت نے پوچھا۔

"میں سوناکشی کے ہاں جا رہا ہوں..... باس نے اسے بھی ساتھ لانے کے لئے کہا ہے..... میں نے پرساد کو کل دو لاکھ کی رقم دی تھی..... وہ بتا رہا تھا کہ سوناکشی قابو میں نہیں آ رہی ہے..... میں اسے قابو میں کرنے جا رہا ہوں..... پرساد نے اسے اغوا کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کار میں جاتے ہوئے وہ ہنگامہ کرے..... اس کے تناسب بہت اچھے ہیں۔"

"اگر وہ کسی وجہ سے تیار نہیں ہوتی ہے تو تم کیا کرو گے.....؟" اجیت نے پوچھا۔

میں نے پرساد سے لفافہ لے لیا تھا..... میری ایک جیب میں رقم کا لفافہ ہے اور دوسری جیب میں تیزاب سے بھری شیشی ہے..... پہلے تو سمجھاؤں گا..... نہ مانی تو اس کے چہرے پر اور جسم پر تیزاب پھینک دوں گا۔"

"رام چندر.....! میری ضرورت نہیں ..... تم جاؤ....." وہ بولا۔ "میں اکیلا نمٹ لوں گا۔"

"میں نے اشوکا سٹی ہوٹل میں کمرا نمبر تین سو بیس لیا ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "اپنا کام ختم کر کے آ جانا....."

پھر دونوں نے اپنی اپنی راہ لی..... ٹائیگر..... رام

چندر کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

ٹائیگر غیر محسوس انداز سے اس کا تعاقب کررہا تھا..... اتفاق سے وہ مکان بھی اس کالونی میں تھا..... ٹائیگر پہنچا۔ یہ مکان ایک ویرانے میں پارک کے عقب میں تھا۔

اس گھر کے ایک کمرے کے روشن دان سے روشنی جھانک رہی تھی۔ رام چندر نے جیب سے چابی نکال کر اس کا قفل کھولا اور اندر گھس گیا..... اس نے اندر سے جو دروازے کی چٹخنی لگائی وہ صاف سنائی دی تھی۔

ٹائیگر مکان کی منڈیر پر چڑھ کر چھت پر پہنچ گیا۔ اس نے روشن دان سے اندر جھانکا..... ایک نوجوان اور بے حد حسین لڑکی جس کی عمر سولہ برس کی ہوگی..... واقعی اس کے تناسب لاکھوں میں ایک ہوں گے۔ اسے چارپائی سے باندھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ رام چندر نے اس کے منہ سے ٹیپ نکال کر کہا۔

"تیری ماں کہاں ہے.....! تیرا باپ کہاں ہے....."

"وہ میری سگی نہیں سوتیلی ماں ہے..... بدچلن ہے..... اس نے میرے مریض باپ کو زہر دے کر جان سے مار ڈالا..... پھر اس چتاں نے ایک حرامی شخص سے شادی کرلی..... اور وہ مجھے تیرے ہاتھ بیچ کر اس حرام زادے کے ساتھ چلی گئی ہے..... مجھے باندھ کر چلے گئے..... معلوم نہیں کہاں گئے....."

نرک میں گئے یا ڈوب کر مرگئے..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں..... تو میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہے نا.....؟"

"نہیں..... ہرگز نہیں جاؤں گی۔ تو کون ہوتا ہے مجھے لے جانے والا....." وہ تیز لہجے میں بولی۔

"تو کیسے نہیں جائے گی..... میں نے تیری ماں کو پچیس ہزار روپے دیئے ہیں..... میں مزید دو لاکھ کی رقم لایا ہوں تحفے میں دینے کے لئے..... اب تو میری ملکیت ہے....." رام چندر نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تھوکتی ہوں تجھ پر..... تیری رقم پر اور اپنی ماں اور باپ پر....." وہ بھڑک اٹھی۔

رام چندر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس سے میٹھے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"دیکھ سوناکشی.....! تو غصے میں نہ آ..... نہ جذباتی ہو..... تو نہایت حسین ہے..... اصل میں تو نہایت حسین نہ ہوتی تو اتنی قیمت نہ ملتی..... تجھے فلم میں ہیروئن کا چانس مل رہا ہے..... میں یہ مشورہ دے رہا ہوں..... تو وقت اور اپنی جوانی سے فائدہ اٹھا..... کیا لاکھوں کی رقم کم ہوتی ہے.....؟ اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو پچھتائے گی..... وہ تیری شادی کسی دولت مند بوڑھے سے کردے گی جو عمر میں نانا دادا کی عمر کا ہوگا..... یا پھر بازار حسن میں لے جاکر بٹھادے گا..... یہ اچھا ہے کہ فلم کی ہیروئن بن کر دولت، عزت اور شہرت کمائے.....؟"

"مجھے فلم میں کام نہیں کرنا ہے کیوں کہ شوبزنس کی ہر اداکارہ فاحشہ، طوائف، اور بازاری ہوتی ہے..... مجھے دولت، شہرت اور اس جھوٹی عزت کی کوئی ضرورت نہیں ہے..... اس سے بہتر ہے کہ خودکشی کرلوں..... مرجاؤں، اس شہر میں ایک سے ایک جوان لڑکی موجود ہے..... حسین بھی ہے..... ان سے معاملہ طے کرلو۔"

"لیکن میں کیا کروں میری جان سوناکشی..... یہ میرے باس کا حکم ہے کہ میں تمہیں ہر قیمت پر لاکر اس کے سامنے پیش کردوں....." وہ بولا۔ "اس لئے میں تجھے لے جانے پر مجبور ہوں....."

"اسے میرے بارے میں کس نے بتایا.....؟ وہ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟" سوناکشی نے تنک کر پوچھا۔

"تم نے اپنے کالج میں ہونے والے سوئمنگ کے مقابلے میں حصہ لیا تھا اور اول آئی تھیں..... تمہاری رنگین تصویریں نہ صرف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئی تھیں..... ٹی وی نے بھی کوریج دی تھی..... وہ تمہارے بدن اور تناسب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی فلم میں ہیروئن لینے کا فیصلہ کرلیا..... اس کا خیال ہے

کہ تم اس کی فلم میں ہیروئن بن کر ہندوستان کی سب سے بڑی اداکارہ بن جاؤ گی اور دولت اور شہرت تمہارے گھر کی لونڈی بن کر....."

"میری مرضی میں فلم میں کام کروں یا نہ نہیں....." سوناکشی نے تکرار کی۔ "مجھے یہ پیش کش منظور نہیں....."

"حیرت کی بات ہے....." وہ بولا۔ "اس ملک کی ہر لڑکی عورت کی خواہش ہے کہ وہ فلم میں کام کرے..... فلم میں کام کرنے کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے اور آگے جانے کو تیار ہے..... اس لئے کہ فلم کروڑ، ارب پتی بنادیتی ہے..... اس وقت ہندوستان کی کتنی ہیروئنوں کے پاس کیا کچھ نہیں ہے..... کروڑوں کی دولت ہے..... کسی چیز کی کمی نہیں ہے..... ان کے شوہر بھی مال دار ہیں..... تم گھر آئی ہوئی مایا کو ٹھکرا نہیں رہی ہو..... لات مار رہی ہو..... تم پہلی لڑکی ہو جو انکار کررہی ہو.....؟"

میں کہتی ہوں کہ مجھے تمہاری کوئی بات منظور نہیں..... میری نظروں کے سامنے سے دفع ہوجاؤ..... مجھے یہ ذلالت کی زندگی پسند نہیں، میں ایک شریفانہ زندگی بسر کروں گی..... روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرلوں گی..... کسی دفتر میں یا دکان میں سیلز گرل بن کر زندگی کے دن کاٹ لوں گی..... جاکر اپنے باس سے کہو کہ مجھے اس کی پیشکش بالکل پسند نہیں..... منظور نہیں....."

"تمہارا انکار اسے سناؤں گا تو تم جانتی ہو میرا کیا ہوگا.....؟" اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

"کیا ہوگا.....؟" وہ تپ کر بولی۔ "کیا تمہیں جان سے ماردے گا.....؟"

"میری شامت آجائے گی..... وہ مجھے نوکری سے نکال دے گا..... تم جانتی ہو کہ آج کل کتنی بے روزگاری ہے۔ پھر مجھے تنگ دستی اور بے کاری کی زندگی گزارنی ہوگی....." وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے میرا نہیں..... میں کسی کی باندی یا نوکرانی نہیں ہوں..... میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔" وہ زہرخند بولی۔ "تم نے اور تمہارے باس نے ایک غلط لڑکی کا انتخاب کیا ہے..... اس معاشرے میں ایسی بھی لڑکیاں ہیں جو ہیروئن اور طوائف نہیں بننا چاہتی ہیں..... اس لئے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی ہے۔"

وہ جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کی سانس سینے میں پھولنے لگی تو اس کا زیروبم ہیجان خیز بن گیا۔

"تو اتنی پارسانہ بن ستی ساوتری.....! ویسے تم غصے میں کتنی پیاری لگ رہی ہو....." اس نے سوناکشی کے چہرے پر جھک کر اس کا گال چوم لیا اور ہونٹ کا بوسہ لینا چاہا تو سوناکشی نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

"میں تجھے کتنی دیر سے سمجھا رہا ہوں لیکن تیری سمجھ میں خاک نہیں آرہا ہے....." اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے سے تھوک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا تو پھر ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑتا ہے..... اب بھی وقت ہے۔ راہ راست پر آجا..... تو نے میرے منہ پر تھوکا..... میں تجھے پھر بھی معاف کررہا ہوں....."

"میں نے بات نہیں مانی تو..... تم کیا بگاڑ لو گے.....؟ کیا مجھے قتل کردو گے.....؟" وہ بے خوفی سے بولی۔

"قتل تو ابھی نہیں کروں گا البتہ ایسا حشر نشر کروں گا کہ تجھے اپنا جنم دن یاد آجائے گا۔"

"تو میری مشکیں کھول دے پھر میں تجھے بتاتی

نماز کی اہمیت

ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ

"اے نمازی اگر تو دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کررہا ہے تو "اللہ" کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔

(اعجاز۔ کراچی)

ہوں کہ تیرا حشر نشر کیا ہوتا ہے۔'' وہ پھنکاری۔

''ابھی نہیں.....'' وہ ہنس کر بولا۔ ''پہلے میں تجھ سے فائدہ اٹھالوں..... پھر تیری درخواست منظور کروں گا۔''

''اگر تو نے مجھے ہاتھ لگایا اور مجھ پر آنچ آئی تو میں تیرا سر پھاڑ دوں گی.....'' اس کے لہجے میں نفرت اور غصہ بھر گیا۔

''میں موم کی بنی ہوئی نہیں ہوں..... بے غیرت .....تو ایک لڑکی کو بے بس دیکھ کر مردانگی دکھا رہا ہے..... ڈوب مر چلو بھر پانی..... حرام کی اولاد.....''

پھر اس نے جیب سے تیزاب سے بھری بوتل نکالی۔ سوناکشی کی نظروں کے سامنے لہرائی۔

''جانتی ہے اس میں کیا ہے.....؟ اس میں تیزاب ہے جو تیرے چہرے اور جسم پر پھینک دوں گا۔''

''تو مجھے موت سے ڈرا رہا ہے..... مجھے تیزاب سے نہلا بھی دے..... میں ڈروگی نہیں.....''

اصل میں کیا بات تھی ٹائیگر کے علم میں تھی..... وہ اپنے آدمیوں سے حسین اور نوجوان لڑکیاں اغوا کرواتا تھا..... ان لڑکیوں کے ساتھ جی بھرنے تک کھلونے کی طرح کھیلتا اور ہم آغوشی میں ان کا خون پیتا..... پھر ان کی دو تین فلموں کی عکس بندی کرتا..... پھر انہیں ذبح کرتا..... ان کی کھال اتروا کر ان کا کچا گوشت کھا جاتا..... اپنے آدمیوں کو اس کے عوض بھاری معاوضہ ادا کرتا.....

صورت حال ایسی تھی کہ یہ بہادر لڑکی نہ صرف اس کی زیادتی کا نشانہ بننے والی تھی..... اس کے بعد وہ اس معصوم اور جوان لڑکی کے چہرے پر تیزاب پھینکنے والا تھا..... پھر اسے یک لخت شانتی موہنی اور اس کی ماں کا خیال آیا..... شانتی اور سوناکشی میں کتنا تضاد تھا۔ فرق تھا..... شانتی اور اس کی ماں کو دولت کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا..... سوناکشی مجبور اور بے بس ہونے کے باوجود موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے عزم و حوصلے سے مقابلہ کر رہی تھی۔

ٹائیگر نے نیچے آ کر دروازے پر دستک دی تو اندر لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

''کون ہے.....؟'' چند لمحوں کے بعد اندر رام چندر کی کرخت آواز سنائی دی۔

''میں انسپکٹر ہوں.....'' ٹائیگر نے جواب دیا۔

''کس لئے آئے ہو.....؟'' رام چندر نے تیز لہجے میں پوچھا۔

دروازے پر سریش کمار کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ٹائیگر نے جواب دیا۔

''میں سریش کمار کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔ میرے پاس سرچ وارنٹ ہے اور اس کی گرفتاری کا بھی.....''

''اسے کس جرم میں گرفتار کرنا چاہتے ہو.....؟''

''وہ تمہاری بہن کی عزت لوٹ کر اور اسے اغوا کر کے مفرور ہو گیا ہے.....''

''میری بہن میسور میں ہے اور اس کی شادی ہو چکی ہے.....'' رام چندر غضب ناک ہو کر بولا۔

''میں میسور سے ہی آیا ہوا ہوں..... تو بکواس کئے جا رہا ہے..... دروازہ کھولتا ہے کہ نہیں.....؟'' ٹائیگر بولا۔

''میں کسی انسپکٹر کے باپ کو بھی نہیں جانتا۔'' رام چندر ڈھٹائی سے بولا۔ اور رات کے وقت اپنے پتاجی سے بھی نہیں ملتا ہوں..... کیا تم میرے نام سے واقف نہیں ہو..... میں سریش کمار ہوں۔ یہاں کا کمشنر بھی میرا نوکر ہے.....''

ٹائیگر اس کی ڈھٹائی پر حیران رہ گیا..... اسے اندازہ ہو گیا کہ رام چندر ایک نمبر کا حرامی ہے..... وہ اس لئے دروازہ نہیں کھول رہا ہے کہ سوناکشی کی چارپائی سے مشکیں کسی ہوئی ہیں..... وہ اس سے زیادتی کر کے اور اس کے چہرے اور جسم پر تیزاب پھینک کر فرار ہونا چاہتا ہے۔

ٹائیگر نے دروازے کے قریب ہو کر دروازے کو دیکھا۔ دروازہ کم زور سا لگا۔ ٹائیگر نے زور سے ایک کندھا رسید کیا..... دروازہ کھلا نہیں صرف ہل کر رہ گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ دروازے کو ایک دھکے کی ضرورت ہے..... وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا..... پھر رفتار سے دوڑتا ہوا آیا۔ کندھے سے پوری طاقت سے دروازے کو دھکا دیا..... دروازہ اپنے قبضوں سمیت فرش پر آ رہا..... ٹائیگر نے اپنا توازن برقرار رکھا..... اگر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتا تو دروازے سمیت فرش پر آ رہتا۔

رام چندر نے اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی تھی۔ روشن دان سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں بڑا فرق تھا..... وہ ایک نگینہ تھی..... وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی..... لیکن ٹائیگر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور آنکھوں میں جو وحشت تھی اس کی جگہ چمک نے لے لی اور چہرہ دمکنے لگا۔

وہ اوں اوں کرنے لگی..... ٹائیگر نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ سے ٹیپ نکال دیا تو وہ بولی۔

''انسپکٹر صاحب..... ! مجھے اس درندے سے بچا لیجئے..... یہ ذلیل..... کمینہ.....''

ٹائیگر اس کی مشکیں کھولنے لگا تو وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔

''نہیں..... نہیں..... اس کی مشکیں مت کھولو..... یہ بہت خطرناک لڑکی ہے.....''

وہ ٹائیگر کا ہاتھ پکڑنے لگا تو اس نے ایک زوردار مکا اس کے رسید کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور فرش پر جا گرا۔

سوناکشی فوراً ہی بستر سے نکل کر ٹائیگر کی طرف لپکی۔ اس نے ٹائیگر کو سادے لباس میں پولیس انسپکٹر سمجھ لیا تھا۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر بولی تو اس کی آواز میں نفرت اور غصہ بھر گیا۔

''انسپکٹر صاحب.....! یہ کمینہ گھر میں گھس آیا..... میری مشکیں کس دیں اور منہ سے ٹیپ چپکا دیا تاکہ میری عزت برباد کر سکے..... اور میرے چہرے اور جسم پر تیزاب پھینکنے والا تھا..... اس نے ابھی ابھی میرے ساتھ من مانیاں کیں..... اگر آپ نہ آتے تو یہ کمینہ مجھے عریاں کرنے والا تھا.....''

''تم گھبراؤ نہیں.....'' ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا۔ ''تم جلدی سے اپنا لباس، بال اور حلیہ درست کر لو۔''

''انسپکٹر.....'' رام چندر نے کہا۔ ''آپ میری بات سنیں..... اس کی ماں نے اسے میرے ہاتھ پچیس ہزار میں بیچا ہے..... تاکہ میں شادی کر لوں..... اس کی ماں اور اس کا باپ اس لئے چھوڑ گئے میں اس کے ساتھ جو چاہے کروں..... تو تم نے اس کی مشکیں کس دیں اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔'' ٹائیگر نے درمیان مین سخت لہجے میں بات کاٹی..... ''یہ تم نے غیر قانونی حرکت کی ہے۔ جو جس بیجا کے جرم میں آتی ہے۔''

''سر! بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ تو یہاں اسے چھوڑ گئے..... یہ اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی..... اس لئے مجھے اس کی مشکیں کسنا پڑیں.....''

''یہ حرام زادہ جھوٹ بول رہا ہے.....'' سوناکشی درمیان میں پھٹ پڑی۔ ''اصل بات یہ ہے کہ اس نے مجھے میری سوتیلی ماں اور سوتیلے باپ سے اس لئے خریدا کہ کسی فلم ساز کے ہاتھ بیچ دے..... وہ فلم ساز اس کا باس ہے..... میسور میں ہے اور وہ مجھے اپنی فلم میں ہیروئن لینا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ میری عزت کا دشمن ہو گیا۔ آپ نہیں آتے تو اب تک میری عزت نہ صرف تباہ ہو چکی ہوتی اور میرا چہرہ تیزاب سے جھلس چکا ہوتا.....''

''اچھا آپ اپنی شناخت کرائیں.....؟'' رام چندر بولا۔ ''آپ مجھے بوگس انسپکٹر معلوم ہوتے ہیں۔''

''تم کون ہوتے ہو جو مجھے شناخت کرنے کا حکم دینے والے.....'' ٹائیگر نے کہا۔ ''میں اس لڑکی کو وہاں لے جاؤں گا جہاں یہ جانا چاہے گی..... تم نے وہ رقم جو اس کے ماں باپ کو دی ہے اس کے عوض اس سے حاصل کرو..... تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں دوں گا..... بہتر ہے تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

''گویا تم اس لڑکی کے آشنا ہو اور اسے لینے انسپکٹر کا بہروپ بھر کر آئے ہو.....'' رام چندر نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تم اسے لے جا نہیں سکتے..... تم مجھے نہیں

جانتے ہو..... میں کون ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" ٹائیگر نے کہا۔ "تمہارا نام رام چندر ہے..... تم جزیرے کے آدم خور شیطان کے چیلے ہو..... اسے فلم کا جھانسہ دے کر جزیرے پر لے جانا چاہتے ہو.....؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں.....؟ تم ایک پیشہ ور قاتل ہو..... تمہارے جرائم کی فہرست بڑی لمبی ہے....."

رام چندر بھونچکا سا ہوگیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔

"یہ کھلونا اپنی جیب میں رکھ لو..... بچوں کے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا....." ٹائیگر نے کہا۔

"بہرحال وہ ایک ظالم اور سفاک شخص تھا۔ ٹائیگر کی بات جلتی پر تیل کی دھار بن کر گری۔ رام چندر کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا حریف کون ہے..... ورنہ وہ چاقو نہیں نکالتا..... یا چوکنا اور محتاط ہو کر اس پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھتا..... اس کے علم میں یہ بات بھی نہیں تھی کہ اس کا دشمن جوڈو کراٹے میں ماہر ہے..... بلیک بیلٹ ہے۔

وہ چاقو لہراتا ہوا ٹائیگر کے سامنے آ کھڑا ہوا..... وہ غضبناک نظروں سے ٹائیگر کو گھورنے لگا۔

"کیا تم نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے.....؟"

ٹائیگر نے کبھی دشمن کو کمزور نہیں سمجھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رام چندر اس شہر کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے..... اس نے جس انداز میں چاقو پکڑ رکھا تھا اس سے ٹائیگر نے اندازہ لگایا کہ وہ چاقو زنی میں ماہر معلوم ہوتا تھا..... اس کی مشاقی کا پتا چلتا تھا..... اس خبیث سے شکست کھانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔

رام چندر فضا میں چاقو لہراتا اس پر بجلی کی سرعت سے جھپٹا تھا..... ٹائیگر اس سے کہیں تیزی سے ایک طرف ہوگیا..... اس سے پہلے کہ رام چندر سنبھلتا اور پلٹتا..... ٹائیگر نے اس کی پسلی میں گھونسا مارا..... تو دوسرے لمحے وہ فرش پر گھونسا دے مارا تو وہ فرش پر خاک چاٹ رہا تھا..... پھر ٹائیگر نے آگے بڑھ کر اس کی پسلی میں جوتے کی ٹو سے ٹھوکر لگائی..... وہ درد سے بلبلا کر دہرا ہوگیا..... وہ چوں کہ مضبوط جسم کا تھا سرعت سے کھڑا ہوگیا۔ غصے اور درد کی شدت سے اس کا چہرہ مدن سیسوکا ہو رہا تھا..... اس نے چاقو ٹائیگر کا نشانہ لے کر اس کی طرف پھینکا..... اگر وہ تیزی سے جھکائی نہ دیتا تو چاقو اس کے سینے میں اتر جاتا..... دل کی جگہ کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند پیوست ہوجاتا..... رام چندر کا وار خالی گیا تو اسے طیش آ گیا۔

دوسرے لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو پہلوانوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہتے بھی تھے۔

اب ٹائیگر کی باری تھی..... جیب سے ریوالور نکالنے کی..... وہ یوں تو جیب سے ریوالور نکال کر اپنے دشمن کو با آسانی قابو میں کر سکتا تھا..... لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا..... کیوں کہ ایک گولی ہی اس کے لئے فرشتہ اجل ثابت ہوتی..... وہ اس کی ایسی خاطر مدارت کرنا چاہتا تھا کہ ہفتوں تک بستر سے اٹھنے کے قابل نہ رہ سکے..... اور پھر کسی لڑکی کو پھانس اور اغوا کر کے جزیرے پر پہنچا دے..... وہ اس کا دماغ ناکارہ اور اسے ہر قسم کی یادداشت سے محروم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ٹائیگر کو اپنی سور آنکھوں سے گھور رہا تھا..... وہ آدمی نہیں ناگ کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔

وہ غراتا ہوا ٹائیگر پر حملہ آور ہوا۔ اس کی حالت چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی سی تھی..... اس پر جیسے اندھا جنون سوار تھا۔ اس لئے وہ قابو اور اپنے اوسان میں نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ٹائیگر کے منہ پر پڑتا اس کی ناک پر ٹائیگر نے گھونسا جڑ دیا..... پھر وہ ایک دم سے ٹائیگر سے جونک کی طرح چمٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے لگا..... ٹائیگر نے اس کے ہاتھوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا..... اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور وہ اپنی پوری قوت سے اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا..... اس کا دم تھا کہ گھٹتا جا رہا تھا..... اس کے ہاتھوں میں جیسے کسی درندے کی سی

طاقت تھی..... ٹائیگر کا دم گھٹتا جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا..... ٹائیگر کو اپنے سامنے موت کھڑی ہنستی لگ رہی تھی..... پھر اس نے اچانک ٹائیگر کا گلا چھوڑ دیا..... ایک دل دوز چیخ مار کر وہ لڑکی کی طرف پلٹا..... اس لڑکی نے ٹائیگر کی جان بچائی تھی..... سوناکشی نے کمرے میں رکھے ایک ڈنڈے کو اٹھا کر اس بدمعاش کے کندھے پر دے مارا تھا..... وہ درد کی تاب نہ لا سکا اور ٹائیگر کی گردن چھوڑ دی تھی۔

وہ لڑکی کے پاس جا کر ڈنڈا چھیننے کی کوشش کرنے لگا تو ٹائیگر نے لپک کر اس بدمعاش کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا اب ان دونوں کے درمیان ایسی کشش شروع ہوگئی تھی جو کسی ایک کی موت پر ہی ختم ہو سکتی تھی..... سوناکشی نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا..... اس نے ڈنڈا اٹھا کر پوری قوت سے رام چندر کی ٹانگ پر دے مارا کہ درد و اذیت سے اس کی چیخ نکل گئی۔

ٹائیگر نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سوناکشی.....! تم ایک طرف ہو جاؤ..... اس کتے کے بچے سے میں خود ہی نمٹ لوں گا..... اسے ایسے سابق دوں گا کہ یہ اپنی آخری سانس تک بھول نہیں سکے گا....."

"سوناکشی تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر ڈنڈا تھامے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

ٹائیگر نے اسے اپنے بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کیا..... اور پھر بغیر کسی تاخیر کے اس کے بالوں کو پکڑ کر اسے اتنے زور سے دیوار سے ٹکرایا کہ وہ کسی سنسناتی گولی کی طرح دیوار سے ٹکرایا..... اس کا صرف سر ہی نہیں بلکہ بھیجا بھی ہل کر رہ گیا ہوگا..... وہ ایک گینڈے کی طرح تھا جو اتنی بڑی چوٹ سہہ گیا تھا اور اس پر جیسے کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سنبھل کر سرعت سے ٹائیگر کی طرف پلٹا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سنبھل کر ٹائیگر پر حملہ آور ہوتا..... ٹائیگر نے اس کی کنپٹی پر جوڈو کے دو تین ہاتھ مارے تو وہ فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا.....

سوناکشی نے فوراً ہی قریب آ کر دریافت کیا۔

"کیا یہ حرام زادہ مر گیا..... اچھا کیا آپ نے اسے جان سے مار دیا.....؟"

"مرا نہیں..... زندہ ہے....." ٹائیگر نے جواب دیا۔ "یہ انسانی درندے اتنی آسانی سے نہیں مرتے ہیں۔"

"اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا.....؟" سوناکشی نے پوچھا۔

"تم اسے کیا سزا دینا چاہتی ہو.....؟" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "یہ تمہارا مجرم ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ اسے چارپائی پر ڈال کر اس کی مشکیں کس دی جائیں..... اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا جائے....." وہ بولی۔ "اس لئے کہ ایک تو مجھے ورغلا کر میسور لے جا کر جزیرے کے آدم خور شیطان کے حوالے کرنا چاہتا تھا..... وہاں میری عزت خاک میں ملا کر..... میری قیمتی فلم بنائی جاتی..... پھر مجھے وہ آدم خور شیطان ذبح کر کے میرا گوشت کھا جاتا..... وہ جانے اب تک کتنی معصوم لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر لے جا چکا ہے..... لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالا جائے۔ تیزاب کی شیشی اس کی جیب میں ہے..... دو لاکھ کی رقم بھی ہے..... مجھے رقم کی ضرورت نہیں..... مجھے اس سے انتقام لینا ہے۔ کیا میں اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے اور جسم پر تیزاب ڈال کر ان معصوم لڑکیوں کا انتقام لوں جنہیں وہ اغوا کر کے وہاں پہنچا چکا ہے..... ان میں اب تک کوئی واپس نہیں آئی.....؟"

"اس سے بہتر سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔" ٹائیگر بولا۔ "یہ اس سزا کے مستحق ہیں..... قابل معافی نہیں ہیں..... اسے دردناک سزا ملے گی تو دوسرے بدمعاشوں کے لئے سبق آموز ہوگی....."

"کہیں یہ سزا پا کر مر تو نہیں جائے گا.....؟" سوناکشی بولی۔

"نہیں..... یہ حرام زادے..... شقی القلب اور وحشی قاتل اتنی آسانی سے نہیں مرتے ہیں۔"

پھر ٹائیگر نے اسے فرش سے اٹھا کر چارپائی پر ڈال کر اس کی مشکیں کس دیں..... منہ پر ٹیپ چپکا دیا..... پھر اس کی جیب سے رقم والا لفافہ اور تیزاب کی بوتل نکالی۔

"کاش.....! میری سوتیلی ماں اور سوتیلا باپ اس وقت آجاتے تو میں انہیں بھی یہی سزا دیتی....."

"تم فکر نہ کرو..... انہیں اپنے کئے کی سزا مل جائے گی....."

پھر سوسا کشی نے تیزاب کی بوتل کا کارک ہٹا کر تیزاب رام چندر کے چہرے اور جسم پر دو ایک جگہ چھڑک دیا..... پھر اسے ہوش آ گیا۔ وہ تڑپنے اور دہشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے اور ماہی آب کی طرح تڑپنے لگا۔

"کمینے..... ذلیل....." وہ پھنکاری۔ "یہ وہی تیزاب ہے جو مجھ پر ڈالنا چاہتا تھا..... اب دیکھ..... کیسا لگ رہا ہے.....؟ اس محسن کی وجہ سے میں تیرے ہاتھوں سے بچ گئی..... میری آرزو ہے کہ تو مرے نا بلکہ ساری زندگی سسک سسک کر گزارے..... تو موت مانگے تو تجھے موت بھی نصیب نہ ہو....."

"اب تم کہاں جانا چاہتی ہو.....؟" ٹائیگر نے پوچھا۔ "تمہیں کہاں چھوڑ دوں.....؟"

"اس کالونی میں میری سگی پھوپی رہتی ہے..... آپ وہاں چھوڑ دیں۔ وہاں مجھے ہر طرح کا تحفظ رہے گا....."

باہر نکلتے وقت سوناکشی بولی۔ "آپ یہ لفافہ ساتھ نہیں لے جا رہے ہیں.....؟ اس میں دو لاکھ کی رقم ہے....."

"کیا تم اس لفافے کو لے جانا چاہتی ہو..... تو لے جاؤ..... مجھے اس کی ضرورت نہیں..... کیوں کہ اس لفافے میں رقم نہیں سانپ ہیں....."

"مجھے بھی یہ حرام کی دولت نہیں چاہئے....." سوناکشی بولی۔

"جب وہ سوناکشی کو اس کی پھوپھی کے ہاں پہنچا کر چائے پی کر اس دکان کے سامنے سے گزرا تو اس نے وہاں بھیڑ دیکھی..... ٹائیگر نے پولیس کو فون کر دیا تھا..... جب سوناکشی کی سوتیلی ماں اور باپ یہ دیکھنے آئے تھے کہ..... کیا سوناکشی..... رام چندر کے ساتھ چلی گئی یا نہیں..... انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سوناکشی کی جگہ..... رام چندر چارپائی سے بندھا ہوا ہے..... اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا ہے..... ایک لفافہ رکھا ہوا ہے میز پر جو نوٹوں سے بھرا ہوا ہے..... وہ ششدر تھے..... ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا..... اس وقت پولیس پہنچی..... انہوں نے پہلے تو ایمبولینس منگوائی دو لاکھ کی رقم تحویل میں اور میاں بیوی کو حراست میں لے کر گاڑی میں ڈال کر تھانے لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ٹائیگر موہن داس کے گھر پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ شانتی نے کھولا اور اسے حیرت سے دیکھا۔

"کون ہیں آپ.....!" وہ چونک کر بولی۔

"آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟"

"آپ سے اور آپ کی ماں سے....." ٹائیگر نے جواب دیا۔

"وہ کس لئے.....؟" شانتی چونک کر بولی۔

"اس لئے کہ آپ کی اخلاقی مدد کروں..... اس لئے کہ آپ ماں بیٹی گڑھے میں گرنے جا رہی ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں..... صاف صاف بتائیں۔" شانتی نے مشکوک ہو کر کہا۔

"کیا تمام باتیں باہر کھڑے ہو کر کروں....." ٹائیگر نے کہا۔ "اندر آنے کے لئے نہیں کہیں گی؟"

شانتی کی ماں بھی اس وقت ان کی باتیں سن کر آ گئی۔ وہ تیز لہجے میں بولی۔

"ہم نہیں جانتے ہیں آپ کون ہیں.....؟ اتنی رات آنے کا مطلب کیا ہے؟..... کل سہ پہر آئیں۔"

"اس وقت تو آپ میسور روانہ ہو چکی ہوں گی....." ٹائیگر نے کہا۔ "مجھ بے وقوف مت بنائیں۔"

ماں بیٹی نے چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ شانتی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ کس نے آپ کو بتایا ہے..... ہمیں آپ سے خوف آ رہا ہے۔"

"گھبرائیے نہیں..... میں تو آپ کی مدد کرنے اور پچیس لاکھ کی رقم کے بارے میں بتانے آیا ہوں..... آپ دونوں کو ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلانے آیا ہوں..... کل آپ کو لینے رام چندر نہیں اجیت آئے گا....."

"کیا آپ ان کے آدمی ہیں.....؟ پچیس لاکھ کی رقم کے بارے میں کس نے بتایا.....؟"

"جب تک میں اندر نہ آؤں اس وقت تک کچھ بتانے سے رہا....." ٹائیگر نے جواب دیا۔

ماں بیٹی نے بادل نخواستہ اسے اندر بلا کر بٹھایا۔ ماں بیٹی سخت پریشان اور خوف زدہ تھیں۔ ٹائیگر انہیں پراسرار سا لگ رہا تھا۔

"دیکھئے شریمتی جی.....!" ٹائیگر بولا۔ "پچیس لاکھ کے نوٹ سب جعلی ہیں.....؟"

"کیا.....؟" ماں بیٹی ایک دم سے اچھل پڑیں۔

"چین نہیں آیا ہے تو اس میں اور اسی وقت چیک کر کے دیکھ لیں..... جعلی نوٹ رکھنا اور اسے چلانا بڑا جرم ہے....."

"میں ابھی چیک کئے لیتی ہوں۔" شانتی کی ماں بولی۔ "میں بینک میں کیشیئر ہوں۔"

پھر وہ اندر کے کمرے میں گئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا لی۔ دس منٹ کے بعد واپس آئی اس کے ہاتھ میں رقم کا بھورے کاغذ کا لفافہ تھا..... اور چہرہ فق تھا۔

"یہ صاحب سچ کہہ رہے ہیں..... تمام نوٹ جعلی ہیں....." وہ مردہ لہجے میں بولی۔

"رام چندر جو آیا تھا انتہائی خطرناک اور پیشہ ور قاتل ہے..... وہ نجانے کتنی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت لوٹ چکا ہے..... نہ جانے کتنے قتل کئے..... اس وقت وہ اسپتال میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے..... اس لئے کہ ایک لڑکی نے اس پر تیزاب پھینک دیا..... اس لئے اس کا دوست آپ دونوں کو میسور لے جانے آئے گا..... بہتر ہے آپ دونوں گھر کو مقفل کچھ دنوں تک کہیں روپوش رہیں..... یا شہر سے مضافات یا پھر مدراس چلی جائیں..... کیوں کہ شانتی کی تصویریں دیکھنے کے بعد اس کے حصول کے لئے دیوانہ ہو گا..... اس کی کوشش ہو گی کہ ہر قیمت پر شانتی کو حاصل کرے۔ وہ اس ارادے سے باز نہیں آئے گا۔"

پھر ٹائیگر نے انہیں اس پراسرار اور خوفناک جزیرے اور آدم خور شیطان کے بارے میں بتایا تو ماں بیٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹائیگر کے دلاسا دینے پر ان کے اعصاب قدرے پرسکون ہو گئے۔

پھر شانتی کی ماں نے پوچھا۔ "اس پچیس لاکھ جعلی کرنسی کا کیا کریں.....؟ کہاں ٹھکانے لگائیں؟"

"اسے نذر آتش کر دیں..... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں....."

نوٹوں کی گڈیوں کو نذر آتش کرنے میں ان کی مدد کی پھر وہاں سے نکل کر گھر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو وہ اس آدم خور شیطان کے بارے میں سوچنے لگا کہ کس طرح اس جزیرے پر پہنچے..... وہاں پہنچنے کے لئے اسے کون سا راستہ اختیار کرنا ہو گا.....؟ رات ہی وہ سفر کر کے اس جزیرے کی سرزمین پر قدم رکھ سکتا ہے..... دن کی روشنی میں ناممکن سا ہے..... اسے یہ بتایا گیا تھا کہ اس جزیرے کے عقب میں ایک بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ تین میل کے فاصلے پر ہے..... وہاں سے بھی رات کے وقت آیا جا سکتا ہے..... اس جزیرے پر جو خطرناک اور خوں خوار شکاری کتے ہیں اسے ان کا ڈر اور خوف نہیں تھا..... کیوں کہ اس کے پاس جو چرمی منقش طلسماتی بیج نما کتے ہی نہیں بلکہ درندے اور موذی جانور سانپ اور اژدھے بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے..... اروندا

نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس پراسرار اور خوفناک جزیرے کے عقب میں جو چھوٹا سا جزیرہ ہے وہ دوفرلانگ کے رقبے کا ہے..... وہاں آبادی ہے۔ دس بارہ گھر ہوں گے..... وہاں بوڑھے درخت اور گھنی جھاڑیاں اور کھیت ہیں..... پھل دار پیڑ بھی ہیں..... اس کے علاوہ وہاں گائے کے باڑے ہیں..... مویشی بھی ہیں..... مرغ بانی کے فارمز ہیں..... اس جزیرے کو رام گاؤں کہا جاتا ہے..... رام گاؤں سے دودھ، گوشت اور مرغیاں بھی اس پراسرار اور خوفناک جزیرے کو سپلائی کیا جاتا ہے..... اس پراسرار اور خوف ناک جزیرے کو چھوٹے جزیرے کے لوگ راون کہتے ہیں..... اس لئے وہاں راون کی حکومت ہے..... راون جزیرے کے عقب میں جوندی ہے وہاں پہاڑیاں بھی ہیں.....

راون جزیرے کی ایک عمارت میں فلم اسٹوڈیو ہے..... ممنوعہ قسم کی فلموں کی شوٹنگ اس میں ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات آؤٹ ڈور بھی ہوتی ہے..... تاکہ اس کے ملازمین اور ساتھی بھی دیکھ سکیں..... کسی کسی دن قرعہ اندازی کر کے دس لڑکیوں اور عورتوں کو اس کے ان آدمیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ وہ جشن منائیں۔ انہیں شراب کی ایک بوتل بھی دی جاتی ہے۔ چوں کہ یہ سارے مفرور خطرناک اور قاتل ہوتے ہیں جو جیل میں سزا بھگت رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح اور محافظوں کو رشوت دے کر یا قتل کر کے فرار ہو گئے تھے..... وہ شیطان انہیں ہر وقت خوش رکھنے اور ان کی دل بستگی کا سامان فراہم کرتا تھا۔ اس طرح وہ نہ صرف اس کی مٹھی میں تھے اور تابع بھی ہو جاتے تھے..... مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ جرم پیشہ اور سفاک قاتلوں کو شراب اور شباب کی طلب رہتی تھی..... اس کے جزیرے پر جیسی نوجوان اور حسین لڑکیاں عورتیں جو نگینوں کی طرح ہوتی تھیں وہ ان کے خواب میں بھی نہیں آتی تھیں۔

رام گاؤں میں عمر رسیدہ اور بے کشش عورتیں رہ گئی تھیں..... یا پھر وہ لڑکیاں اور جواں سال عورتیں جن میں کوئی کشش اور حسن نہ تھا۔ وہاں جتنی حسین اور جواں عورتیں تھیں اس نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ پڑوسی کا خیال کر کے صرف دل بہلایا لیکن انہیں قتل نہیں کیا تھا۔

ٹائیگر نے اب تک اس آدم خور شیطان کے کئی آدمیوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا..... اسے اندازہ تھا کہ وہ خبیث اس بات پر یقیناً چراغ پا ہوگا کہ ایک مرد اور ایک لڑکی جو اس کے جزیرے سے فرار ہوئے اب تک ان کا پتا نہیں چلا تھا اور نام ونشان نہ تھا۔ اور پھر اس کے نہایت قابل اعتماد اور بازو ناکارہ کر دیئے گئے تھے۔ اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ کسی کام آسکیں۔ معذور اور اپاہج ہو گئے تھے۔ اس بری طرح جھلس گئے تھے..... اسے جو نقصان پہنچایا گیا تھا وہ ناقابل تلافی تھا۔ وہ اروند اور بملا کماری کی تلاش میں اس لئے بھی تھا کہ وہ اس کے کئی راز لے گئے تھے..... اب اس کے اور جزیرے کے بارے میں..... اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی دنیا کو معلوم ہو گیا تھا..... وہ اس جزیرے کے اسرار کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں حکومت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے.....

وہ انسانوں کا شکاری تھا..... حسین اور بے حد پرکشش نوجوان اور نازک اندام دوشیزاؤں کا.....

اس شیطان نے یقیناً اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس کے منصوبے کو ناکام بنانے میں ٹائیگر کا ہاتھ ہے..... جب سے ٹائیگر شکار کھیلنے آیا ہے تب سے اسے پے در پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔

ٹائیگر سوچتے سوچتے سو گیا۔ صبح بیدار ہو کر وہ کویتا کو دیکھنے چلا گیا۔ کویتا جلدی سے صحت یاب ہو چکی تھی۔ کویتا تیزی سے روبہ صحت ہو گئی تھی۔ اس وعدے پر پیش آنے والے تمام واقعات سنائے اور اروند اور بملا کماری کے بارے میں بتایا تھا کہ انہیں شائع نہیں کیا جائے۔ البتہ اس کے بارے میں ایک خبر شائع کی جائے کہ انسانوں کے شکاری اس کی تلاش میں آجائے..... وہ اس کی تلاش میں اور سرکوبی کے لئے کل میسور جا رہا ہے تاکہ دشمن کھل کر مقابلے پر آجائے۔

"سنو ٹائیگر.....!" کویتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔ "تم اپنا خیال رکھنا..... وہ شکاری نہ صرف بے حد خطرناک پراسرار اور درندہ صفت بھی ہے..... بہت سارے ایسے واقعات پیش آچکے ہیں کہ میں تفصیل کیا بتاؤں..... سات ماہ پہلے ایک کوسٹر جس میں چار نرسیں اور چار بڑے بڑے سرجن ڈاکٹر تھے بنگلور سے میسور گئے تھے تاکہ مضافات میں کیمپ لگا کر مریضوں کا علاج اور آپریشن کریں..... ان میں آنکھوں اور دماغ کے سرجن بھی تھے..... وہ سارے پراسرار طور پر غائب ہو گئے لیکن کوسٹر مل گئی تھی..... آج تک ان کا پتا نہیں چل سکا..... ایسے ہی جانے کتنے واقعات..... کس کس کی تفصیل سناؤں..... اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔"

دوسرے دن بنگلور..... میسور اور مدراس کے تمام اخبارات میں ٹائیگر کے اس مشن پر جانے کی خبریں شائع ہو گئی تھیں۔ کویتا نے اسے اپنی ایک ممانی دوست سرلا کا پتا دیا جس کا شوہر ایک بزنس مین تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی ٹورسٹ کشتی تھی جس میں دو کیبن تھے۔ وہ اس کشتی میں سیر و تفریح کے لئے نکلتی تھی۔ ساتھ میں اس کا شوہر یا اس کی سہیلیاں بھی ہوتی تھیں۔

اس خبر کا شائع ہونا دشمن کو نہ صرف اطلاع تھی بلکہ ایک طرح سے ٹائیگر نے اسے کھلا چیلنج دیا تھا..... ٹائیگر کو اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ مشن انتہائی خطرناک اور خوفناک مشن ہے زندگی اور جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں..... کیوں کہ اس نے دشمن کو جو نقصان پہنچایا اور پہنچا رہا ہے اسے خوف اور تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ اس کے لئے فرشتہ اجل بن گیا ہے۔

ٹائیگر موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ اگر موت آنی ہے تو نہ ایک منٹ پہلے آسکتی ہے اور نہ ایک منٹ کے بعد.....

ٹائیگر میسور پہنچا تو وہ پرعزم تھا۔

جب سرلا دیوی کے ہاں پہنچا تو وہ اتفاق سے اس روز اپنے شوہر کے ساتھ سنگاپور جا رہی تھی۔ پھر اس

تمنا

تمنا جب کسی کی ناکام ہو جاتی ہے
زندگی اداس شام ہو جاتی ہے
دل کے ساتھ دولت کا ہونا ضروری ہے
ورنہ غریبوں کی محبت نیلام ہو جاتی ہے

نے اپنی ایک سہیلی شکنتلا کو بلا کر تعارف کرایا..... شکنتلا حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی ٹائیگر سے مل کر..... وہ ٹائیگر کی بڑی مداح تھی..... پرستار تھی.....

سرلا دیوی نے اسے اپنی کشتی کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ٹائیگر.....! تمہیں اس پراسرار اور خوف ناک جزیرے تک نہیں لے جائیں گے..... بلکہ وہ ندی اور اس کے قرب و جوار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اس پراسرار جزیرے کی طرف جاتا ہے..... تمہیں خوف زدہ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... اگر تمہیں ڈر محسوس ہو تو تم کسی بھی سیکورٹی کمپنی کے دو ایک مسلح گارڈز کی خدمات حاصل کر لینا اور اس کا بل میں واپس آکر ادا کر دوں گی۔"

"کیا تم مجھے اتنا بزدل اور ڈرپوک سمجھتی ہو.....؟" شکنتلا ہنس کر بولی۔ "تم اور میں تین چار سہیلیاں کشتی میں سارا دن سیر و تفریح کرتی اور پکنک مناتی رہی ہیں..... صبح شام تک..... لیکن کبھی ہمارے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جو پریشان کن ہو..... مسٹر ٹائیگر.....! میں تو ہم پرست نہیں ہوں۔"

"دراصل مجھے آپ جیسی ہی نڈر اور بہادر اور وسیع القلب ساتھی کی ضرورت ہے۔" ٹائیگر نے خوش مزاجی سے کہا۔ "آپ کے ساتھ کشتی کی سیر میں اچھا وقت گزرے گا۔"

"شکنتلا.....!" سرلا دیوی نے کہا۔ "تم ایسا کرنا

کہ پدما..... رنجنا اور نرنجن کو بھی ساتھ لے لینا..... تاکہ پکنک کا مزا آئے۔ صبح سے شام تک کا وقت ایسا گزرے گا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"میں ان سے کہہ دوں گی اور کھانا بھی بنوا کر لیتی آؤں گی....." وہ بولی۔ "کچن میں چینی، چائے، پتی اور شربت وغیرہ ہے نا..... فریج بھی آن ہے.....؟"

"ہاں....." سرلا دیوی نے سر ہلا دیا۔

سرلا دیوی نے شکنتلا کے متعلق بتایا تھا کہ وہ ایک ماڈل گرل ہے..... اس کے کمرشل ٹی وی پر آتے رہتے ہیں..... اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے..... اس لئے کہ اسے ابھی تک ایسا شخص نہیں ملا جو وہ جیون ساتھی بن سکے۔

وہ ٹھیک دن کے دس بجے طے شدہ جگہ پہنچ گیا۔ سرلا دیوی کی کشتی جس پر انگریزی حرفوں میں ڈائمنڈ لکھا ہوا تھا وہ ٹورسٹ گائیڈ آفس کے ڈاک نمبر تین پر کھڑی تھی..... شکنتلا اس کے عرشہ پر ریلنگ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اپنا خوب صورت اور مرمریں ہاتھ فضا میں لہرایا۔

وہ عرشہ پر پہنچا تو شکنتلا کو دیکھ کر چونک پڑا۔ کل تو وہ بڑی سادگی سے آئی تھی۔ لیکن آج وہ قیامت بن کر کھڑی تھی۔ وہ کالی ساڑھی اور بغیر آستینوں اور نیچی تراش کے بے حد مختصر بلاؤز میں ملبوس تھی..... ساڑی اس نے ناف سے نیچے باندھی ہوئی تھی..... اس کے شباب کی پھبت بڑی قیامت خیز تھی۔ اس کا حسن بے حد خطرناک ہو گیا تھا..... اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں اس قدر واضح تھیں کہ ٹائیگر کی نگاہ اس کے چہرے اور سراپا پر ٹھہر نہیں پا رہی تھیں..... آخر کو وہ ایک ماڈل گرل تھی۔ اس نے اپنی جسمانی نمائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

جب اس نے شکنتلا کو کشتی میں اکیلا دیکھا تو پوچھا۔

"کیا آپ کا دوست اور سہیلیاں ابھی تک نہیں پہنچیں.....؟"

"اتفاق سے وہ چاروں آج اس قدر مصروف ہیں کہ وقت ہی نہ نکال سکے....." اس نے جواب دیا۔

"ان کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ پڑے گا..... سرلا نے مجھے کشتی چلانے میں ایسا ماہر کر دیا ہے کہ میں خطرناک حد تک تیز بھی چلا سکتی ہوں..... آپ جہاں تک کہیں گے میں لے جاؤں گی..... مجھے اس پراسرار اور خوفناک جزیرے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے..... ورنہ میں آپ کو وہاں بھی لے جا سکتی ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں....." ٹائیگر نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد شکنتلا نے کاک پٹ میں جا کر اس کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ پھر اس کی رفتار دھیمی کر کے آئی۔ عرشہ پر کیبن کے باہر ایک میز اور تین کرسیاں رکھی تھیں..... اس کے قرب نے سف دوبالا کر دیا تھا۔ وہ مہک رہی تھی اور آتش فشاں کی طرح تپش دینے لگی۔ ٹائیگر کی جگہ کوئی اور ہوتا..... وہ نہ صرف پیش قدمی کرتا بلکہ بہک جاتا اور اس تنہائی سے فائدہ اٹھاتا..... کیوں کہ شکنتلا کی خوب صورت آنکھوں میں انجانی دعوت تھی..... اور پھر وہ ایک ماڈل گرل تھی..... ایسے نامناسب سے لباس میں آنے کا مطلب کیا تھا.....

لیکن وہ اس کا چہرہ اور سراپا نظروں میں جذب کرنے کے بجائے اس نے ماحول پر نگاہ رکھے ہوئی تھی..... کیوں کہ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ سیاح اور شکاری سفر کے دوران پراسرار طور پر غائب ہو جاتے ہیں۔ ٹائیگر نے محسوس کی اکہ وہ اس لئے حد سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے..... اس نے شکنتلا کی خود سپردگی کی نگاہوں میں ایسا محسوس کیا کہ وہ اس پر مرمٹی ہے..... اس کے کارناموں کی تعریف پر تعریف کئے جا رہی تھی..... اور پھر وہ کسی حیلے بہانے سے ساڑی کا پلو گود میں گرا دیتی تو اسے اٹھانے کا خیال ہی نہیں آتا..... پھر احساس کر کے سینے اور شانے پر اسے ڈال لیتی تھی۔

ٹائیگر کو یوں بھی اس کے خطرناک حسن سے اتنا خوف آیا کہ اس آدم خور شیطان سے نہیں..... وہ لڑکیوں عورتوں کے بارے میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا..... اس نے ہمیشہ اپنے مشن سے دلچسپی لی تھی..... شکنتلا سے وہ نجات

پانے کا سوچنے لگا..... شکنتلا کے لئے لڑکوں مردوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی..... وہ ایک ماڈل گرل تھی۔ اس کی زندگی میں جانے کیسے کیسے مرد اور کالی راتیں آئی ہوں گی..... اس نے ان سے اپنی مہربانی اور فیاضی کی قیمت بھی وصول کی ہوگی..... اس پر مہربان ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا..... وہ اسے ایک دھڑی دینے سے رہا.....

"یہاں کے لوگ کس قدر توہم پرست عجیب عجیب سے مزاج اور سوچ کے مالک ہیں....." وہ کہنے لگی۔ "یہ ندی جو آگے جا کر دریا سی بن جاتی ہے۔ لوگوں نے سنسنی خیز اور من گھڑت کہانیاں گھڑ رکھی ہیں..... جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے..... یہ کہانیاں سن کر ہنسی آتی ہے..... ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں....."

"لوگوں نے کیا کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں.....؟" ٹائیگر نے انجان بن کر پوچھا۔

"جو کشتی میں لڑکیاں عورتیں سفر کرتی ہیں اس دریا میں اغوا کر لی جاتی ہیں....." شکنتلا نے جواب دیا۔

"میں سرلا اور تین چار سہیلیاں اس کشتی میں دن رات سفر کرتی رہتی ہیں..... کشتی روک کر پانی میں کودتی، نہاتی اور تیرتی رہتی آئی ہیں..... پھر ہم عرشے پر دراز ہو کر سن باتھ لیتی بھی رہی ہیں..... آج تک کوئی پراسرار آدمی یا بدمعاش اغوا کر کے نہیں لیا گیا..... اس جدید سائنسی دور میں یہ مضحکہ باتیں لگتی ہیں..... لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بدروح ہوتی ہے جو صرف حسین اور نوجوان لڑکیوں عورتوں کو لے جاتی ہے اور ان کا خون پی کر ان کا گوشت کھا جاتی ہے..... کیا آپ کو ان باتوں پر اور کہانیوں پر وسواس ہے؟"

"ان باتوں میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ کوئی ایک ڈیڑھ برس میں کتنی حسین اور نوجوان لڑکیاں عورتیں اور ماڈل گرلز بھی پراسرار طور پر غائب، لاپتہ اور گم ہوتی رہی ہیں....." ٹائیگر کہنے لگا۔ "ان کا نام ونشان اور سراغ نہیں ملا..... صرف یہ بات علم میں آئی کہ کوئی ایسا جزیرہ جنگل میں ایسی جگہ ہے کہ جس کا علم ابھی تک نہیں ہو سکا..... اس کے متعلق طرح طرح کے قصے اور کہانیاں مشہور ہیں..... کسی بدروح کا قصہ بکواس اور من گھڑت ہے..... ایک شیطان صفت شخص پس پردہ موجود ہے۔"

"وہ صرف نہایت حسین، پرکشش دوشیزاؤں کو ہی اغوا کیوں اور کس لئے کرتا ہے.....؟ کیا کوئی خاص بات ہے۔"

"ٹائیگر اسے کسی وجہ سے زیادہ تفصیل بتانا نہیں چاہتا تھا۔ صرف اس نے یہ کہنے پر اکتفا کیا۔

"وہ غیر معمولی حسین لڑکیوں کو اغوا کر کے نہ صرف ان کی عزت سے کھیلتا ہے اور ان کی غیر ممنوعہ فلمیں بنا کر بازار اور غیر ممالک میں فروخت کرتا ہے..... ان میں سے بہت ساری لڑکیوں اور ماڈل گرلز کی سی ڈیز بازار میں دستیاب ہیں....."

"جی ہاں....." اس نے اعتراف کیا۔ "میں نے اور سہیلیوں نے دیکھی ہیں..... اس ماہرانہ انداز سے عکس بندی کی ہوئی ہے کہ جیسے انہیں یورپ اور امریکہ میں فلمایا گیا ہو....."

"اچھا..... ایک بات بتائیں اور میرے سوال کا جواب صاف صاف دیں..... مبالغہ سے کام نہ لیں..... میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ تنقید کا برا نہیں مناتی ہوں..... بلکہ خوش ہوتی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ٹائیگر نے کہا۔ "آپ کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں۔"

"مجھے ماڈلنگ کا کام اس لئے ملتا اور کمرشل بنائی جاتی ہیں کہ میں غیر معمولی طور پر حسین ہوں..... نہایت پرکشش بھی..... شوبزنس کی دنیا میں مجھے سیکسی گرل کا خطاب ملا ہوا ہے..... کیا میں نہایت حسین اور سیکسی ہوں۔"

"لوگ غلط نہیں کہتے..... اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" ٹائیگر مسکرایا۔

"اس اعتراف کے باوجود آپ میری طرف متوجہ نہیں ہو رہے ہیں....." وہ بولی۔ "میں نے دانستہ اپنی سہیلیوں اور بوائے فرینڈ کو مدعو نہیں کیا..... میں ایک آزاد خیال لڑکی ہوں..... میں لندن میں پیدا ہوئی

اور چودہ برس تک وہاں رہی..... آپ کو علم ہے کہ وہ لڑکی ان کے معاشرے میں نہایت حسین اور خوش قسمت سمجھی جاتی ہے..... جس کے بوائے فرینڈ زیادہ ہوں..... جس کی زندگی میں لڑکے اور مرد زیادہ سے زیادہ آئے ہوں..... تیرہ برس کی عمر سے ہی میں نے ایک پرتعیش زندگی گزاری..... میری ماں کو میرے باپ نے اس لئے طلاق دے دی کہ ان کے دو تین دوست شوہر کی طرح بنے ہوئے تھے..... پھر ممی مجھے لے کر یہاں آ گئیں..... میری ممی ایک نائٹ کلب میں کیبرے کرتی ہیں جو بنگلور میں ہے..... میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔"

"محترمہ میں ایک سراغ رساں ہوں۔" ٹائیگر نے کہا۔ جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ جو لڑکیوں کے جلوؤں میں رہتا ہوں..... آپ نے مجھے غلط سمجھا..... میں اس وقت شکار پر آیا ہوا ہوں..... ایک تو جنگل میں کالے ہرن کے شکار کے لئے جس کا اجازت نامہ میرے پاس ہے..... دوسرا اس شخص کا شکار کرنے..... اسے گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے جو ایک انتہائی خطرناک اور پراسرار شکاری اور درندہ صفت اور شقی القلبی ہے۔"

"کیا میں شکار نہیں ہوں.....؟" شکنتلا نے شوخی سے کہا۔ "آپ میرا شکار نہیں کریں گے..... کیا میرا شکار بھی سنسنی خیز اور دلچسپ اور لطف انگیز نہیں ہے؟"

"آپ شکار نہیں بلکہ شکاری ہیں....." ٹائیگر ہنس پڑا۔ "بہرحال آپ میرا شکار نہ کریں۔ میں پہلے ہی آپ کی نظروں کا شکار ہو چکا ہوں..... میں ایک بات کی وضاحت کروں کہ..... جنگل میں جو جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے..... وہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک..... سنسنی خیز اور دلچسپ سمجھا جاتا ہے..... گو اس میں جان سے ہاتھ دھونے کا خطرہ ساٹھ فیصد ہوتا ہے۔ لیکن اس میں جو لطف اور کیف ہے وہ کسی اور شکار میں نہیں....."

"آپ جتنے ہینڈسم ہیں اتنے ہی عجیب آدمی ہیں..... ایک شکار خود شکار ہونا چاہتا ہے لیکن آپ ہیں کہ....."

"آپ مجھے عجیب آدمی ہی رہنے دیں۔" ٹائیگر نے درمیان میں ہنس کر کہا۔

وہ یک لخت کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی گود میں گرا ہوا ساڑی کا پلو اٹھایا جو اس نے بڑی دیر تک گرا رکھا تھا..... اس نے پلو اٹھا کر سینے اور شانے پر ڈالا۔ ٹائیگر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔

"سخت پیاس لگ رہی ہے..... سوچ رہی ہوں کہ اسکوائش بنا کر لے آؤں..... آپ کون سا اسکوائش پینا پسند کریں گے....." لیکن فریش جوس..... میں لیموں بھی لائی ہوں..... یا اورنج یا مینگو؟"

"لیمن فریش جوس....."

جب وہ کچن کی طرف بڑھی تو وہ اس کی سبک خرامی دیکھنے لگا..... اس نے سوچا..... کتنی بدکار، بدچلن..... اور بے غیرت قسم کی ہے..... پھر اس نے سوچا۔ شوبزنس کی دنیا میں ایسی ہی لڑکیاں عورتیں آتی ہیں جو آبرو باختہ ہوتی ہیں۔

پھر وہ ایک ٹرے میں دو گلاس فریش لیمن جوس لے آئی..... ایک گلاس اس کے سامنے رکھا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی..... پھر اس نے غیر محسوس انداز سے ساڑی کا پلو گود میں گرا لیا۔ وہ ٹائیگر کو ورغلانے اور پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

فریش لیمن جوس مزے دار تھا۔ وہ ایک سانس میں پی گیا..... چند لمحوں کے بعد اس کا سر چکرانے لگا تو اسے شکنتلا..... کشتی اور آسمان گھومتا نظر آیا..... وہ اسے کسی چڑیل کی مانند دکھائی دے رہی تھی..... وہ ہنس کر بولی۔

"ٹائیگر.....! میں تمہیں جزیرے پر لے جا رہی ہوں..... بس تمہارا وہاں..... مختصر....."

وہ اس سے زیادہ سن نہ سکا..... تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

درنایاب

اسمارہ نوشین۔ فیصل آباد

شہتوت کے پورے درخت پر بجلی کا ایک کوندا لپکا اور پورا درخت روشنیوں میں نہا گیا۔ پھر ایک ہیولہ نمودار ہوا جو کہ بعد میں ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی کا روپ دھار کر دیکھنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا اور پھر.....

مفاد پرستی اور مطلب پرستی اکثر انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

میں اپنے دھیان میں کھڑی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک صبح کی باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں، جب چوہدری الیاس اپنی بیوی ندا سے کہہ رہا تھا۔ "ابھی درنایاب بہت چھوٹی ہے، الگ گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟ دس سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔"

مگر ندا بضد تھی۔ "نہیں! یہ نایاب میرے بچوں کو بگاڑ دے گی، تم اسے زندگی کی ہر سہولت دے دو مگر یہ میرے بچوں کے ساتھ اس گھر میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔"

اور بالآخر الیاس نے تنگ آ کر درنایاب کا داخلہ لاہور کے ایک اسکول میں کروا دیا جس کی تعریف پچھلے ہی دنوں اس نے اپنے دوستوں سے سنی تھی۔

میرے سامنے ہی اس نے فون پر ساری بات چیت طے کی تھی۔ اور میں بے بسی کے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی، کیونکہ میرے ہاتھ پاؤں تو بندھے

پڑے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی۔ صرف بول سکتی تھی، دیکھ سکتی تھی اور سن سکتی تھی ابھی میں اس ظلم پر بے بسی کے آنسو ہی بہا رہی تھی، جب نایاب بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور ماں ماں کرتی میرے سامنے بے بسی سے رونے لگی اور ساتھ ہی بولی۔ ''ماں میری مدد کرو۔ یہ لوگ مجھے صبح گھر سے نکال رہے ہیں۔''

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کئے اور بولی۔ ''بیٹا یہ تمہارے لئے اچھا ہے تم خوب دل لگا کر پڑھنا۔ دیکھو! پانچویں کلاس میں تم نے کتنے شاندار نمبر لیئے ہیں اب تم آگے دل لگا کر پڑھنا مجھے خوشی تب ہی ہوگی جب تم ڈھیر سارا پڑھ کر بہت اونچے مقام پر پہنچ جاؤ اور اس گھر کے بچوں کو پیچھے چھوڑ دو۔''

مگر نایاب روئے جا رہی تھی میں نے بڑی مشکل سے اپنی قسمیں اور کبھی نہ ملنے کی دھمکی دے کر اسے چپ کرایا اور پھر وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کر کے اور آئندہ جب وہ گھر آئے تو مجھ سے ملنے کا وعدہ لے کر اندر چلی گئی کیونکہ اس کی آیا اسے بلا رہی تھی۔ نایاب کی آیا بھی اس کے ساتھ جا رہی تھی اور میں اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی اس کے غم میں غمزدہ تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ ''اگر نایاب کی اپنی ماں یہاں ہوتی تو یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔''

میں شروع سے نایاب کی کہانی سناتی ہوں۔ الیاس چوہدری چار بیٹیوں کا باپ تھا اسے اپنی جاگیر کا وارث چاہئے تھا۔ اور ان ہی دنوں کشمالہ جو الیاس کے دوست مزمل کی کزن تھی پاکستان اپنے چچا سے ملنے آئی اور وہیں پر الیاس نے اس نازک سی گڑیا کو دیکھا تو اپنا دل ہار بیٹھا اور یوں کچھ ہی ملاقاتوں میں وہ کشمالہ کو دیوانہ وار چاہنے لگا۔

ادھر ندا جو کہ الیاس کی خاندانی بیوی تھی اور جس کے ساتھ الیاس کا رویہ پہلے بھی بہتر نہ تھا اب تو اور بھی دوریاں آنے لگیں اوپر سے چار بیٹیوں کی وجہ سے خاندان والے تو پہلے ہی اسے دوسری شادی کا مشورہ دے چکے تھے۔ اب الیاس کی راہ میں نہ تو بیٹیوں اور نہ ہی ندا کی وجہ سے کوئی زنجیر پڑ سکتی تھی۔

ادھر کشمالہ بھی الیاس کے چکر میں اس کی محبت کے دعوؤں کے سامنے بے بس ہوگئی اور جو مزمل کی منگیتر تھی بھول گئی کہ منگنی شدہ ہوں۔ کشمالہ نے سب کی مخالفت کے باوجود الیاس سے کورٹ میرج کر لی اور اسی دن کشمالہ کے گھر کے دروازے اس پر بند ہو گئے۔ اور الیاس اسے اپنی حویلی میں لے آیا۔

ندا نے پہلے تو خوب واویلا کیا اور پھر الیاس کی طلاق کی دھمکی سن کر چپ رہ گئی یوں الیاس اور کشمالہ محبت کے گیت گاتے ہوئے ہواؤں میں اڑنے لگے۔

مزمل بھی کشمالہ سے بے انتہا پیار کرتا تھا اور منگنی کے بعد مطمئن تھا کہ کشمالہ کی پڑھائی کے بعد وہ شادی کر لیں گے مگر اب بازی الٹ گئی تھی وہ یہ سب برداشت نہ کر سکا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ دبئی شفٹ ہو گیا ادھر کشمالہ کا بھائی زین کشمالہ سے بہت پیار کرتا تھا وہ کشمالہ سے ملنے کے لئے اپنے والدین سے ضد کر کے پاکستان آیا مگر الیاس اور اس کی حویلی کا ماحول اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔

انہی دنوں کشمالہ کو خدا نے ایک خوبصورت گڑیا یعنی درنایاب سے نوازا، جو ہو بہو ماں اور باپ کے حسن کا پرتو تھی۔ جبکہ ندا کی بیٹیاں سانولی اور معمولی نین نقش کی مالک تھیں۔

نایاب کو دیکھ کر زین کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے اپنی بہن سے نایاب کو مانگ لیا۔ کشمالہ بھائی کی محبت کو ترسی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً فواد کے لئے ہاں کر دی۔ اور بھائی سے کہا کہ ''ہم ابھی فواد اور نایاب کی منگنی کر دیتے ہیں جب بڑے ہوں گے تب شادی کر دیں گے۔''

یوں الیاس کے ناچاہتے ہوئے بھی دونوں بہن بھائیوں نے ننھے فواد اور نایاب کی منگنی کا اعلان کر دیا اور سب کو باخبر کر دیا۔ کچھ دن رہ کر زین اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ واپس امریکہ چلا گیا۔ اور کشمالہ بھائی اور ماں باپ کی جدائی کے غم میں زندگی کے دن پورے

کرنے لگی۔

ندا کا جلاپا اتنا بڑھا کہ اس نے اپنے کزن ہاشم کے ساتھ مل کر ایک گندی سازش کی، کشمالہ کو راستے سے ہٹانے کی۔

ہاشم جو کہ اکثر حویلی آتا جاتا تھا، موقع پاتے ہی کشمالہ کے کمرے میں داخل ہوا اور کشمالہ کو یوں باتوں میں لگایا کہ اسے کچھ خیال نہ رہا اور وہ اس کے بہت قریب پہلو میں بیٹھ گیا اور کشمالہ اپنے ماں، باپ اور بھائی کی باتیں کرتے ہوئے اتنی جذباتی اور بے خبر ہوئی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ ہاشم اس کے اتنے قریب بیٹھا ہے۔

اور ادھر الیاس کے گھر آتے ہی ندا نے جال پھینک دیا کہ ''دو تین گھنٹے ہو گئے ہیں ہاشم کشمالہ کے پاس بیٹھا ہے۔ دروازہ بھی انہوں نے بند کیا ہوا ہے۔''

الیاس فطرتاً شکی مزاج تھا۔ یہ سن کر اسے غصہ آ گیا اور وہ اپنے کمرے میں گیا۔ جب اس نے زور سے دروازے کو دھکا دیا تو دھڑام سے دروازہ کھل گیا اور سامنے کا منظر اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ہاشم کشمالہ کے پہلو سے لگ کر بیٹھا تھا اور کشمالہ کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ الیاس یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور کشمالہ کو آوارہ، بدچلن جیسے خطابات سے نوازتا ہوا آگے بڑھا اور کشمالہ کے چہرے پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔ جب الیاس مارتے مارتے تھک گیا تو کشمالہ کو زور سے دھکا دیا اور کشمالہ کا سر میز کے کونے پر لگا۔

کشمالہ جو پہلے ہی اندر ہی اندر مر رہی تھی اس سلوک کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی اور ایسی بے ہوش ہوئی کہ پھر کبھی ہوش میں نہ آ سکی۔

ہاشم موقع پاتے ہی اسی وقت گھر سے رفو چکر ہو گیا۔

اس وقت درنایاب صرف دو سال کی تھی۔ الیاس نے فون کر کے کشمالہ کے بھائی زین کو کشمالہ کی موت کی خبر سنائی تو اس پر جیسے آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔

اور پھر ہفتے کے اندر اندر وہ کشمالہ کی بیٹی کو لینے آ گیا مگر الیاس نے نایاب کو ساتھ لے جانے سے روک دیا کیونکہ وہ اپنی بیٹی ہرگز نہیں دے سکتا۔ یوں زین مایوس اور غمگین دل لے کر واپس لوٹ گیا۔

ندا شوہر کی ہمدرد بن کر اس کے اور زیادہ قریب ہو گئی اور ننھی نایاب صرف آیا اماں کی گود میں سما کر رہ گئی۔ یا پھر روتے روتے میری طرف بھاگتی اور میں تو اسے گود میں اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ کیسے اٹھاتی؟ میں تو خود بے بسی کی تصویر تھی۔

اب نایاب کی بہنیں اسے مارتیں اور گندی بے تکے الفاظ کا طعنہ دے کر ہنستیں مگر نایاب کو کیا سمجھ۔

پھر آیا اماں اور میری محبت اور توجہ کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دینے لگی وہ بہت ذہین تھی انہیں سختیوں میں اس نے پانچویں کے امتحان میں ٹاپ کیا اور یہیں سے وہ ندا کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکی اور پھر ندا نے نایاب کو گھر سے بے گھر کرنے کی اسکیم سوچی اور اس پر عمل بھی کر دیا نایاب آیا اماں کے ساتھ گھر سے چلی گئی لاہور میں الیاس نے بہت پہلے کے خریدے ہوئے فلیٹ میں ان کے رہنے کا بندوبست کر دیا اور ہر ماہ اچھی خاصی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروانی شروع کر دی، جس میں سے ضرورت کے مطابق آیا اماں جا کر رقم نکلوا لیا کرتیں۔ آیا اماں کا چونکہ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لئے وہ نایاب کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اور نایاب بھی انہیں اماں جان بلاتی تھی نایاب کے اس گھر سے جانے کے بعد اس گھر میں سکھ چین کی بانسری بجنے لگی۔ مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔

نایاب کے جانے کے بعد اب میرا اس گھر میں دل نہ لگتا تھا مگر میں کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ ایک تو نایاب کی واپسی کی امید اور دوسرا میں اپنی سزا پوری کئے بغیر یہاں سے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ میری زندگی بھی کیا زندگی ہے؟

مجھے ہمیشہ انسانوں کے بیچ رہنا اچھا لگتا تھا۔ مگر میرے قبیلے والوں کو یہ کب گوارا تھا۔ اور وہ بھیم کا بچہ

جو میرا ازلی دشمن تھا وہ بھی مجھے کوہ قاف میں قید رکھنا چاہتا تھا۔ مگر میں جو کہ جنوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی حرف عام میں لوگ یعنی انسان ہمیں ہوائی مخلوق کہتے ہیں مگر پھر بھی میں نے شاہ جنات کے کئی دفعہ منع کرنے کے باوجود بھی آنکھ بچا کر دنیا میں آجاتی، درختوں پر جھولے جھولتی، آزاد فضاؤں میں نغمے بکھیرتی اور انسانوں کو بہت زیادہ تنگ کرتی۔ مجھے انسانوں کو تکلیف میں دیکھ کر خوشی ہوتی کبھی انہیں بہت زیادہ ڈراتی۔ کبھی کسی کے پیسے غائب کر لیتی، کبھی کسی کے زیورات، کبھی کبھی بچوں کی کتابیں غائب کر کے اور بچوں کو اسکول سے ڈانٹ پڑوا کر میں از حد خوش ہوتی۔ مگر ان سب حرکتوں کے باوجود میں نے آج تک کسی انسان کو جسمانی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

دنیا میں رہ کے مجھے پتہ چلا کہ انسان تو جنوں سے زیادہ چالاک اور ظالم ہیں۔ میں جب بھی چھپ چھپا کر انسانوں کی دنیا میں آتی تو اس گھر کے شہتوت کے درخت پر ضرور پہنچ جاتی اور شہتوت کھانے کے ساتھ ساتھ اس پر جھولا بھی جھولتی پتہ نہیں کیوں مجھے اس گھر میں الیاس سے اتنی دل چسپی ہوگئی تھی کہ میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتی رہیں۔ جتنا مجھے الیاس اچھا لگتا تھا اتنی ہی ندا بری لگتی تھی اور پھر اس گھر میں کشمالہ بھی آ گئی۔

وہ بہت پیاری تھی اور بہت اچھی۔ ایک دن میں یونہی چھپ کر کوہ قاف سے نکلی مگر بھیم نے شاہ جنات کو خبر کر دی اور پھر وہ بھی میرے پیچھے اس گھر کے شہتوت تک آ گئے۔ وہ اتنے غضب ناک ہوئے مجھے دیکھ کر انہوں نے مجھے جادو کے زور سے اسی شہتوت کے درخت پر قید کر دیا۔ اور میرا رونا چلانا کچھ کام نہ آیا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب کشمالہ کو گھر سے نکالنے کی سازش کی گئی تھی۔ اور میں قید میں ہوتے ہوئے بھی سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کچھ کر نہ سکتی تھی۔ کشمالہ کی موت کے بعد میرا اس گھر سے دل اچاٹ ہو گیا تھا مگر ننھی نایاب کی وجہ سے وقت اچھا گزر جاتا تھا میں نایاب سے بات کر سکتی تھی مگر اسے نظر نہیں آ سکتی تھی نایاب کے جانے کے بعد اب میں اکتاہٹ کا شکار رہنے لگی تھی۔ یہاں سے رہائی چاہتی تھی مگر قاعدے کے مطابق مجھے دس سال کی سزا اور کاٹنی پڑتی اب تو مجھے الیاس بھی اچھا نہیں لگتا۔

☆.....☆.....☆

آپا اماں مجھے لے کر لاہور والے فلیٹ میں آ گئیں جو تمام ضروریات زندگی سے بھرا ہوا تھا۔ صاف ستھرا اور خوب صورت سایہ فلیٹ بھی میرے دل سے اپنے گھر کی یاد نہ مٹا سکا۔ مجھے اپنا کمرہ رہ رہ کر یاد آتا جو اس پورے فلیٹ سے بڑا اور خوب صورت تھا۔ پھر میرے دل میں پاپا کے خلاف غم و غصہ اور نفرت بھر گئی۔ میں نے بہت دن تک ان کا انتظار کیا۔ اسکول میں جاتی تو دل چاہتا جلدی سے گھر جاؤں۔ ”ہو سکتا ہے پاپا گھر آئے ہوئے ہوں۔“ مگر گھر آ کر پتہ چلتا کہ یہ تو وہی سنسان فلیٹ ہے جس میں، میں اور اماں جان اکیلے رہتے ہیں میرا یہ سال آس و نراش کی صورت میں گزرا پاپا کا ایک دن بھی دل نہ چاہا کہ مجھے دیکھ جائیں۔ اتنے سال تو کوئی جانور بھی رکھے تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے میں تو ان کی بیٹی تھی۔

مگر سب لاحاصل تھا اور جب میرا وجود ہی ان کے لئے ناگوار اور نہ ہونے کے برابر تھا تو پھر میں نے بھی ایک فیصلہ کیا۔ اور میں نے آپا اماں سے کہا ”آج سے آپ سب کو بتائیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔“

میں نے اسکول میں اپنا نام بھی در نایاب الیاس سے بدل کر فضا، چوہدری کروالیا۔ کیونکہ اب مجھے اس نام سے ہی چڑ ہونے لگی تھی۔

مجھے اور اماں جا کو تین سال ہو گئے لاہور آئے ہوئے میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کیا، اس دن اماں بہت اداس تھیں مگر میں نے دل مضبوط کر کے انہیں کہا کہ وہ لوگ ہمارے لئے مر گئے۔ ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کیونکہ ہر ماہ ایک معقول رقم ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی جاتی تھی۔

سب کچھ بھلاتے ہوئے میں شہتوت والی ماں کی محبت نہیں بھولتی تھی اور کبھی کبھی وہ آواز مجھے اپنے قبیلے میں دراڑیں ڈالتی محسوس ہوتی جو میں نے کیا تھا کہ کبھی بھی اس گھر میں نہیں جانا اب۔

وقت گزرتا گیا اور میں نے میٹرک کا امتحان دے دیا، اور اب فارغ دن مجھے عجیب طرح کی گھبراہٹ میں مبتلا کرنے لگے اور جب میں زیادہ اکتاہٹ کا شکار ہوئی تو میں نے اماں سے مشورہ کر کے کچھ شارٹ کورسز شروع کر دیئے یوں زندگی مصروف ہو گئی اسی مصروفیت میں میرا رزلٹ بھی آ گیا۔ میں نے میٹرک میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

میں نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اماں جان سے کہا ”ہم اپنا الگ گھر لیتے ہیں۔ ایک دو دن میں ہی ہم دونوں نے ایک گھر پسند کر لیا جو بہت مناسب قیمت پر ہمیں مل گیا۔ میں نے اور اماں نے اس گھر میں رہائش اختیار کر لی، اور گھر کے پاس ہی ایک گورنمنٹ کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔

کالج میں سماہا سے میری دوستی ہو گئی اس کا گھر ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا اس کے دو بھائی تھے اور دونوں ہی پاکستان میں نہیں تھے۔ سماہا کے بابا حافظ عبدالقدوس صوفی منش انسان تھے۔ سماہا کی والدہ ایک گھریلو خاتون تھیں جب بھی وہ سماہا کے لئے اس کی پسند سے کچھ پکاتیں وہاں انہیں میں بھی نہیں بھولتی تھی۔ میں اور سماہا میڈیکل میں پہنچ گئیں تھیں اور ہماری دوستی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ لوگ ہمیں سگی بہنیں سمجھتے تھے۔

اماں جان اور خالہ زیتون بھی بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ میرے کہنے پر اماں نے یہ کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں؟ سماہا بھی میری طرح ہی ذہین تھی۔ میں کچھ کم بولنے والی عادت کی مالک تھی اور سماہا ہواؤں سے بھی دوستی کرنے کو تیار رہتی تھی۔

جہاں میں بہت کم دوست بناپاتی وہاں سماہا بی بی کے دوستوں کی لائن لگی ہوتی۔

کالج میں ہی شاہ زیب نام کا لڑکا جو بہت ذہین اور ہینڈسم تھا وہ پتہ نہیں کیسے سماہا کا دیوانہ ہو گیا۔ اب سماہا آگے اور وہ پیچھے پیچھے ہاؤس جاب بھی اکٹھا شارٹ ہوا۔ وہ سماہا کی وجہ سے مجھے بھی کافی اہمیت دیتا۔ وہ مجھے سسٹر کہتا تھا اس کی موجودگی میں مجھے عجیب سا تحفظ محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سگا بھائی ہو۔

ایک دن جب میں اسپتال سے واپس آئی تو اماں جان نے مجھے بتایا۔ ”زیتون بتا رہی تھی کہ سماہا کا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا حافظ صاحب کی چچازاد بہن کا بیٹا ہے بہت زمین ہے مگر زیادہ پڑھا لکھا نہیں۔ یہ سنتے ہی میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ میں نے اماں کو شاہ زیب کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ اگلے دن میرا آف تھا جب کہ سماہا کی ڈیوٹی تھی۔ ہم دونوں زیتون خالہ کے گھر جانے لگے کہ مجھے بھائی کی آواز سنائی دی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم لاہور آئے تھے۔ ایک دن جب میں کافی چھوٹی تھی روڈ کراس کرتے ہوئے اچانک میں تیز رفتار گاڑی کے نیچے آنے لگی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے گڑیا کی طرح تھام کر سائیڈ میں کر لیا۔ مجھے رشتوں کی پہچان نہیں تھی سوائے اماں جان کے مگر پھر بھی میں نے انہیں بھائی بولا اور ایسا بولا کہ وہ رات دن میری مدد کے لئے تیار ہوتے۔

اپنی زندگی میں، میں نے جو بھی فیصلے کئے ان میں بھائی کی رائے اور مشورہ ضرور ہوتا تھا۔ اور مزے کی بات یہ کہ میرے سگے رشتوں سے بھی زیادہ سگے لگنے والے بھائی دراصل انسانوں میں سے نہیں تھے بلکہ وہ بہت مہربان اور شریف النفس ایک جن زادے تھے۔

میں نے ان کی موجودگی میں کبھی خود کو تنہا نہ جانا۔ ہم نے کبھی اپنے اس اکاؤنٹ کو بھی نہیں چھیڑا تھا، اس وقت کے بعد جب ہم نے ایک ہی دفعہ پیسے نکال کر یہ گھر خریدا تھا۔ بھائی کے کہنے پر میں رک گئی۔ اماں بھی بھائی کو جانتی تھیں مگر کبھی بھی بھائی سے بات

نہیں کی وہ میرے ذریعے ہی بات کرتی تھیں۔ اماں زیتون خالہ کے گھر چلی گئیں۔

بھائی میرے لئے مزے مزے کی چیزیں لے کر آئے تھے جو میں نے خوش ہو کر کھائیں، بھائی نے باتوں کے دوران بتایا کہ ان کی شادی ہونے والی ہے میں بہت خوش ہوئی اور بھائی سے اس جن زادی کے بارے میں پوچھنے لگی بھائی کو شرارت سے میں جن زادہ کہتی تھی، اس لئے ان کی نسبت سے ان کی ہونے والی بیوی کو جن زادی کا نام خود ہی دے دیا، بھائی بہت ہنسے اور بولے۔ ''وہ واقعی جن زادی ہی ہے اور بہت بگڑی ہوئی غصیلی اور مار دھاڑ والی جنفی ہے، روکا شا نام ہے اس کا، میری اس سے محبت بہت پرانی ہے، مگر وہ اتنا ہی مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ میں نے بابا سے کہہ کر اس کی آزادی کا پروانہ دلوایا ہے جو کب سے اپنی سرکشی کی وجہ سے قید ہے۔ مگر ساتھ میں بابا نے شادی کی شرط رکھ دی ہے جو اس نے اپنی آزادی کے لئے قبول کر لی ہے۔

میں نے کہا ''بھائی مجھے ملوائیں گے؟'' تو بھائی بولے۔ ''اگر موڈ خوشگوار ہوا تو ملوادوں گا، مگر ابھی تو وہ بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی ہے اور میں یہی خوشخبری تمہیں سنانے آیا تھا کہ تمہارے بھائی کو منزل مل گئی ہے اس کا بچپن کا پیار جو ناممکن ہو چکا تھا وہ اب ممکن ہو رہا ہے۔''

میں خوش ہو گئی کہ میرے بھائی کو خوشیاں مل رہی ہیں پھر ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر انہوں نے کہا ''میں شاید کچھ دنوں تک نہ آسکوں۔'' اور پہلے بھی تو وہ تقریباً مہینے میں ایک چکر لگاتے تھے بھائی کے جانے کے بعد میں بھی زیتون خالہ کی طرف گئی اور زیتون خالہ نے خوشخبری سنائی کہ وہ شاہ زیب کے لئے انکل سے بات کریں گی پھر زیتون خالہ نے مجھ سے شاہ زیب کی فیملی کے بارے میں پوچھا اور جتنا مجھے پتہ تھا میں نے بتا دیا۔ جس کو سن کر خالہ مزید پرسکون ہو گئیں۔ اور ہم مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔

میں نے حسب روایت سب سے پہلے یہ نیوز ساہا کو سنائی جو کہ ابھی تک ہاسپٹل سے واپس نہیں آئی تھی، پہلے تو وہ فون میں ہی مجھ پر غرائی مگر پھر چپ کر گئی کہ سامنے ہوتی تو شاید میری گردن اس کے قبضے میں ہوتی۔

دو تین دن کے بعد شاہ زیب کو اپنے گھر والوں کو لانے کے لئے کہا گیا اور پھر شاہ زیب کے گھر والے بھی آ گئے، انہیں ساہا بہت پسند آئی اور پھر جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق اور پھر چھوٹے بھیا اور بڑے بھیا بھی آ گئے اور شادی کی رسومات ادا ہونے لگیں، تیل مہندی ،ابٹن ہر رسم میں، میں نے دونوں بھائیوں کا ساتھ ایک بہن کی طرح دیا۔ اور جب شاہ زیب دلہا بن کر آیا تو پھر اس سے نیگ لینے میں بھی پیش پیش تھی۔ اور پھر بارات کی واپسی کا شعور اٹھا، بارات نے واپس اسلام آباد جانا تھا۔ میں رخصتی کے وقت ساہا کے گلے لگ کر اتنا روئی کہ مجھے چپ کروانے والے بھی رو دیئے، یوں روتی دھوتی ساہا آنگن سے رخصت ہوئی۔ ساہا کے رخصت ہونے کے بعد کافی دیر تک میں اور اماں جان زیتون خالہ کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ مگر اتنی تھکن ہوئی کہ گھر آتے ہی میں بستر پر بے سدھ سو گئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر ہو گا، جب پیاس کی شدت سے میری آنکھ کھلی، پانی پینے کے لئے اٹھنا چاہا مگر اٹھنا محال لگا۔ بخار سے میں جل رہی تھی میں نے اماں کو آواز دی مگر اماں بھی تھک کر سو چکی تھیں۔ اچانک میرے سامنے پانی سے لبالب بھرا گلاس آ گیا میں ایکدم چونکی کیونکہ بھائی کی خوشبو مجھے محسوس ہو چکی تھی ساتھ ہی بھائی اور ان کے ساتھ شاید ان کی مسز تھیں وہ نمودار ہوئیں اور بھائی بولے۔ ''یہ میری بیوی روکا شا۔'' میں جلدی سے اٹھی اور بھابھی روکا شا کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈ پر بیٹھا لیا۔

بھیم بھائی بولے ''میں نے جب سے روکا شا کو تمہارے بارے میں بتایا تو یہ اس وقت سے آنے کی ضد کر رہی تھی مگر تم شادی میں مصروف تھی۔ اس لئے میں لے کر نہ آسکا۔'' بھابھی مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی نامعلوم طریقے سے میرا بخار غائب ہو چکا تھا پھر بھابھی کی نظر کارنر پر رکھے ٹیبل پر پڑی اور بھابھی

چونک گئیں اس ٹیبل پر میری اور اماں کی تصویر پڑی تھی بھابھی جب کافی دیر تک خاموش تصویر کو دیکھتی رہیں تو میں نے پوچھا۔ ''بھابھی کیا ہوا؟''

بھابھی بولیں۔ ''یہ تصویر؟''

''میں نے کہا۔ ''میرے بچپن کی ہے۔''

بھابھی بولیں۔ ''اگر کی تصویر تمہاری ہے تو پھر تمہارا نام فضا نہیں در نایاب ہے۔''

میں چونک گئی ایک مدت بعد کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا تھا میں نے حیرت سے کہا۔ ''بھابھی آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' تو بھابھی بولیں۔

''نایاب میں تو تمہیں ہی نہیں تمہاری والدہ کشمالہ، ندا اور الیاس اور اس کی چاروں بیٹیوں کو بھی جانتی ہوں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتی ہیں؟'' تو بھابھی بولیں۔ ''تم شہتوت والی ماں کو شاید بھول گئی؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میں کیسے بھول سکتی ہوں انہیں؟ بچپن میں جب ندا آنٹی مجھے مارتی، یا بہنیں تنگ کرتیں تو میں شہتوت کے درخت میں ہی پناہ ڈھونڈتی، میں نے بے اختیار بھابھی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''بھابھی آپ کو کیسے خبر؟''

تو انہوں نے بتایا کہ ''وہ میں ہی تو ہوں جو تمہارے بہت زیادہ قریب ہوتے ہوئے بھی تمہاری مدد نہ کر سکی تھی۔'' پھر انہوں نے بتایا۔

''میری ماں بے قصور تھی وہ ایک پاک دامن عورت تھیں مگر ندا نے سازش کے ذریعے اپنے کزن کو بلیک میل کر ڈرامہ کیا تھا۔''

میں بے ساختہ بھابھی سے لپٹ گئی میں روئے جا رہی تھی مگر آج میرے ذہن سے یہ بوجھ اتر گیا تھا کہ میری ماں قصوروار تھی پھر میں نے بھابھی سے کہا ''مجھے اور بتائیں۔'' پھر بھابھی نے شروع سے لے کر آخر تک مجھے سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ ''اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو پھر وہ ذات حرکت میں آتی ہے۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''میرے آنے کے بعد اس گھر میں کچھ عرصہ تو امن و امان رہا مگر پھر آہستہ آہستہ پاپا کا کاروبار ٹھپ ہونے لگا مجھے گھر سے نکلے آٹھ سال ہی ہوئے تھے کہ پاپا کا کاروبار کم سے کم ہونے لگا۔ ندا آنٹی جو آسائشات کی عادی تھیں تنگی میں پاپا کو طعنے دینے لگی کہ انہوں نے سب کچھ نایاب کو دے دیا ہے ان کی بیٹیوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔''

پاپا نے تنگ آ کر میرے گھر سے نکلنے کے دس سال بعد لاہور کا چکر لگایا اور میرے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اسکول میں پرانے ریکارڈ سے میرے ایڈمیشن فارم کے سوا انہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے بڑے شہر میں مجھے ڈھونڈنا محال تھا۔ اور وہ بھی اب جب کہ ان کی پہلے والی حیثیت اور اختیارات نہ رہے تھے۔ انہیں میری اور اماں کی تلاش اس لئے بھی تھی کہ ہمارے اکاؤنٹ سے پیسے نکال کر اپنے کاروبار میں لگا سکیں۔ مگر ہائے رے قسمت کہ وہ میرے تک پہنچ نہ سکے اور ناکام واپس لوٹ گئے، اور ندا کو باتیں بنانے کا اور موقع مل گیا۔

پھر ایک دن جب کہ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے تو خلاف معمول الیاس کی طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں داخل ہوا اور ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سن کر ادھر آ گیا۔ ابھی اندر قدم رکھنے لگا تھا کہ ہاشم کی آواز نے ان کے قدم جکڑ لئے جو ندا سے کہہ رہا تھا ''ندا میں نے ہر قدم پر تمہاری مدد کی، میں شروع سے ہی تمہیں چاہتا تھا۔ پھر تمہاری شادی الیاس سے ہو گئی، مگر میں آج بھی تمہیں بھول نہیں پایا۔ ویسے تمہاری عقل کو داد دینی پڑتی ہے کیسے تم نے کشمالہ کے جذبات سے فائدہ اٹھایا، اس کے گھر والوں کا در داس کے دل میں جگا کر اور وہ جو مجھ سے سات میل دور بھاگتی تھی وہ میرے اتنے قریب کہ تمہارے بدھو شوہر کو پتہ بھی نہ چلا۔''

اور جب تک ندا اسے بولنے سے روکتی بہت دیر ہو چکی تھی الیاس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی کشمالہ کی بے گناہی کے بارے میں جان کر

الیاس غصے سے پاگل ہوگیا۔اور جب دھڑام سے دروازہ کھولا تو وہی سین ایک دفعہ پھر آنکھوں کے سامنے تھا۔مگر اب جوش سے نہیں ہوش سے کام لے کر صرف ہاشم کو گھر سے نکالا اور ندا کو صرف اتنا کہا ''آج کے بعد مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنا میں تمہارے لئے مرگیا۔بچیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو میں تمہیں ابھی گھر سے چلتا کردیتا۔''

اور اس بات کو ابھی کچھ ہی ماہ گزرے تھے کہ اس کی بڑی بیٹی سرحش کسی ندیم نامی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی مہوش جو دوسرے نمبر پر تھی وہ بھی گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے تنگ آ کر زیادہ وقت باہر گزارنے لگی اور ماں باپ کی لاپرواہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آوارہ دوستوں کی صحبت میں ایک آوارہ تتلی بن کر رہ گئی۔نشے کے سگریٹ ہر وقت اس کے بیگ میں ہوتے تیسرے نمبر پر نغمانہ اور چوتھے پر ترانہ۔ترانہ بہت حساس طبیعت کی مالک تھی گھر کے بدلتے حالات دیکھ کر وہ ذہنی مریضہ بن چکی تھی ایک دن ندا اور الیاس گھر پر نہیں تھے جب ندا اور الیاس گھر آئے تو اپنی بیٹی کی بے گور و کفن لاش ان کی منتظر تھی اور اس حالت میں ترانہ کی لاش کو دیکھ کر ندا اپنا ہوش کھو بیٹھی اور الیاس سکتے میں آ گیا۔لمحوں میں ہی سارا گھر لوگوں سے بھر گیا،یوں شام سے پہلے ہی ترانہ اپنے حقیقی گھر پہنچ گئی۔

آہستہ آہستہ دلوں میں کچھ صبر و قرار بھی آیا ہی تھا کہ مہوش کی ایک ایکسیڈنٹ میں موت کی خبر نے رہے سہے اوسان بھی خطا کردیئے۔ندا غم کے سمندر میں ڈوب گئی اور اب اسے نایاب یاد آتی، دیوانگی میں وہ نایاب سے کشمالہ سے معافی مانگتی رہتی۔یہ سب دیکھ دیکھ کر نغمانہ کا دل گھر سے اچاٹ ہوگیا اور اس نے بیرون ملک اسٹڈی کے لئے اپلائی کردیا۔اور جلد ہی اس کا ایڈمیشن ایک یونیورسٹی میں ہوگیا اور وہ ماں کو اسی حالت میں روت دھوتا چھوڑ کر باپ سے معذرت کرتی ہوئی اپنا گھر، جو،ان کی محبت میں ان کی ماں نے کشمالہ اور درنایاب کو نکال کر حاصل کیا تھا وہ اجڑا ہوا گھر چھوڑ کر بیرون ملک سدھاری۔

اب الیاس اور ندا کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں اب ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔جو یار دوست اچھے وقتوں میں الیاس کی ایک مسکراہٹ دیکھنے کے لئے اور ماتھے پر پڑے بل کم کرنے کے لئے ہزار جتن کرتے تھے اب پاس سے منہ پھیر کر گذر جاتے ہیں اور الیاس اپنی بربادی کا ذمہ دار ندا کو سمجھتا ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد روکاشا نے جب دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات اتری ہوئی تھی روکاشا نے مجھے گلے سے لگایا اور مجھے لگا جیسے ممتا سے پیاسے دل کو سکون مل گیا ہو،دل میں ٹھنڈک سی اتر آئی ہو۔

روکاشا نے مجھ سے کہا ''نایاب'' تم الیاس کو معاف کردو،اس وقت اسے تمہاری اور تمہاری دولت کی ضرورت ہے،جو اسی کی دی ہوئی ہے اگر اپنا دل بڑا کرسکتی ہو تو بیٹا! اسے معاف کردو۔''

اور میں تو پہلے ہی انہیں معاف کرچکی تھی یوں میں نے روکاشا سے اپنے والد کا فون نمبر لیا اور وعدہ کیا کہ صبح ہوتے ہی پاپا سے بات کروں گی اور یوں دل میں سکون کی لہر لئے روکاشا اور بھیم واپس لوٹ گئے،یہ کہتے ہوئے کہ ''اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو پکار لینا۔'' اور میں سوچوں کے گرداب میں الجھ کر نجانے رات کے کون سے پہر نیند کی آغوش میں جا سوئی۔

☆......☆......☆

میں الیاس چوہدری جو ایک خوشحال زندگی بسر کرتا تھا۔بچپن سے لے کر جوانی تک خوشیاں ہی خوشیاں میرے چاروں طرف رہی۔مال و دولت کی کبھی کوئی کمی نہ دیکھی اور تعلیم سے فارغ ہوتے ہی میری شادی میری کزن ندا سے ہوگئی جو میٹرک پاس تھی اور میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا ذہین اسٹوڈنٹ۔تقدیر کے اس فیصلے کو میں دل سے قبول نہ کرسکا اور ندا سے میرے اختلافات اتنے زیادہ تھے کہ مجھے ہر اس چیز سے چڑ ہوگئی جو ندا کو پسند تھی۔ندا کو زمینیں بہت پسند تھیں اور

میں نے ساری زمین بیچ کر کاروبار شروع کردیا اور کاروبار میں میں ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور انہیں دنوں میں اپنے دوست سے ملنے کوئٹہ اس کے گھر گیا اور وہاں ہرنی جیسی آنکھوں والی خوبصورت سی گڑیا کشمالہ جو بیرون ملک سے اپنے چچا سے ملنے آئی ہوئی تھی مجھے اتنی پسند آئی کہ میں سب کچھ بھول کر اس کے عشق میں دیوانہ ہوگیا میں جو کاروبار کے سلسلے میں کوئٹہ صرف ایک ہفتے کے لئے آیا تھا وہاں میرا قیام ایک ماہ سے بھی اوپر ہوگیا اور میں زین سے ملنے روز جانے لگا۔مجھے اپنے دل پر اختیار نہ تھا یوں رنگ لے آیا روز کا آنا جانا اور وہ پریوں جیسی خوبصورت کشمالہ بھی میری محبت میں مبتلا ہوگئی یوں میں یہ بھول گیا کہ میں چار بیٹیوں کا باپ ہوں اور میں نے کشمالہ سے لو میرج کرلی مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ زین کی منگیتر تھی ہماری زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی انہیں دنوں کشمالہ نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا جو میری محبت کی نشانی بھی تھی اور اس میں میری جان بھی تھی ہم خوشیوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے یہ بھول گئے کہ تقدیر ہمارا مذاق اڑا رہی ہے کچھ عرصہ خوشیوں میں کھیلتے ہوئے ہوا تھا کہ ندا کی سازش سے وہ واقعہ وقوع پذیر ہوگیا جس نے زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا اور میری خوشیوں کو آگ لگ گئی۔

اس دن کے متعلق جب سوچتا ہوں تو اپنی تمام جزیات سمیت میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جب میری کشمالہ میرے سامنے موت کے منہ میں چلی گئی اور میں نے نفرت سے منہ موڑ لیا آج وہ سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہے ہیں میں تو شاید ماضی کو آج بھی یاد نہ کرتا اگر آج زین کا فون نہ آیا ہوتا وہ مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہے ہیں جو میں نے ان کی بہن کے ساتھ مل کر کیا تھا، آج وہ اپنی امانت میری نایاب مجھ سے مانگ رہے ہیں۔جس کے بارے میں، میں خود نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟

جو میری ایک حماقت اور ندا کی ضد کی وجہ سے مجھ سے دور ہوگئی اور جسے ڈھونڈنے کے لئے میں دو مرتبہ لاہور گیا مگر اسے تو شاید اس کی آیا نے راستے سے ہٹا کر سب کچھ اپنے قبضے میں کرلیا مجھے بینک سے صرف اتنی معلومات ملی تھی کہ زینب نام کی خاتون آج سے سات سال پہلے آخری بار بینک آئی تھی اور درنایاب کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے اس لئے پیسے لینے وہی آئی ہے اور کافی بڑی رقم نکلوا کر لے گئی تھی اس کے بعد نہ کوئی آیا نہ پیسے نکلوائے صرف وہی پیسے اس اکاؤنٹ میں آتے تھے جو میں بھجواتا تھا اور اس وقت بینک میں اتنی رقم موجود تھی کہ اگر میں نکلوا سکتا تو میں اپنا ڈوبتا کاروبار سنبھال سکتا تھا۔

مگر سب بے سود پتہ نہیں میری کشمالہ کی نشانی کہاں ہوگی؟اب میں اس کے ماموں کو کیا جواب دوں گا جو فواد کے ساتھ پاکستان میں شفٹ ہونے کی بات کررہے تھے۔فواد ایک پڑھا لکھا سلجھا ہوا لڑکا ہے۔اس سے چند منٹ بات کرکے ہی اس کی قابلیت آشکار ہوجاتی ہے۔اب فواد ہارٹ اسپیشلسٹ بن چکا ہے۔پاکستان میں ہی ہاسپٹل بنانے کا ارادہ ہے اس کا۔''

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ اذان فجر کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب رات بیتی اور سوچوں میں ہی صبح ہوگئی، میں نے اللہ تعالیٰ کا نام موذن سے سن کر زبان سے اقرار کیا کہ ''بے شک اللہ سب سے بڑا ہے۔''اور ایک مدت کے بعد اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اٹھا، غسل کیا اور ندامت سے چور دل کے ساتھ اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنی نایاب کے لئے دعائیں شروع کردیں ''اللہ تعالیٰ میری بیٹی کو مجھ سے ملادے۔'' جائے نماز ندامت کے آنسوؤں سے تر ہوتا گیا اور میرے دل میں سکون اترتا گیا۔

جب صبح کا نور چار سو پھیل گیا تو میں نے خدا کی رضا میں راضی رہنے کا فیصلہ کرکے جائے نماز کو سمیٹا اور اٹھ کر باغ میں آ گیا۔اب یہی ایک حویلی قصہ پارینہ کے طور پر میرے پاس بچی تھی جس

میں، میں اور ندا اپنی غلطیوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کررہے تھے۔ ندا اب کچھ سنبھل گئی تھی وہ اپنی اولاد کو بھول چکی تھی مگر نایاب کے نام کی مالا ہر وقت جپتی رہتی۔

میں جیسے ہی واک سے فارغ ہو کر اندر کی طرف آیا تو مجھے فون بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے جیسے ہی فون اٹھایا تو ایک معصوم سی آواز نے میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کون؟ اور کس سے بات کرنی ہے؟''

تو آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں فضا چوہدری بات کررہی ہوں۔ آپ الیاس چوہدری بات کررہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جی میں الیاس چوہدری بات کررہا ہوں آپ؟'' ادھر سے ایک سسکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''پاپا جی میں نایاب، آپ کی نایاب۔'' اور میرے کانوں میں شہد کی طرح مٹھاس بھر گئی۔ ''نایاب میری بیٹی؟'' مجھ سے خوشی کے عالم میں نہ بولا جارہا تھا اور نہ میری نایاب سے بات ہو پارہی تھی۔

میں نے بڑی دیر بعد خود پر قابو پایا اور بولا۔ ''نایاب تم کہاں ہو بیٹا؟''

نایاب بولی۔ ''پاپا جی میں لاہور میں شادمان ٹاؤن میں رہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''بیٹا میں آرہا ہوں میں نے پہلے ہی دس بجے کی سیٹ ریزرو کروا رکھی ہے پتہ نہیں کس آس پر میں ایک دفع پھر تمہیں ڈھونڈنے آنا چاہتا تھا اب پتہ نہیں دس کب بجیں گے؟ ابھی تو صرف سات بجے ہیں، بیٹی اپنے پاپا کو معاف کردو۔ بیٹا تمہاری ماں بہت اچھی تھی بے قصور تھی، یہ تو ندا کی چال تھی میری کشمالہ کو مجھ سے دور کرنے کی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ مگر آج میں بہت خوش ہوں کہ میری بیٹی میری در نایاب مجھے مل گئی۔ اور بتاؤ تمہاری آیا نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟''

نایاب نے بتایا۔ ''آیا اماں میری ماں جی ہیں۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے پالا ہے، آپ آج آرہے ہیں تو پھر بات ہوگی۔ آپ لاہور پہنچ کر مجھے فون کردیجیے گا میں آپ کو لینے آؤں گی۔''

ہم نے ایکدوسرے کو خدا حافظ بول کر فون بند کردیا اور میں آنے والے سہانے وقت کے تصور میں کھو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی کہ ندا کچن سے ناشتہ لے کر نکلی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ ''کیا ہوا؟ صبح صبح پھر کوئی بری خبر سن لی ہے۔''

میں نے ندا کو دیکھا اور بولا۔ ''ندا میں آج لاہور جارہا ہوں۔''

ندا بولی۔ ''وہ تو پرسوں کا پتہ ہے مجھے۔ اللہ کرے نایاب مل جائے اور ہمارے مصیبت کے دن کٹ جائیں۔ آپ اس پیسے سے دوبارہ کاروبار شروع کرلیں۔''

میں نے کہا۔ ''ندا اب تو توبہ کرلو اور ایک اچھی ماں بن جاؤ، نایاب مل گئی ہے اور میں اپنی بیٹی کو اب اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔'' ندا حیران رہ گئی پھر بولی۔ ''چلو میرے سر سے ایک الزام تو کم ہوا کہ میں نے آپ سے نایاب کو چھینا تھا۔ آج نغمانہ سے بات کروائیں میں اسے نایاب کے ملنے کی خبر سناؤں اور اسے واپس آنے کا کہوں۔'' میں نے نمبر ملا کر فون ندا کو پکڑا دیا۔ کچھ دیر دوسری طرف بیل جانے کے بعد کال ریسو کرلی گئی مگر وہ کسی لڑکے کی آواز تھی۔ ندا نے کہا۔ ''مجھے نغمانہ سے بات کرنی ہے۔'' جب سمجھ نہ آئی تو فون مجھے پکڑا دیا اور بولی۔ ''پتہ نہیں کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟''

میں نے فون پکڑ کر ہیلو کہا تو وہ لڑکا بولا۔ ''کس سے بات کرنی ہے؟'' میں نے بتایا کہ نغمانہ سے بات کرنی ہے۔''

دوسری طرف اس لڑکے نے جو بتایا وہ میرے لئے کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔ فون بند کرکے میں نے ندا سے کہا۔ ''مجھے لاہور سے واپس آجانے دو پھر نغمانہ سے

بات کریں گے مگر جب ندا نہ مانی تو میں نے جو نمبر مجھے اس لڑکے نے دیا تھا وہ ملا کر ندا کو پکڑا دیا مگر دوسری طرف کال ریسو نہیں کی گئی دو تین دفعہ کوشش کرنے کے بعد ندا نے فون رکھ دیا اور بولی۔ ''خدا جانے کال کیوں ریسو نہیں کررہی؟''

میں نے کہا۔ ''وہ وہاں پڑھنے گئی ہے مصروف ہوگی۔'' اور میری بات سن کر ندا نے مطمئن ہو کر ناشتہ کرنا شروع کردیا۔ اس چخ چخ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گھنٹہ پورا ہوگیا ناشتہ کرنے کے بعد ندا بولی۔ ''واپسی کب ہوگی؟''

میں نے کہا کہ ''وہاں جا کر نایاب سے ملنے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔''

سارے راستے دل میں نایاب اور کشمالہ کو یاد کرتا رہا اور وقت آخر گزر رہی گیا اور جہاز نے لاہور ائیر پورٹ پر لینڈ کیا لاہور کی فضائیں آج مجھے ہلکی ہلکی سی لگ رہی تھیں۔ میں نے مسافروں کو لینے آنے والے لوگوں کی طرف دیکھا اور میری آنکھیں حیرانی اور خوشی سے پھیل گئیں کشمالہ کی مکمل تصویر میرے سامنے تھی۔ وہ بھی آنکھوں میں آنسو لئے مجھے مسافروں میں ڈھونڈ رہی تھی۔

جب میں نے ہاتھ ہلایا تو ایک دم اس نے میری طرف دیکھا اور میری طرف بھاگی۔ یہ ہی تو میری نایاب تھی میں بھی تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور ''نایاب میری بچی۔'' کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔

وہ میرے سینے لگی بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے آنسو صاف کیئے وہ میرے ساتھ لگی لگی پارکنگ کی طرف بڑھی اور اس نے ایک بڑی سی گاڑی کا دروازہ کھولا اس کے رکھ رکھاؤ سے میں جان گیا کہ میری بیٹی نے وہ سب کچھ پالیا جو میں اسے نہ دے سکا تھا۔ وہ مجھے شادمان ٹاؤن میں اپنے خوبصورت گھر میں لے آئی۔ لاؤنج میں وائٹ کپڑے پہنے بیٹھی خاتون کو دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ میری باجی زیتون تھیں، میری پیاری بہن جو سب سے پہلے ہاشم کا شکار ہوئی، ہاشم نے زیتون آپا پہ بھی ظلم کیا

دنیا کی اصلیت

اے لوگو تم کس دنیا پر فخر کرتے ہو؟

جس کا بہترین مشروب مکھی کا تھوک (شہد) اور

بہترین لباس کیڑے کا تھوک (ریشم) ہے۔

مجھے اس دنیا سے کیا لینا!

جس کے ''حلال'' میں حساب اور ''حرام'' میں

عذاب ہے۔

(فرمان حضرت علیؓ)

اور ان پر بدچلنی کا الزام لگا کر گھر سے بے گھر کردیا، زیتون آپا نے میری طرف دیکھا تو وہ سکتے کی کیفیت میں میری طرف دیکھتی رہ گئیں۔ پھر ایکدم الیاس کہہ کر میرے گلے لگ گئیں ہم دونوں زاروزار رونے لگے۔

نایاب نے حیرت سے کہا۔ ''پاپا جی آپ زیتون خالہ کو جانتے ہیں۔؟''

میں نے نایاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نایاب بیٹا یہ تمہاری پھوپھو ہیں۔''

آپا نے بے ساختہ بازو وا کردیئے اور نایاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نایاب تو مجھے اتنی پیاری لگتی تھی کہ میں سماہا سے بھی زیادہ تجھے پیار کرتی تھی۔''

اتنی دیر میں آیا اماں بھی آ گئیں۔ میں اٹھا اور احترام سے انہیں اپنے پاس بیٹھایا، اور شکریہ ادا کرنے لگا کہ میری نایاب کی اتنی بہترین تربیت کی۔

آیا اماں بولیں۔ ''بیٹا، یہ نایاب میری اپنی بیٹی ہے، میں نے کسی پر احسان نہیں کیا۔''

پھر میں نے آپا زیتون سے پوچھا کہ ''آپ مجھے گھر سے نکلنے کی پوری بات بتائیں کیونکہ مجھ تک جو بات پہنچی تھی وہ ادھوری تھی۔''

تو آپا بولیں۔ ''الیاس تم تو یہاں تھے نہیں مگر پھر

بھی تم نے میرے بارے میں وہ سب نہیں سوچا جو گھر والوں نے سمجھا۔ ہاشم مجھ پر بری نظر رکھتا تھا، میں نے اکثر نوٹ کیا، میں جب گھر میں اکیلی ہوتی وہ گھر آجاتا مجھے الٹے سیدھے شعر سناتا۔ میں اس سے بہت تنگ تھی ایک دن اماں جان اور چچی کہیں گئی ہوئی تھیں جب ہاشم آگیا اس کی فضول باتوں سے تنگ آکر میں نے کہا۔ ''اگر اب بکواس بند نہ کی تو میں اماں کو بتادوں گی۔'' میرے دھمکانے کا یہ اثر ہوا کہ وہ اسی وقت غصے سے گھر سے نکل گیا۔ جب اماں اور چچی گھر واپس آئیں تو، ہاشم نے گھر سے باہر ہی اماں اور چچی کو میرے خلاف پتہ نہیں کیا کیا بتایا کہ چچی تو چچی ،اماں نے بھی میری ایک بات بھی سننا گوارا نہ کی۔ چچی نے دیکھتے ہی دیکھتے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور مجھے بدچلن اور آوارہ کہہ کر گھر سے دفع ہونے کو کہا۔

تم جانتے ہی ہو کہ ان دنوں اماں کو چچی جو بھی کہتیں وہ وہی کرتی تھیں ، کیونکہ ابا کی وفات کے بعد چچا ہی گھر کے کرتا دھرتا تھے۔ سو انہیں چچی کا بھانجا ہاشم سچا لگا اور میں جھوٹی..... میں گھر سے خودکشی کرنے کے ارادے سے نکلی تھی اور ایک گاڑی سے ٹکرا بھی گئی تھی مگر گاڑی کا مالک نیک اور شریف بندہ تھا۔ وہ مجھے اسپتال لے گیا مرہم پٹی کے بعد وہ مجھے گھر چھوڑنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کو کہا کہ۔ ''میں بے سہارا ہوں مجھے دارالامان چھوڑ آیئے۔'' ساری کہانی سننے کے بعد انہوں نے مجھ سے نکاح کرلیا اور اپنے گھر لے آئے۔

تم سے ملنے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا کیونکہ اسی چچی کی بیٹی سے تمہاری شادی ہونے والی تھی۔ پھر میں نے بچوں میں خود کو اتنا مصروف کرلیا کہ میں سب تلخ یادیں بھول گئی مگر فضا کو جب بھی میں دیکھتی میں چونک ضرور جاتی الیاس مجھے نایاب میں تمہارا عکس نظر آتا تھا۔''

آپا کی آنکھوں میں نایاب کے لئے محبت ہی محبت تھی۔ باتوں ہی باتوں میں دوپہر کے کھانے کا ٹائم ہوگیا اور اماں نے کھانا لگادیا۔ کھانے کے بعد آپا مجھ سے بچوں کا پوچھنے لگیں اور جب میں نے سب کچھ بتایا تو آپا بہت روئیں، روتے روتے بولیں ''کیا ہاشم اب بھی آتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں اسے میں نے بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا تھا۔'' میرا جواب سن کر آپا مطمئن سی ہوگئیں۔ اتنی دیر میں حافظ صاحب بھی آگئے۔ وہ بہت پیار سے ملے۔

زیتون آپا نے ان کو بتایا کہ میں صرف فضا کا ابو نہیں زیتون آپا کا بھائی بھی ہوں۔'' یوں میں اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ مسرتوں کے جھولے میں جھولنے لگا۔

مجھے دن گزرنے کے احساس بھی نہ ہوتا۔ میں نے لاہور میں ہی کاروبار شروع کردیا اب تو نہ سرمائے کی فکر تھی اور نہ ہی کسی اور چیز کی مجھے کاروبار شروع کئے ابھی تیسرا ماہ تھا جب ندا نے فون پر بتایا کہ نغمی واپس آگئی ہے آپ آکر اس سے مل لیں۔ میں نے نایاب سے بات کی تو نایاب بولی۔ ''پاپا جی چار دن بعد آپ کی بہت اہم میٹنگ ہے وہ اٹینڈ کرکے جایئے گا۔ اگر وہاں آپ کو تین چار دن لگ بھی جائیں تو آپ سکون سے واپس آسکتے ہیں۔'' سو میں نے ندا کو فون پر بتادیا کہ ''میں اور نایاب 25 جنوری کو واپس آئیں گے۔''

مجھے زین کا فون آیا کہ وہ اور فواد مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اسی بہانے نایاب اور فواد ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں گے۔ میں نے زین سے کہا۔ ''آج کل میں لاہور میں ہوں۔'' اور میرے بتانے پر زین کو خوشگوار حیرت ہوئی کیونکہ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر رہتے تھے۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ دوپہر کا کھانا زین اور فواد ہمارے ساتھ کھائیں گے میں نایاب اور اماں کو بتایا کہ ''زین اور فواد دوپہر میں آرہے ہیں۔''

نایاب کو جب میں نے بتایا کہ ''زین اس کا ماموں ہے'' تو وہ بہت خوش ہوئی۔

بارہ بجے چوکیدار نے آکر بتایا کہ باہر کوئی

زین نام کا آدمی آیا ہے تو نایاب نے کہا جلدی سے گیٹ کھولو اور مجھے بتا کر جلدی سے باہر نکلی اور باہر کھڑے شخص کو حیرت سے دیکھنے لگی اور پھر حیرت سے بولی ''انکل آپ؟''

زین آگے بڑھا اور بولا۔ ڈاکٹر فضا آپ یہاں کیسے؟''

تو نایاب بولی۔ ''میں در نایاب ہوں۔'' اتنی دیر میں میں ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اور زین کو گلے لگایا پھر میں نے فواد سے ہاتھ ملایا وہ لوگ اندر آئے، زین بہت خوش تھا خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا اور پھر چائے کا دور چلا تو زین نے بتایا کہ ''میں دو تین ماہ سے لاہور میں ہی ہوں۔ نایاب کی اور میری پارک میں ملاقات ہوتی رہی ہے میں اسے فضا کے نام سے جانتا تھا اور اگر نایاب کے ساتھ فواد کی بچپن کی منگنی نہ ہوتی تو میں نایاب کی بجائے فضا کو پسند کرتا مگر اب شکر ہے دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں۔ اور میں اپنی بیٹی کو جلد اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے فواد کچھ ایڈجسٹ ہوجائے پھر جب تم کہو، اپنی امانت لے جانا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نایاب سے اس رشتے کے بارے میں بات کی تو وہ بولی۔ ''پاپا جی جو آپ کا فیصلہ ہوگا مجھے منظور ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میٹنگ کے بعد ہم دونوں کراچی جائیں گے۔'' میں نے ندا کو بھی بتایا ہے کہ ہم دونوں آئیں گے تو نایاب نے کہا ٹھیک ہے۔''

میں آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا میں نے سوچا کہ ندا سے میں نے کوئی واسطہ نہیں رکھنا اور اپنی حویلی نغمانہ کو دے دوں گا۔ نغمانہ کے بارے میں سوچتے ہی مجھے اس لڑکے کا بھی خیال آیا جس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا ''نغمانہ نے شادی کرلی ہے۔'' پتہ نہیں یہ بات سچ بھی تھی یا غلط۔ نغمانہ سے جاکر پوچھوں گا۔''

جس دن ہمیں کراچی جانا تھا نایاب کے اسپتال میں ایمرجنسی آگئی اور ہمارا جانے کا پروگرام ملتوی ہوگیا ندا سے بات کرنے کو بھی میرا دل نہ چاہتا تھا، اس لئے اسے بتانا بھی میں نے گوارا نہ کیا۔

ندا اور نغمانہ سارا دن انتظار کرتی رہیں مگر میں نہ پہنچا۔ انہیں تو نایاب کو ختم کرنے کی جلدی تھی۔ ائیر پورٹ کال کرکے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ''فلائٹ آئے تین گھنٹے گذر گئے ہیں۔''

ندا نے مجھے فون کیا جس پر میں نے بتایا۔ ''ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکے اب جلد ہی کوشش کریں گے۔'' ندا حیران تھی کہ میں اس سے ٹھیک طرح بات نہیں کررہا تھا۔

گزرے ماہ و سال کا ایک لمحہ لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ زیتون تھی میری والدہ بہت سیدھی عورت تھیں مگر زیتون آپا..... ندا نے ہاشم کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا اور زیتون راہ سے ہٹ گئی۔ انہی دنوں زندگی میں ہلچل مچی سوتن کی صورت میں کشمالہ میری زندگی میں آگئی اور نا چاہتے ہوئے بھی ندا کو زہر کا گھونٹ پینا پڑا۔ پھر کشمالہ نے بھی ایک بیٹی کو جنم دیا اور پھر ہاشم کا ساتھ کام آیا اور کشمالہ کو گھر سے نکالتے نکالتے وہ خود میری زندگی سے ہی نکل گئی پھر نایاب کو گھر سے نکالنا کون سا مشکل تھا ہوتے ہوتے بچے بڑے ہوگئے اور تب ہی تو بربادی شروع ہوئی دکھ اور تکلیف ندا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت نکل رہی تھی اس کی دو بیٹیاں اس کے سامنے مرگئی تھیں بیٹیوں کا غم اور شوہر کی لاتعلقی اسے جیتے جی مار رہے تھے اور پھر اس نے میرے سامنے بار بار کشمالہ اور نایاب کا نام لے کر رونا اور معافیاں مانگنی شروع کردیں اور میں ایک مرتبہ پھر اس کے جال میں پھنس گیا۔

سب ٹھیک ہی تھا مگر نایاب پتہ نہیں کہاں سے نکل آئی تو ندا کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھر گئیں نایاب کو راستے سے ہٹانے کے لئے اس نے ایک بار پھر ہاشم کا سہارا لینے کی کوشش کی اور جب ہاشم

سے رابطہ ہوا تو ہاشم نے بھی اس کے سر پر بم پھوڑ دیا کہ ''میں نے نغمانہ سے شادی کرلی ہے۔''

مگر اب نایاب کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہاشم کی مدد تو چاہئے تھی اس لئے اسنے ہاشم سے کہا'' ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں، تم اور نغمانہ پاکستان آجاؤ۔''

ہاشم نے نغمانہ کو تین چار دن پہلے بھیجا اور خود بعد میں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''ہم نے تو سوچا تھا کہ الیاس کی نیند کی دوا کھلا کر نایاب کو ایسے ختم کریں گے کہ خودکشی لگے مگر پتہ نہیں اب یہ کام کب ہوگا؟ اگر نایاب اب نہ آئی تو؟'' ندا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

نغمانہ اور ہاشم جواباً خاموش ہی رہے۔

پھر نغمانہ بولی۔ ''مجھے تو تھکاوٹ کی وجہ سے نیند آرہی ہے سر بھی بوجھل بوجھل سا ہے۔''

ہاشم بولا۔ ''میں تمہیں کمرے میں چھوڑ آؤں؟'' مگر اتنی دیر میں نغمانہ کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں ہاشم اور ندا نے دو تین بار آواز دی، ہلکے سے جھنجھوڑا بھی مگر وہ بے سدھ تھی۔

ندا بولی۔ ''ہاشم تمہاری کوئی چالاکی ہے؟'' تو ہاشم بولا، جب سے پاکستان آیا ہوں تم سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں، یہ نغمانہ تو میرے ساتھ چمٹی رہتی ہے ہر گھڑی اب میں نے دوا والی چائے اسے پلادی ہے یہ کل دوپہر تک سوتی رہے گی۔'' ساتھ ہی ہاشم نے نغمانہ کو دیکھا جو بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس نے ندا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف چل پڑا۔ دراصل نغمانہ سونے کی ایکٹنگ کررہی تھی اس نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر پوری آنکھیں کھول دیں اور اپنے موبائل کو دیکھا جہاں اس نے ویڈیو ریکارڈنگ اسٹارٹ کی ہوئی تھی ویڈیو تو شاید نہ بنی ہو مگر آواز تو ریکارڈ ہوچکی تھی نغمانہ نے ریکارڈنگ ختم نہیں کی بلکہ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی اور پسٹل نکالا اور اسی رفتار سے ندا کے کمرے کی طرف بڑھی مگر کمرے کے پاس جاتے ہی نغمانہ نے رفتار بہت آہستہ کرلی اور آہستگی سے کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا اور تھوڑا سا دروازہ بے آواز کھل گیا اور پھر نغمانہ نے جھٹکے سے پورا دروازہ کھول دیا۔

دروازے کی آواز پر ندا اور ہاشم جو ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھے تھے اچھل پڑے۔ ایکدم ندا ہوش میں آئی اور جلدی سے بولی ''نغمی بیٹا تمہیں غلط فہمی ہے۔''

نغمانہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اب بھی غلط فہمی، میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' پاس ہی پڑے ٹیبل پر اپنا موبائل رکھ کر نغمانہ نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور سنبھال لیا تھا۔ ''نغمی تم مجھے نہیں مار سکتی، ماں ہوں میں تمہاری۔'' ندا کی بات کے جواب میں گولی ندا کے پیٹ میں لگی۔

نغمانہ ماں کی کیفیت دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے بے خبر ہوئی کہ ہاشم آستہ آہستہ سرکتا ہوا نغمانہ کے پاس پہنچا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے چھین لیا، اور بولا ''بے وقوف لڑکی یہ کیا کیا؟'' نغمانہ اس کی طرف جھپٹی تاکہ پسٹل دوبارہ حاصل کرسکے، مگر اس نے نغمانہ کو اپنی گرفت میں اتنی زور سے لیا کہ نغمانہ بے بس ہوگئی، پھر ہاشم نے اس کے ہاتھ میں پسٹل دیا اور زور کے ساتھ اس کے ہاتھ کو اس کے سر کی طرف لے جاکر ٹریگر دبادیا۔ نغمانہ سر میں گولی لگتے ہی وہیں گر کر تڑپنے لگی۔

ہاشم نے پسٹل اس کے پاس ہی پڑا رہنے دیا اور بولا۔ ''میں تو ابھی کچھ دیر اور تم لوگوں سے کھیل کر اپنا انتقام لینا چاہتا تھا جو الیاس کو مجھ پر تم نے فوقیت دے کر جرم کیا تھا اس پر یہ کہ الیاس نے اس دن مجھے بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا، میں اتنا بے غیرت نہیں تھا لیکن بے غیرتی سے پھر بھی تم لوگوں سے ملتا رہا۔ مجھے تو انتقام پورا کرنا تھا، میرے بارے

میں کوئی نہیں جانتا اور جیسے ترانہ بے خبری میں ماری گئی اور مجھے کوئی نہ پکڑ سکا۔ اب تم دونوں کے مرنے پر کوئی میری گرد کو بھی نہیں چھو سکتا کیونکہ میں نے صبح گیارہ بجے کی سیٹ جعلی نام سے بک کروا رکھی ہے اسی نام سے آیا تھا اور اسی پر واپسی۔

ارے ندا بیگم بولنا دشوار ہے؟ یہ دیکھو تمہاری تیسری بیٹی بھی موت کے منہ میں چلی گئی اور ہاں تمہیں بتاؤں مہوش کو بھی میں نے ہی نشہ پر لگایا تھا تمہیں یاد ہوگا، میں اس کے لئے چاکلیٹ لاتا تھا اور وہ بڑے شوق سے کھاتی تھی۔'' ہاشم کمینگی سے ہنس رہا تھا۔ ''لو ندا بی بی تمہاری کہانی بھی ختم ہوگئی۔'' ندا کو آنکھیں بند کرتے موت کی آغوش میں جاتے دیکھتے ہوئے اس نے کہا اور باتھ روم میں جاکر اپنے جسم کو دھو کر خون صاف کیا، اپنے دوسرے کپڑے پہنے اور خون آلود کپڑوں کی گٹھری سی بنا کر شاپر میں ڈال کر اپنے بیگ میں رکھے، کمرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا اور دیوار پھلانگ کر گھر سے نکل گیا۔

صبح کے وقت دودھ دینے والا دودھ دینے آیا تو اس نے دروازہ بہت بجایا، جب دروازہ نہ کھلا تو وہ پریشان ہوگیا اس نے پڑوسی سے کہا ''گھر سے آواز نہیں آرہی۔ شام کو تو باجی نے پانچ کلو دودھ لیا تھا اور صبح کے لئے بولا تھا کہ دس کل دودھ اور لانا، مہمان آرہے ہیں۔'' اور اب دروازہ بند ہے۔''

پڑوسی نے بھی کافی بیل بجائی مگر جواب ندارد۔ اور پھر کافی لوگ جمع ہوگئے کسی نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس کے کچھ اہلکار بھی پہنچ گئے۔ ایک بندے کو گیٹ کے اوپر سے اندر اتارا گیا۔ اس نے اندر جاکر گیٹ کھولا، پولیس کے ساتھ لوگ بھی اندر آئے، اور جیسے ہی ندا کے کمرے کے پاس پہنچے تو اندر سے نکل کر دروازے کے پاس جمع ہوئے خون نے لوگوں کو پریشان کردیا اور جیسے ہی دروازہ کھولا لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پولیس والوں نے لوگوں کو باہر ہی روکا، ساتھ والے گھر کے باقر صاحب سے الیاس کے اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے فون کرکے الیاس کو صورتحال بتائی۔ الیاس سنتے ہی، نایاب اور فواد کے ساتھ کراچی کے لئے روانہ ہوگئے۔ جب وہ کراچی پہنچے تو پولیس لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جاچکی تھی۔ قتل کا کوئی سرا ہاتھ نہ آرہا تھا۔ بظاہر تو لگ رہا تھا کہ بیٹی نے ماں کو مار کر خودکشی کرلی مگر نہ ماں کو مارنے کی سمجھ آرہی تھی اور نہ خود کو۔

اور پھر ایک آفیسر کی نظر موبائل پر پڑی۔ موبائل کو آن کیا گیا اور پھر اسے اچھی طرح چیک کرتے ہوئے تمام حالات سب کے سامنے آگئے اور سب نے شکر کیا کہ الیاس اور نایاب اس دن نہیں آئے تھے مگر مجرم ابھی باقی تھا، موبائل سے پتہ چلا کہ ہاشم نام بدل کر سفر کرے گا اور جس دن کا ہاشم نے بولا تھا اس دن جو جہاز یو، کے جارہا تھا وہ کریش ہوگیا تھا اور اس کا کوئی بھی مسافر زندہ نہ بچ سکا تھا۔ ہاشم نام بدل کر بھی موت کو دھوکہ نہ دے سکا۔ اور موت کے منہ میں چلا گیا۔

گھر والوں پر کچھ عرصہ اداسی کے بادل چھائے رہے پھر رفتہ رفتہ حالات نارمل ہونا شروع ہوگئے۔ درنایاب کی فواد سے شادی ہوگئی۔ آج کل دونوں اپنا ذاتی اسپتال چلا رہے ہیں۔ دونوں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے، جسے دادا، نانا اور زیتون سنبھالتی ہیں، حافظ صاحب کی وفات کے بعد تنہائی سے بچنے کے لئے وہ بھی الیاس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ آیا اماں کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ درنایاب ان کے لئے اکثر اداس رہتی ہے اور ان کے نام کی خیرات کرتی رہتی ہے۔

روکا شا اور بھیم انسانی روپ میں کبھی کبھار ان سے ملنے آتے ہیں، بچے بھی ان سے کافی مانوس ہیں۔ روکا شا اور بھیم کے ابھی اپنے بچے نہیں ہیں مگر پھر بھی دونوں بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

ٹیوو کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

مجھ کو معلوم ہے وہ مجھے یونہی ہر آن سزا دے گا
نام ریت پر لکھے گا میرا، لکھ کر مٹا دے گا
جلتی آگ پہ دعا ڈالے گا وہ تنکے چن کر
مانگا جو "ابر" تو شعلوں کو "ہوا" دے گا
(ساحل دعا بخاری...... بصیر پور)

تمہیں بھی ہم سے محبت ہو ضروری تو نہیں
عشق ہی عشق کی قیمت ہو ضروری تو نہیں
دوستی تم سے لازم ہے مگر اس کیلئے
ساری دنیا سے عداوت ہو ضروری تو نہیں
(بلقیس خان...... پشاور)

مجھے سمجھایا نہ کرو کہ اب تو ہوچکی محبت
محبت مشورہ ہوتی تو تم سے پوچھ کے کرتا
(اذان عزیز...... ٹنڈو آدم)

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
میں نے تو ایک بات کی اور اس نے کمال کردیا
میرے لبوں پر مہر تھی پر میرے سخن رو نے
شہر کے شہر کو میرا واقف حال کردیا
(راحل بخاری...... محبوب شاہ)

خوشبو کی طرح آپ کے پاس بکھر جائیں گے
سکون بن کے دل میں اتر جائیں گے
محسوس کرنیکی کوشش کیجیے
دور ہو کر بھی پاس نظر آئیں گے
(محمد اسحاق انجم...... کنگن پور)

میری ہر سانس میں وابستہ ہے باتیں تیری
زندہ رہنے کے لئے کافی ہیں فقط یادیں تیری
ہم تو تیری جدائی میں کب کے مرچکے
دل دھڑکتا ہی نہیں چلتی ہیں صرف سانسیں میری
(صبا محمد اسلم...... گجرانوالہ)

وہ اک شخص کبھی مجھ پہ اعتبار کرے
میرے قریب رہے مجھ پہ جاں نثار کرے
میں اس کو دیکھوں، سوچوں، سمجھوں، پرکھوں دل سے
وہ میرے دل سے مجھے مانگے اختیار کرے
(عثمان غنی...... پشاور)

میں چمن کو سینے کا لہو دیکر چلی ہوں
کیبھ گلشن کی فضا مجھے یاد کرے گی
(انتخاب: فاریہ تبسم...... ٹھینگ موڑ)

بھلادیا ہے سب اپنوں نے اس طرح سے
جیسے کہ ہم اس جہاں میں رہتے ہی نہیں
(انتخاب: مس فوزیہ کنول...... کنگن پور)

تیری یاد بھی ایک خوب صورت احساس ہے
تجھے سوچوں تو لگتا ہے جیسے تو میرے پاس ہے
ہونٹوں پہ تیرا نام آنکھوں میں تیری دید کی پیاس ہے
انتظار میں تیرے ساتھ میری شام بھی اداس ہے
(احسان سحر...... میانوالی)

مسکراتے ہوئے آنکھوں میں صنم آتے ہیں
آپ کیا جانے کہاں سے میرے غم آتے ہیں
آپ کو ہم سے پیار میں شکایت کیا ہوگی
آپ کو پیار کے انداز ہی کم آتے ہیں
(انتخاب: نعمان شاہ...... الہ آباد)

میں تو ساحل تھا جو چلتا بھی تو کیسے چلتا
وہ بھی موجوں کی طرح آیا اور پل بھر ٹھہرا
چاند پگلا تھا جو چلا آیا میری جانب
میں تو بادل تھا ہمیشہ سے بے گھر ٹھہرا
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈو الہ یار)

خزاں موسم میں پھولوں کی قبائیں کیوں نہیں ملتیں
اگر ہو حبس کا عالم ہوائیں کیوں نہیں ملتیں
حسین اپنی اداؤں سے ہزاروں قتل کرتے ہیں
وہ مجرم ہیں تو پھر ان کو سزائیں کیوں نہیں ملتیں
(زاہد حسن زاہد...... مظفر گڑھ)

کیا خبر تھی ہمیں محبت ہوجائے گی بے وفا
ہمیں تو تیرا مسکرانا اچھا لگا تھا
(عامر ملک...... ٹنڈو آدم)

غزل

اپنے خوابوں کو لئے پھرتی ہیں آنکھیں میری
بن گئیں باعث آزار وفائیں میری!
کون دیتا ہے مجھے غم میں تسلی آکر
کون سنتا ہے بھرے شہر میں آہیں میری
ختم ہونے کو جب آتے ہیں اسیری کے یہ دن
وہ بڑھا دیتا ہے کچھ اور سزائیں میری
روز آتا ہے وہ اب خواب میں ملنے مجھ سے
ہو نہ جائیں کہیں بے نور یہ آنکھیں میری
کوئی آیا نہ مری جان بچانے کے لئے
ہوگئیں شور میں معدوم صدائیں میری
موم ہوجائے گا اک روز وہ پتھر دل کا
رنگ لائیں گی کسی روز دعائیں میری!
جب رہے گا نہ کوئی چاہنے والا اس کا
یاد آئیں گی حکیم اس کو وفائیں میری
(حکیم خان حکیم...... اٹک)

آغوش میں یادوں کے خزانے بھی تھے موجود
تم سے میرے ملنے کے بہانے بھی تھے موجود
گو دل پر تیرے ہجر کی یہ چوٹ نئی تھی
کچھ دل میں میرے زخم پرانے بھی تھے موجود
آسیب زدہ گھر میں وہ تنہا تو نہیں تھا
ناشاد پرندوں کے ٹھکانے بھی تھے موجود
دیکھی نہ کسی نے بھی میرے درد کی جاگیر
مفلس بھی تھا اشکوں کے خزانے بھی تھے موجود
تب ہم کو بڑے کرب سے یاد آئی تھی گھر کی
جنگل جو تھا غاروں کے دہانے بھی تھے موجود
ایک چاند سے لٹکی تھی سیاہ زلف کی ناگن
جوگی بھی تھا سانپوں کے ٹھکانے بھی تھے موجود
جب درد مچل جاتا تو سہلاتی تھی فطرت
غمخوار پرندوں کے ترانے بھی تھے موجود
کچھ آنکھوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح واجد
چبھتی ہوئی نظروں کے نشانے بھی تھے موجود
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... کراچی)

لوگ فکروں سے مغلوب ہونے لگے
چادروں میں سمٹ کر ہی سونے لگے
اصلیت بھی یہ اب اپنی کھونے لگے
آئینہ دیکھ کر لوگ رونے لگے
سب کشادہ دلی پھر دھری رہ گئی
تنگ کمروں میں جب بھی بچھونے لگے
مہماں خانوں میں تہذیب کے شاہکار
آدمی، بچے، بوڑھے کھلونے لگے
رات کی زلف ناگن سی تھی منحنی
زاویے دن کے ترچھے تکونے لگے
پھر تجلی کی کرنے لگے آرزو
پھر سرابوں میں پلکیں بھگونے لگے
سستے داموں نمائش کی حسرت امتیاز
خواب محلوں کے کتنے سلونے لگے
(ایس امتیاز احمد...... کراچی)

آنکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشاں نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہرباں نہیں ہوتے
تیری دید میں کئی زخم پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسماں نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیاں نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

نفرتوں کو تلاشتے میرے قدم راستے سے بھٹک گئے
میں خواب نگر کی مکیں تھی مجھے آگہی کا کرب ملا

دکھ اس بات کا نہیں مجھے کوئی راہبر نہ مل سکا
مجھے نفس پہ اپنے گرفت نہ تھی
قدموں کی دھول کا قصور نہ تھا
جن خوابوں کو آنکھوں میں رنگ دیئے
پلکوں کی ردا سے ڈھانپا تھا
میری شوق آوارگی نے رسوا کیا
تیز ہواؤں کا اس میں دوش نہ تھا
دل بے چین اب رونا کیا، گئے وقتوں کی تھی یہ کہانیاں
میری بات سن! میری بات مان!
وقت کی نبض ابھی تیرے ہاتھ ہے
دل کو حوصلہ دے ہمت کر
کچھ دیر ہوئی نا سمجھی میں
پر امید کی لو ابھی ابھی نہیں
مانا کہ قدم منزل سے بھٹک گئے
پر یہ بھی ہے پھر سنبھل گئے
ابھی سینے میں سانس باقی ہے
ابھی منزل کو آنا باقی ہے.....!

(مریم ماہ منیر.....لاہور)

جمال حبیبؐ بھی ہوتا اور نظر میں کمال حبیبؐ بھی ہوتا
اور کس طرف دیکھتی میں جب سامنے خیال حبیب بھی ہوتا
پھر زمانے کو دیکھتا کون؟ دنیا سے ہو جاتی بے نیاز میں
جو اللہ کو چاہتی میں اور طلب سوال حبیبؐ بھی ہوتا
میری نگاہوں میں اے خدایا! یہ جہاں اب جچتا ہی نہیں ہے
کاش اس زمانے میں یارب! کچھ تو مثال حبیب بھی ہوتا
ہوتی نہ پھر مجھے کوئی فکر بھی سوال منکر، نکیر کی خدایا
جب سامنے لائے وہ تصور محمدؐ تو دل میں خیال حبیب بھی ہوتا

(اقصیٰ رباب.....فیصل آباد)

ہمیں تو زندگی کی سزائیں مار گئیں
جنگلوں کا سفر تھا اور ہوائیں مار گئیں
اک تو اکیلے تھے زندگی کے سفر میں
اک ہمیں اپنوں کی جفائیں مار گئیں
جلتا رہا دل میرا بارش کی آس پر
ساون تو نہ برسا مگر گھٹائیں مار گئیں
بہت کچھ دیا مگر پھر چھین لیا ہم سے
ہمیں تو اس زندگی کی ادائیں مار گئیں
جانے کس طرح جیتے ہیں لوگ دعاؤں کے سہارے کنول
ہمیں تو اپنے ہی دل کی دعائیں مار گئیں

(مس فوزیہ کنول.....منڈی کنگن پور)

میرے ویران کمرے کی
کھلی کھڑکی سے جب ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا
مری آنکھوں سے تیری یاد کے آنسو چراتا ہے
تو میرے سرد کمرے میں سجی ہر چیز کے اندر
تمہارے ہونے کا احساس پھر سے جاگ اٹھتا ہے
یہاں جب شام ڈھلتی ہے
مری ہر نظم کی بانہیں
ترے احساس کو خود میں سمو لینے کی خواہش میں
جو وا ہوتی ہے تو پھر صبح تک گرتی نہیں تھک کر
مری ایک شیلف میں رکھی ہوئی ساری کتابوں پر
تمہاری انگلیوں کا لمس اب بھی دل کو چھوتا ہے
ترے ملبوس سے اٹھتی ہوئی مدہوش کن خوشبو
مرے آنچل پہ اپنے ہونٹ رکھتی ہے
مری ہر سوچ کو ہر خواب کو خود میں جکڑ کر توڑ دیتی ہے

(انتخاب: نائیک محمد رضوی.....کھاریاں کینٹ)

آتے دنوں میں مزید الجھے گی، بکھر جائیگی
زندگی زلف نہیں جو پھر سے سنور جائے گی
عجب ہے دشت دل بھی، کہ تا حد نگاہ.....
ایک اسی کا چہرہ دکھائی دے گا جہاں تک نظر جائیگی
فقط یہ ہے کہ کوئی خوشی بھی پھر خوشی نہ لگے گی
یوں گزرنے کو تو ''تیرے بغیر'' بھی گزر جائے گی
شام ڈھلتی ہے، تو یہ دل دہل اٹھتا ہے
کہ پلٹ کے تیرگی، پھر اپنے گھر آجائے گی.....
ہم نے سوچ کے ویرانی کو بسالیا دل میں
گر ہم نہ رہیں گے، تو پھر یہ کدھر جائے گی؟
تیری کمی تو خیر! حاصل زیست ہے دعا
کسی روز، میرے ساتھ یہ بھی مرجائے گی

(ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

وہ وعدے وہ قسمیں کیسے نبھاؤں گی
تیرے بن تو میں جی بھی نہ پاؤں گی
نہ اب تو میرا ہے اور نہ ہی تو میرا ہوگا
اپنے دل کو یہ بات میں کیسے سمجھاؤں گی
اک نہ اک دن تو میرا ہو ہی جائے گا
یہ کہہ کر میں اپنے دل کو ضرور بہلاؤں گی
لوگوں کو کہوں گی کہ تو میری قسمت میں نہیں
میں اپنے دل کو اور نہیں تڑپاؤں گی
تمہاری بے رخی تو مجھے جینے نہیں دے گی
تیرا دیا ہر زخم میں خوشی سے سہہ جاؤں گی

(صبا محمد اسلم.....گوجرانوالہ)

ہم یوسف زماں تھے ابھی کل کی بات ہے
ہم تم پہ مہربان تھے ابھی کل کی بات ہے
ہم ہی تیری زباں پر تھے
موضوع داستان تھے ابھی کل کی بات ہے
اے کارواں انقلاب و گل تم کو یاد ہو
ہم میر کارواں تھے ابھی کل کی بات ہے
جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات ہے
وہ اپنے درمیاں تھے ابھی کل کی بات ہے
کچھ حادثوں سے گر گئے محسن ورنہ
ہم رشک آسماں تھے ابھی کل کی بات ہے

(انتخاب: بلقیس خان.....پشاور)

آئی ہے ایسے موڑ پر انسان کی زندگی
ابلیس اب تو رقص میں رہتا ہے ہر گھڑی
فصل بہار میں بھی اداسی ہے چار سو
جانے کہاں چلی گئی پھولوں کی تازگی
منزل کا راستہ انہیں معلوم ہی نہیں
اب تو بدل کے رہ گئے انداز راہبری
گزری ہوئی سی بات ہے دل کا سکون بھی
ہر سمت اضطراب ہے ہر سو ہے بے کلی
خوش فہمیوں کی اوڑھ کر چادر تمام لوگ
ظلمت کدوں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں روشنی
اپنے لئے بنائیں جو اونچی عمارتیں
ان کو نظر نہ آئے گی مفلس کی جھونپڑی
مفلس کے گھر کی بیٹیاں بوڑھی ہوئیں قمر
رسم و رواج بن گئے سدّ سکندری

(ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم)

مان لو، رب نے ہمیں اپنے قریب رکھا ہے
آزمائش لازم ہے ہم نے اسے حبیب رکھا ہے
درد میں، تکلیف میں انساں پر کھا جائے
صبر کا دامن کس نے تھام رکھا ہے
ہے وہی مقدر کا سکندر جان لو
جس نے اک محل وہاں بنا رکھا ہے
غموں سے گھرنے والوں نہ گھبراؤ ایسے
جنت کیلئے تمہارا انتخاب کر رکھا ہے
آسائشوں میں مست رہیں دنیا کی یہاں
ان کا حساب کتاب الگ بنا رکھا ہے
یہ سچ ہے کہ رب کے سچے دوستوں کو
دنیا نے پریشانیوں سے گھیر رکھا ہے
کٹھن رستہ ملتا ہے انہی کو تمنا
مان لو رب نے جنہیں اپنے قریب رکھا ہے

(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈو الہ یار)

اپنی بند آنکھوں سے آسمان کا کیا پوچھوں
بے زباں پرندے سے آشیاں کا کیا پوچھوں
راستے ہی دھوکہ تھے اب پتہ چلا مجھ کو
میں غبار منزل سے کارواں کا کیا پوچھوں
ہر طرف بکھرتا ہوں ساحلوں کی دھرتی میں
اپنی بے زبانی سے راز داں کا کیا پوچھوں
کاغذی پرندوں کو اب اڑاؤں گا کیسے
جو بنا تھا پانی پر نشاں کا کیا پوچھوں
صرف اپنے چہرے کو آئینے میں تکتا ہوں
جو ابھی نہیں پھیلتی داستاں کا کیا پوچھوں
دل مرا کیوں ان دیکھے فاصلوں سے ڈرتا ہے
اجنبی سے لوگوں سے آستاں کا کیا پوچھوں
رب کے فضل گل قمر قہقہے اگلتی ہے
لٹ چکا جو پھولوں سے باغباں کا کیا پوچھوں

(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

☆☆

شہر دل بسایا ہے
ایک گھر بنایا ہے
جس کو اپنا سمجھا تھا
لوگو وہ پرایا ہے
دیکھو تیری چاہت میں
بار غم اٹھایا ہے
ہم نے دل کی بستی میں
تیرا پیار سجایا ہے
دیکھا تو اسے رانا
اک نشہ سا چھایا ہے
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

اذیت کی کہانی لکھ رہا ہوں
تیری نامہربانی لکھ رہا ہوں
دیئے ہیں زخم جو تجھے نے مجھے دو
لئے آنکھوں میں پانی لکھ رہا ہوں
تیری تصویر کی ہے تازگی پہ
جو تحریریں سہانی لکھ رہا ہوں
نہیں جائے گی دل سے یاد تیری
تجھے اپنی نشانی لکھ رہا ہوں
مجھے جانے نہیں دیتا وہ دل سے
ہے اس کی مہربانی لکھ رہا ہوں
میری آنکھوں میں ہے اس کا بسیرا
جسے میں دل کی جانی لکھ رہا ہوں
غزل میں واجد حسن کا پیکر نیا ہے
میں اس کا نقش ثانی لکھ رہا ہوں
(پروفیسر واجد نگینوی.....کراچی)

لوگ تو رہے آنے سے
پھر فائدہ کیا چلانے سے
تبھی میں تجھے چاہتا ہوں
تو بہتر ہے زمانے سے
میری جان یہ محبت ہے
یہ مٹی نہیں مٹانے سے
ہر طرف سے لگے پتھر
جب دوستی ہوئی آئینے سے

ہمیں اب کھو کر کہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
کسی کا ہو کر کہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
سمندر تھا تو زور شور سے
لہریں بہاتا تھا
اب قطرہ ہو کر کہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو

راز پھر راز نہیں رہتا
کسی کو راز بتانے سے
مہنگے لے سارے پھول
تیری زلفوں میں لگانے سے
پھول ہی دینا بہتر ہے
تارے توڑ کر لانے سے
"تجھے روٹھنے سے رغبت ہے
مجھ کو منانے سے
اس لئے اب ہاتھ ملاتے نہیں
لوگ رہے ہاتھ ملانے سے
(عثمان غنی.....پشاور)

کبھی کبھی یوں بھی
تم پر پیار آتا ہے
کہ میرا جی چاہتا ہے
تمہیں اپنے سامنے بٹھا کر
چاہت کے رنگین لفظوں سے
یوں تمہارے حسن پہ
کوئی خوبصورت غزل لکھوں
جیسے کوئی مصور
محبت کے رنگوں سے
اپنے محبوب کی
تصویر بنا رہا ہو
جان غزل
کبھی کبھی یوں بھی
تم پہ پیار آتا ہے
(احسان سحر.....میانوالی)

نہ لائف کی سوچ، نہ فیوچر کے سپنے لیکن
اب کل کی ہے فکر اور ادھورے ہیں سپنے
مڑ کے دیکھوں تو دور ہیں اپنے
منزلوں کو ڈھونڈتے ہوئے کہاں کھو گئے ہم
کیوں اتنی جلدی بڑے ہو گئے ہم
(نورین اعظم.....راولپنڈی)

☆☆

بیان کرتے تھے حال اے دل
تو وہ بس مسکراتا تھا
اب وہی مرد کہ کہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
نہ پوچھو اس کی بدنصیبی کا عالم تو
کہ سب کچھ کھو کر کہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو
(اذان عزیز.....ٹنڈو آدم)

بجلیاں گرا دینا
گھونسلے جلا دینا
درد کے پرندوں کو
ایسی مت سزا دینا
تتلیوں کے جھرمٹ پہ
پھول! کھلکھلا دینا!
کھول کر دریچوں کو
ہر گلی صدا دینا
لوٹ کر نہ آئے تو
دیپ سب بجھا دینا
آ بھی جائے بھولے سے
نفرتیں مٹا دینا!
(راشد خان ترین.....مظفر گڑھ)

بچپن کی یادیں، امی کی گود اور
ابو کے کندھے
نہ کل کی فکر

دیوی

بلقیس خان-پشاور

اشلوک کے ساتھ ساتھ جب رقص نقطہ جنون کو پہنچا تو اچانک پتھر کے بت میں حرکت پیدا ہوئی، اس کی آنکھیں وا ہوئیں اور ہونٹ پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بت نے ایک حسینہ کا روپ دھار لیا۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

"**صبا**، ارے او صبا سن تو....."

صبا بارش سے لطف اٹھانے چھت پر آئی ہی تھی کہ اس کی امی کی آواز کانوں میں پڑی۔ صبا نے گیلے کپڑوں کو جھٹک دیا، اور دوپٹہ سر پر سنبھالتی ہوئی نیچے کی طرف بھاگی۔

"جی امی آپ نے مجھے آواز دی؟"

"ہاں بیٹا! یہ پکوڑے اور چٹنی یاسر کو دے کر آجاؤ۔ بے چارہ اکیلا ہے، ناں ماں ہے نہ باپ ایسے وقت میں ہمیشہ اپنوں کی یاد ستاتی ہے کیا ہوا جو ہمارا اس سے خونی رشتہ نہیں بلکہ انسانیت کا رشتہ تو ہے ناں۔"

امی پکوڑے تلتے ہوئے بولیں۔

صبا کی امی نے پکوڑوں سے بھری پلیٹ اور چٹنی کا چھوٹا پیالہ صبا کی طرف بڑھایا۔

"ہونہہ! کونسا بے چارہ؟ کہاں کا بے چارہ، اگر اس کی حرکتوں کا آپ کو اندازہ ہو جائے تو اگلے ہی دن کان سے پکڑ کر اسے کوارٹر سے باہر نکال دیں۔" صبا نے دل ہی دل میں کہا۔ اور بے دلی سے پکوڑوں کی پلیٹ اور چٹنی ٹرے میں رکھ کر یاسر کے کوارٹر کی طرف چلی گئی۔

صبا آسیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی تھی، صبا کے ابو نثار خان کا دو سال قبل ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا تھا گھر میں ماں بیٹی اکیلی رہتی تھیں، رشتہ دار بھی کتراتے تھے، کہ ماں بیٹی ان کے در پر سوالی بن کر کچھ مانگ نہ لیں حالانکہ نثار خان اپنی زندگی میں ان کے لئے اتنا کچھ چھوڑ کر گئے تھے کہ اگر دونوں ماں بیٹی شاہ خرچی سے بھی گزارہ کرتیں تب بھی ختم نہ ہوتا گھر بھی خاصا بڑا تھا گھر کے قریب ایک تین مرلہ کوارٹر بھی تھا جسے آسیہ بیگم نے کرائے پر دے رکھا تھا، یاسر، ڈیڑھ ماہ قبل کوارٹر میں شفٹ ہوا تھا آسیہ بیگم کو جتنا یاسر پسند آیا تھا صبا کو اس سے اتنا ہی خدا واسطے کا بیر تھا۔ صبا کی یاسر کے بارے میں کچھ یوں رائے تھی۔

لڑکیوں کو اتنا گھور گھور کر دیکھتا ہے جیسے زندگی میں فرسٹ ٹائم کسی لڑکی کو دیکھ رہا ہو بولتا اتنا ہے کہ بی بی سی کو بھی مات دے دے، اتراتا تو اتنا ہے کہ جیسے شہزادہ سیف الملوک ہو۔ شکل تو ایسی ہے جیسی مردہ سڑی مچھلی ہو۔ صبا کا جب بھی یاسر سے سامنا ہوتا۔ وہ ایسی شکل بناتی۔ جیسے کریلا نگل لیا ہو۔

احتشام صبا کا منجھلے چچا کا بیٹا تھا۔ جو کبھی کبھی آسیہ بیگم اور صبا سے ملنے ان کے گھر آتا۔ وہ بھی اپنے والدین سے چھپ چھپا کر، کیونکہ ان کے والدین نہیں چاہتے تھے کہ احتشام ان کی اجازت کے بغیر ماں، بیٹی سے ملے۔

احتشام کے ماں، باپ صبا کے بے مثال حسن سے خائف تھے کہ کہیں وہ ان سے ان کا اکلوتا اور خوبصورت سپوت نہ چھین لے جبکہ صبا احتشام کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی تھی اور احتشام صبا کے دلی کیفیت سے بے خبر نہیں تھا لیکن بظاہر انجان بننے کی کوشش کرتا تھا۔

صبا بارش میں بھیگتی ہوئی یاسر کے کوارٹر کے سامنے پہنچ گئی، صبا نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے بے آواز گھمایا اور بنا آواز پیدا کئے دروازہ کھول دیا۔ ملگجے اندھیرے میں کمرے کے وسط میں کوئی شخص چارپائی پر بیٹھا کان سے موبائل لگائے کھڑکی پر نظریں جمائے انتہائی کریہہ آواز میں کسی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

آوازیں سن کر صبا فوراً یاسر کو پہچان گئی۔

"تم چاہے کچھ بھی کرلو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، جس طرح میں نے افشین اور اسد کو قتل کیا اس طرح سے تمہیں بھی قتل کردوں گا....."

اتنا کہہ کر اچانک یاسر نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا وہ کچھ اور بھی بولنے والا تھا کہ باقی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے.....

صبا حیرت سے منہ کھولے یاسر کی طرف دیکھ رہی تھی..... یاسر حیرت سے اٹھا اور ہاتھ میں پکڑے موبائل کو اچھال کر چارپائی پر پھینک دیا۔

صبا کے ہاتھوں سے ٹرے چھوٹ کر کمرے کے فرش پر گر گئی تو پکوڑے فرش پر پھیل گئے۔

اپنے راز کے افشاں ہونے پر وہ خونخوار تیور سے قدم اٹھاتا ہوا صبا کی طرف بڑھنے لگا، صبا فوراً کھلے دروازے سے باہر نکل گئی تو اس نے جست لگا کر صبا کو پکڑنا چاہا جس کے نتیجے میں صبا تو اس کے ہاتھ نہیں لگی مگر صبا کے کندھے پر بھیگا دوپٹہ اس کے ہاتھ آ گیا، طیش میں آ کر اس نے دوپٹہ وہیں پھینکا اور صبا کے پیچھے تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ وہ کسی بھی صورت اپنا راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صبا حواس باختہ ہو گئی تھی وہ گھر کے بجائے مخالف سمت میں بھاگنے لگی صبا کے حواس بہت متاثر ہو چکے تھے وہ قبرستان کی سمت میں دوڑ رہی تھی یاسر بھی اس کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا۔

یاسر اسے ہر صورت میں پکڑنا چاہتا تھا صبا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کے حواس باختہ ہو گئے یاسر اسکے بہت قریب ہوتا آ رہا تھا صبا بھی تیزی سے آگے بڑھ گئی اس وقت مغرب کی اذانوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

☆.....☆.....☆

"السلام علیکم چچی جان!" احتشام نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سر جھکا کر چچی کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" آسیہ بیگم نے احتشام کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور اسے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔

"چچی! صبا کہاں ہے؟" احتشام نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر کہا۔

"بیٹا میں نے اسے یاسر کے پاس پکوڑے دے کر بھیجا تھا کافی دیر ہو گئی ہے اسے گئے ہوئے حالانکہ ابھی تک تو اسے واپس آ جانا چاہئے تھا۔" چچی پریشان ہو کر بولیں۔

دونوں میں چند ساعت کیلئے خاموشی چھا گئی۔

پھر چچی نے کہا۔

"بیٹا تم بیٹھو میں صبا کو بلا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں چچی، آپ بیٹھیں میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

احتشام دل ہی دل میں تاؤں کھاتا ہوا یاسر کے کوارٹر کی طرف جانے لگا۔

"کیا ضرورت تھی چچی کو صبا کے ہاتھوں یاسر کو پکوڑے بھجوانے کی، اگر بھجوانا بہت ضروری تھا تو خود لے جاتیں یا کسی محلے کے بچے کے ہاتھوں بھجوا دیتیں۔"

احتشام گہری سوچوں میں گم کوارٹر میں داخل ہو گیا۔

پورا کوارٹر خالی تھا اور سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"ارے صبا کہاں چلی گئی....." وہ بڑبڑایا۔

ابھی وہ مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر گلابی رنگ کے دوپٹے پر پڑی احتشام دوپٹہ اٹھانے کے لئے جھکا زمین پر بکھرے پکوڑے اور اوندھے منہ پڑی ٹرے کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ احتشام کو پھر غلط ہونے کا گہرا احساس ہوا وہ سر پر پاؤں رکھ کر باہر کی جانب بھاگا، موسلا دھار بارش نے ہر شے کو بھگو دیا تھا باہر گلی سنسان تھی۔ احتشام نے سنسان گلی میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بہت دور سے ایک نسوانی چیخ ابھری تو احتشام نے چیخ کے تعاقب میں قبرستان کی جانب دوڑنا شروع کر دیا قبرستان کا مین گیٹ عبور کرنے کے بعد اس نے دائیں بائیں قبرستان میں دیکھا اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

شام کے دھندلکے اندھیرے میں اس نے قبرستان کے آخری سرے پر دو سایوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے دیکھا۔

احتشام بیک وقت کئی قبروں کو پھلانگتا ہوا سایوں کی تعاقب میں دوڑا، بالآخر اس نے دو سایوں میں سے پیچھے بھاگنے والے سائے کو پکڑ لیا۔

"رکو؟" احتشام کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی احتشام کی آواز سن کر صبا جو بدحواسی سے آگے ہی آگے بھاگے جا رہی تھی یکدم رک گئی اور پلٹ کر احتشام کی طرف دوڑی۔

یاسر کا گریبان احتشام کے ہاتھ میں تھا۔

"احتشام یہ مجھے مارنا چاہتا تھا..... مجھے بچالو! یہ مجھے جان سے مار دے گا۔" صبا، احتشام کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور خوف سے لرزتی آواز میں بولی۔ یاسر نے احتشام کے مضبوط ہاتھ سے خود کو چھڑانے کیلئے زور لگانا شروع کر دیا اور پھر دونوں میں زور آزمائی اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ صبا خوف سے آنکھیں پھاڑے زمین پر کیچڑ میں لت پت احتشام اور یاسر کو لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی دونوں ایک دوسروں کو مکے اور لاتیں مار رہے تھے کبھی یاسر زور آور بن جاتا تو کبھی احتشام کاری وار کر کے یاسر کو چاروں شانے چت کر دیتا۔

احتشام نے بالآخر یاسر کو نیچے گرایا اور خود اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، یاسر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا احتشام پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تیز دھار خنجر نکالا اور پوری قوت سے ہاتھ بلند کر کے یاسر کے سینے کے مقام پر گھونپ دیا۔

صبا نے ایک بلند چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا لیا اگلے لمحے جب اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

"ارے یہ کیا.....؟"

یاسر کے سینے کے بجائے خنجر زمین میں پیوست ہو چکا تھا جبکہ یاسر کا کہیں بھی نام و نشان نہ تھا۔ صبا کی جو حالت ہوئی تو اس کے ساتھ ہی احتشام کو بھی ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔

"وہ..... وہ..... یا..... یاسر..... کہاں چلا گیا؟ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا میرا خیال ہے کہ یاسر انسان کے روپ میں کوئی اور شے ہے۔"

احتشام کی بات سن کر صبا کانپ اٹھی۔

"تم ڈرو نہیں ..... میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی خبیث شے تھی۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ یاسر جب چاہے خود کو ظاہر کرسکتا ہے اور جب چاہے غائب ہوسکتا ہے۔" صبا حیرت سے بولی۔

"یہی سمجھ لو یا تو یاسر کوئی شیطان ہے۔ یا پھر کوئی جادوگر ورنہ عام انسان تو، خود کو اس طرح سے غائب نہیں کرسکتا۔" احتشام کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔ اس نے خنجر زمین سے نکالا اور اٹھ کر کہا۔

"چلو گھر چلو چچی جان پریشان ہورہی ہوں گی۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

صبا نے ہاں میں سر ہلایا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

وہ دونوں قبروں سے بچتے بچاتے قبرستان کے درمیان میں پہنچے ہی تھے کہ زوردار دھماکے سے بجلی چمکی بادل گرجے اور چاروں طرف سے طوفانی ہوا کے شدید جھکڑ چلنے لگے۔ صبا کے گیلے بال اڑنے لگے اور اس نے مضبوطی سے احتشام کا ہاتھ تھام لیا ہوا کے زور پر دونوں کیلئے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہوگیا تھا، ہوا کا زور شدید سے شدید تر ہوگیا تھا۔

پھر تیز طوفان نے ان دونوں کے پاؤں زمین سے اکھاڑ دیئے۔ صبا اور احتشام کو قبریں گول گول دکھائی دینے لگیں اور پھر دونوں ہی چکرا کر گر گئے۔ ان کے ذہن تیزی سے تاریکی میں ڈوبنے لگے۔

بہت دیر ہوگئی صبا کے پیچھے احتشام گیا تھا اور پھر آسیہ بیگم پریشانی سے کوارٹر کی طرف جانے لگیں۔ شام کا گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کوارٹر کے دروازے پر پہنچیں۔

کوارٹر کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے، آسیہ بیگم کھلے دروازے سے کوارٹر کے اندر داخل ہوگئیں، کوارٹر بھائیں بھائیں کرتا ہوا نظر آیا ان کے دل کی دھڑکنیں انجانے خوف سے تیز ہوگئی تھیں، آسیہ بیگم نے کوارٹر کے کمرے کا رخ کیا کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

آسیہ بیگم کی نظر جب صبا کے دوپٹے اور کمرے میں بکھرے پکوڑوں پر پڑی تو انہیں بہت کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا، وہ دوڑتی ہوئی مڑیں اور گھر کی طرف بھاگیں۔ گھر کے دروازے سے وہ اندر داخل ہوگئیں ان کا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا، انہوں نے ایک بلند چیخ ماری اور گھر کے آنگن میں ڈھے گئیں۔ آسیہ بیگم کی آنکھیں آسمان کی طرف تھیں۔ جیسے وہ آخری امید خدا سے لگا رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں۔

"اے پورے زمین و آسمان کے مالک اب تو ہی میری آخری امید ہے میری صبا کو حفظ و امان میں رکھنا، میری صبا کی حفاظت کرنا۔"

آسیہ بیگم کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ان کی دل کی دھڑکن تھمنے لگی کچھ ہی دیر میں ان کی بے جان لاش گھر کے آنگن میں پڑی تھی۔ شدت غم سے ان کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔

ادھر احتشام کی آنکھ شدت پیاس سے کھل گئی خود کو ایک انجان جگہ پر دیکھ کر اس کے ذہن میں تمام واقعات تازہ ہونے لگے اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں سمتوں میں دیکھا۔ صبا کو بے ہوش پڑے دیکھ کر، اس نے ایک گہرا سانس لیا وہ دونوں ایک کمرے میں بند تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ان دونوں کو رکھا گیا تھا کمرے کی حالت نہایت ہی خستہ تھی اس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا کمرے میں دو تخت تھے، ایک پر صبا اور دوسرے پر احتشام تھا۔ چھت کا رنگ زرد اور آنکھوں کو چبھنے والا تھا کمرے کا فرش سرخ رنگ کا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ تازہ خون پورے فرش پر ڈال دیا گیا ہو جبکہ دیواروں کا رنگ کالا تھا۔

ایک خیال کے تحت احتشام نے شہادت کی انگلی سے زمین کو چھوا اس کی انگلی پر سرخ سیال لگ گیا یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کمرے کے فرش پر واقعی خون موجود تھا اور وہ بھی گاڑھا انسانی خون!

کمرے کے دائیں جانب مٹی کا ایک گھڑا موجود

تھا۔ اور اس پر مٹی کا ہی ایک پیالہ تھا احتشام تخت سے نیچے اترا اور تازہ خون پر چلتا ہوا گھڑے کی جانب بڑھا اس نے ایک ہاتھ میں پیالہ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے گھڑے کو تھام کر اس کا رخ پیالے کی طرف جھکا دیا۔

شڑاپ کی آواز سے پیالہ پانی سے بھر گیا اور کچھ پانی نیچے زمین پر گر گیا احتشام نے پانی پیا اور پیالہ دوبارہ بھر کر صبا کے پاس آ گیا اس نے صبا کے چہرے پر پانی کی چھینٹے مارے۔

صبا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی؟ صبا کچھ دیر دونوں آنکھوں کو ملتی رہی پھر دوسرے لمحے حیرت سے بولی۔ "احتشام یہ کون سی جگہ ہے، ہم کہاں ہیں؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہورہا ہے اسکا ذمہ دار صرف اور صرف یاسر ہے۔"

صبا نے ہوں میں گردن ہلائی۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگی.....۔

احتشام کیا یہ دروازہ نہیں کھل سکتا؟" صبا نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو، میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

صبا چیخی۔" احتشام اس کمرے میں تو خون بھی پھیلا ہوا ہے پہلے تو میں سمجھی کہ یہ سرخ رنگ کا فرش ہے مگر وہ دیکھو خون میں کسی کے قدم بنے ہوئے ہیں۔"

احتشام صبا کی بات پر مسکرایا۔ صبا یہ میرے قدم ہیں"

احتشام نے مٹی کا پیالہ صبا کو دیا اور اپنا مضبوط چوڑا کندھا زور سے پوری شدت سے دروازے پر دے مارا۔

ایک دھماکے سے دروازہ اکھڑ گیا احتشام نے صبا کی طرف دیکھا۔ "چلو صبا بھاگ چلیں یہاں سے!"

صبا اٹھنے ہی والی تھی کہ اس کے کانوں میں کسی کے قہقہے سنائی دینے لگے ہاہاہا..... ہاہاہا....." اکھڑے ہوئے دروازے سے تین کالے حبشی دیو قامت انسان داخل ہوئے وہ بہت زیادہ کالے، اور ڈراؤنے چہرے کے مالک تھے۔ ان تینوں میں سے ایک قہقہے لگائے جارہا تھا وہی شخص ان دونوں کا سردار معلوم ہورہا تھا۔

اوئے بالکی تو تب تک یہاں سے نہیں بھاگ سکتی جب تک تو ہمارا کام نہ کردے۔ قہقہے والا، آدمی پاٹ دار آواز میں بولا۔

"کونسا کام؟" احتشام اور صبا بیک وقت حیرت سے بولے۔

"صبر کر صبر کر، ہم نے تجھ کو پکڑنے کے لئے پورے آٹھ سال کا نا قابل فراموش انتظار کیا ہے۔"

ہم نے اپنے علم کے زور پر معلوم کیا تھا۔ کہ آٹھ سال بعد ایک میلچھ لڑکی، ہماری دیوی کو اپنے جنونی رقص کی وجہ سے جگائے گی۔

ہماری دیوی کو آٹھ سال قبل، اسد اور افشین کے ساتھ ایک اور بزرگ نور علی نے مل کر نوری علم کے زور پر سلا دیا تھا۔ اور تب سے ہم اپنی دیوی کو جگانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے اسد، اور افشین کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا اب نور علی کی باری ہے، نور علی کے پیچھے ہم نے اپنے چیلے یاسر کو بھیجا تھا وہ فون پر نور علی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ مگر تو نے اس کی باتیں سن لیں۔

وہ ویسے بھی تجھے خود رات کے اندھیرے میں یہاں پر لانے والا تھا۔ تیرے ساتھ مفت میں اس کی جان بھی جائے گی، مفت میں اس میلچھ نے ہم سے پنگا لیا ہے اب اس کی خیر نہیں۔"

کالے حبشی نے قہقہے لگائے۔

"احتشام یہ پاگل ہوگئے ہیں کیا؟" صبا بھولے پن سے بولی۔

"ہاں پاگل ہوگئے ہیں۔" احتشام غصے سے بولا۔

"یہ لوگ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں جنونی رقص! دیوی نور علی مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا۔"

اسی وقت تالی کی ایک گونج دار آواز سنائی دی۔ تالی کی آواز باہر سے آئی تھی۔ اجازت ہے آجا۔ حبشی تالی کی آواز سن کر بولا۔

اکھڑے دروازے سے ایک حبشی لڑکی اندر داخل ہوئی اس کے جسم پر نامناسب لباس تھا اس نے اپنے لمبے

بال ڈھیروں چھوٹی چھوٹی چوٹیوں کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔

"کیا خبر لائی ہو کلاوتی!" حبشی پنڈت غرایا۔

کلاوتی، غور سے حبشی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر تعجب سے بولی۔

"کالک آیا ہوا ہے مہاراج۔ وہ ملنا چاہتا ہے۔"

اسے اندر آنے کی اجازت ہے۔" پنڈت خوشی سے بولا۔"

کالک (یاسر) کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک آدمی کا سر جھول رہا تھا۔

یاسر پر جب صبا اور احتشام کی نظر پڑی تو احتشام کے ہاتھوں کی رگیں تن گئیں جبکہ صبا منہ پھیر گئی۔

دراصل کالک ہی یاسر تھا۔ اس نے اس بار صرف لنگوٹ پہن رکھی تھی اس کا کالا جسم نمایاں طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

"کالک یہ کس کا سر ہے؟" مہاراج نے پوچھا۔

کالک نے مہاراج کی طرف دیکھا اور سر کو اوپر فضا میں اچھال دیا، سر سے خون بری طرح بہہ چکا تھا اور اس کی داڑھی خون سے سرخ ہو چکی تھی سر، اچھلتا ہوا پنڈت کے قدموں میں گرا۔

"یہ اسی ملیچھ بڈھے کا سر ہے جس نے ہماری دیوی کو اپنے علم کے ذریعے سلا دیا ہے۔" کالک حقارت سے بولا۔

پنڈت کی آنکھیں خوشی سے روشن ہو گئیں۔ اس نے پوری شدت سے اپنے پیروں میں پڑے ہوئے سر کو ٹھوکر ماری۔ نور علی کا سر اڑتا ہوا کمرے کے کھلے دروازے سے باہر چلا گیا۔

"ہمارے اس دشمن کا خاتمہ بھی ہو گیا۔" پنڈت خوش ہو کر بولا۔ "اب ہمیں دیوی کو جگانے کی تیاری کرنی چاہئے ان دونوں کو پکڑو۔ اور ہال میں لے چلو۔" پنڈت اپنے مکروہ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

دونوں حبشیوں نے صبا اور احتشام کو پکڑ لیا اور ان کو باہر لے جانے لگے صبا چیخنے لگی۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

کسی نے بھی صبا کی چیخوں پر توجہ نہیں دی۔ اور اس کی بے بسی پر بے رحمی سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

صبا اور احتشام کو لے کر وہ دونوں ایک بڑے سے ہال میں گئے وہاں پر گہرا اندھیرا مسلط تھا۔

مہاراج نے کوئی منتر پڑھا اور ارد گرد پھونک ماری تو پورے ہال میں جگہ جگہ دیئے روشن ہو گئے۔

ایک حبشی نے احتشام کو پکڑا اور اسے ایک اونچے مضبوط سلاخ سے الٹا لٹکا کر باندھ دیا۔

جب حبشی احتشام کو، سلاخ سے الٹا باندھ رہا تھا اسی لمحے صبا کو لگا اگر اس نے ان حبشیوں کی باتیں نہ مانیں تو وہ احتشام کو کھو دے گی، وہ اندر سے لرزنے لگی۔

ایک حبشی آگے بڑھتا ہوا آیا اور پتھر کی مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا اس کے دیکھتے ہی سب حبشی جو اس ہال میں موجود تھے قطار در قطار کی صورت میں پتھر کی مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

صبا اسی لمحے بے بسی سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس چلی گئی وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور احتشام کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

احتشام کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں اس کے ماتھے پر لکیریں تن گئی تھیں، صبا کو سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

چند ہی لمحوں میں حبشی سجدے سے اٹھ گئے، اور صبا کی طرف متوجہ ہوئے ایک حبشی آگے بڑھا اور اس نے صبا کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اور اسے کھینچتا ہوا مورتی کی جانب لے گیا۔

تمام حبشی قطار کی صورت میں کھڑے تھے، مہاراج کلاوتی اور کالک قطار سے آگے کھڑے تھے۔

مہاراج کی گونج دار آواز سنائی دی۔ "آج ہماری دیوی نیند سے جاگ جائے گی۔ آج کی رات کالی طاقتوں کی رات ہے اور یہی وہ رات ہے جس کا انتظار ہم کو آٹھ سال سے تھا۔ ہمارا آخری دشمن، نور علی بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ جلدی سے اس لڑکی کے خون سے خونی دائرہ کھینچو

اور اس کے پاؤں میں گھنگھرو باندھو، اسے دیوی کے سامنے ناچنا ہے۔"

ایک دم ہال میں سناٹے کی طرح خاموشی چھا گئی۔

کلاوتی، کالک کے ساتھ آگے بڑھی اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا۔ کلاتی نے آگے بڑھ کر، صبا کی کلائی پر کٹ کا نشان خنجر سے لگایا، کٹ لگتے ہی صبا کی کلائی سے خون نکلنا شروع ہو گیا۔

کلاوتی نے صبا کا ہاتھ پکڑا اور اسے آہستہ آہستہ دائرے کی صورت میں گھمانے لگی، صبا حیرت سے اپنی سفید کلائی کو دیکھ رہی تھی جو اب خون سے سرخ ہو چکی تھی۔

آہستہ آہستہ دائرہ بننے لگا۔ یہ دائرہ انتہائی کم خون سے اور مہارت سے بنایا گیا۔

کلاوتی نے آگے بڑھ کر کوئی منتر پڑھا اور صبا کی کلائی پر ہاتھ پھیرنے لگی تو صبا کا ہاتھ لمحوں میں ہی پہلی حالت میں آ گیا۔ کلاوتی نے صبا کو دائرے میں دھکیل دیا اور خود دائرے سے باہر رہ گئی۔

کالک (یاسر) آگے بڑھا اور اس نے صبا کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیئے اور اسے ناچنے کو کہا۔

اسی لمحے مہاراج کی بدخصلت آواز سنائی دی۔" اے لڑکی، اگر تو دائرے سے نکلے گی تو ہم اس لڑکے کو مار دینگے اور اس کے خون سے دیوی کو غسل دیں گے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لے جب تو ناچنا شروع کرے گی تو دائرے سے ہرصورت میں باہر نہیں آئے گی اگر تو دائرے سے باہر قدم رکھے گی تو سمجھ تو بھی ختم اور یہ چھوکرا بھی ختم۔

تو تب تک ناچے گی جب تک دیوی نیند سے جاگ نہ جائے۔" صباء نے گھنگھروؤں کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی وہ خونی دائرے میں بند ہو گئی تھی۔

صبا ایک دم آگے بڑھی اور بالکل دائرے کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اس نے خاموش احتشام کی طرف دیکھا پھر اس نے دیوی کی مورتی پر نظر ڈالی اس کے بعد اس نے مہاراج کی طرف دیکھا مہاراج مسکرایا اور بولا۔

"ناچنا شروع کر اور جنون کی آخری حد تک ناچ! لیکن یاد رکھ خونی دائرے سے ناچنے کے دوران باہر قدم نہ رکھنا!"

صبا چیخی۔ "میں تب تک نہیں ناچوں گی جب تک تم لوگ احتشام کو اس سلاخ سے آزاد نہیں کر دیتے۔" مہاراج چیخ کر گرجا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"میں بھی نہیں ناچ سکتی تب تک جب تک تم لوگ احتشام کو سلاخ سے آزاد نہیں کر دیتے۔" صبا نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

مہاراج غصے سے صبا کو دیکھنے لگا کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی، کلاوتی نے مہاراج کی طرف دیکھا اور پھر زور سے بولی۔

"مہاراج سمے بیت رہا ہے اس ناری کی بات مان لینی چاہئے۔"

"ٹھیک ہے کلاوتی، تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کالک جا اور چھوکرے کو سلاخ سے آزاد کر دے۔"

کالک آگے بڑھا اس کے چہرے پر غصے کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں اس نے احتشام کو سلاخ سے آزاد کیا اور اسے دھیرے دھیرے زمین پر لے آیا۔

احتشام کے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے اس کے پاؤں درد سے دوہرے ہو گئے تھے اس کے پاؤں بے جان ہو گئے تھے لیکن پھر بھی وہ ڈرا نہیں تھا اتنی شدید اذیت سہنے کے بعد بھی اس کے دل میں ایک طوفان برپا تھا وہ یہاں ایک قبرستان بنانا چاہتا تھا، خون کی ندیاں بہانا چاہتا تھا، ان فرعونوں کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔

کلاوتی آگے بڑھی۔ اس نے پسندیدہ شکار کے نظروں سے احتشام کو گھورا اس کے چہرے پر تھپکی دی پھر اسے کھڑا کیا اور کالک سے اونچی آواز میں بولی۔

"کالک، تم اس لڑکے، کو ستون سے باندھ دو۔"

کالک نے کلاوتی کی بات پر گردن ہلائی۔ اس نے احتشام کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے دو ستونوں کے درمیان کھڑا کیا، وہ دونوں تین گز کے فاصلے پر نصب تھے کالک نے اس کا ہاتھ ایک ستون سے رسی کی مدد سے

باندھا جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ وا کر کے دوسرے ستون سے مضبوطی سے باندھ دیا۔

احتشام غضب ناک نظروں سے سب کو گھور رہا تھا۔

صبا احتشام کو دیکھ کر مطمئن ہوگئی اور دائرے کے درمیان میں کھڑی ہوگئی۔

تمام حبشیوں کی نظریں صبا پر ٹکی ہوئی تھی۔

جبکہ دیوی کا مورتی نما بت صبا کے دائرے کے سامنے ایستادہ تھا۔

مہاراج اٹھا اور ایک چبوترے پر چڑھ گیا اس نے ایک چیز اٹھا رکھی تھی جو بالکل ڈھول سے مشابہ تھی مہاراج نے وہ بجانی شروع کردی۔

ڈھول کے بجتے ہی صبا نے دائرے میں تیزی سے رقص کرنا شروع کردیا، رقص کے شروع ہوتے ہی تمام حبشی ادب سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے احتشام نے اپنی آنکھیں غصے سے بند کرلیں ڈھول کی تھاپ تیز سے تیز تر ہونے لگی۔

صبا کے رقص کا جنون اتنا زیادہ تھا کہ اس کے متحرک قدم میں ابرو کی لچک میں، آنکھوں کی گردش میں، لہراتے بازوؤں میں پلکوں کے تھرتھراہٹ میں سانسوں کی موجوں میں، دھڑکن کی تال میں، وحشت بھرا رقص تھا اس کے انگ انگ میں اضطراب کسی دہکتے ہوئے آتشیں سیال کی طرح سرخ رہا تھا۔

صبا کا تھرکتا ہوا بدن جھلنے لگا گھنگروں کا شور نیم تاریک فضا میں سانپوں کی طرح پھنکارنے لگا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے رقصاں پیروں کی جنبش تیز تر ہوتی جارہی تھی ننگے پیروں کے سنگین فرش سے ٹکرانے پر تلوؤں سے پنڈلیوں کی جانب اٹھتی درد کی ٹیسیں بھی اس کے رقص کو کم نہیں کر پارہی تھیں اس کے رقص میں کسی اونچائی سے گرتی ہوئی آبشار کی سی منہ زوری تھی وہ دیوانہ وار رقص کرتی رہی..... اس کے تلوؤں میں برچھیاں سی کھب رہی تھیں، ٹوٹ، ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے گھنگرو اس کے پیروں تلے آتے تو جلد ادھڑ جاتی۔

صبا کے پیروں سے خون رسنے لگا فرش پر خون کے دھبے پھیلنے لگے وہ دیوانگی کے عالم میں ناچتی رہی پیروں سے بہتا ہا خون جسم کی چیختی ہوئی ہڈیاں اور ٹوٹتی رگیں اسے رک جانے پر مجبور کررہی تھیں مگر وہ ناچتی رہی، یہ اس کے رقص کا نقطہ عروج تھا ایک مقام پر وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کس لئے ناچ رہی ہے اس کے مجنونانہ رقص کا محرک کیا ہے لیکن وہ رک نہیں سکی۔

اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا پھر ایک ہولناک گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی گہرا طلسم ٹوٹ گیا ہو۔

صبا کے ناچتے پاؤں تھم گئے، دیوی کے بدخصلت بت میں حرکت پیدا ہوئی، پتھریلی دیواروں میں جیسے دراڑیں پڑ رہی تھیں، چھت جھکی چلی آرہی تھی۔

صبا چکرا کر دائرے میں ہی گرگئی، اس کے پاؤں سے رسنے والے خون نے پورے دائرے کو کناروں تک سرخ کردیا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ روشنی چمکی اور دیوی کے بت پر پڑی۔

دیوی کی بند آنکھوں کے سنگی پپوٹے تھرتھرائے اور اس کی آنکھیں پھیل کر کانوں تک بڑی ہوگئیں، بے جان مورتی میں جان پڑگئی، مہاراج اور دوسرے حبشیوں کی بیک وقت آوازیں گونجنے لگیں ان کی آوازیں بہت بلند تھیں۔ ”جے کالی۔ جے دیوی۔ دیوی کی جے ہو۔“

ڈھول کی آواز تھم چکی تھی، دیوی کے پاؤں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے سنگلاخ فرش پر قدم بڑھائے، دیوی کی نظروں میں صبا کا خون رقص کررہا تھا۔

احتشام کبھی بدی کی دیوی کو دیکھتا اور کبھی زخموں سے چور چور صبا کی جانب دیکھتا صبا پر خوف سے لرزہ طاری ہوچکا تھا۔

مہاراج چبوترے سے نیچے اترا اور اس کے سارے ساتھی دیوی کے قدموں میں سجدہ ریز ہوگئے یہی وہ لمحہ تھا جب احتشام نے رسیوں کے ساتھ زور آزمائی شروع کردی، زور لگانے کی شدت کی وجہ سے اس کے

سفید چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی تھی، رسیوں کی مضبوط تاریں اکھڑنے لگیں اور چند لمحوں میں ٹوٹ کر بکھر گئیں، بائیں ہاتھ کی رسی میں سے اس کا ہاتھ خود بخود آزاد ہوگیا جبکہ دائیں ہاتھ میں آدھی رسی جھولتی رہ گئی تمام بدی کے ہرکارے ابھی تک سر جھکائے زور زور سے ناقابل فہم الفاظ دہرا رہے تھے۔

دیوی کے بھورے اور موٹے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ تھی، فتح کے نشے میں سرشار دیوی یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کا دشمن احتشام رسیوں کی قید سے آزاد ہوچکا تھا۔

اسی لمحے وہ سب کے سب مہاراج سمیت سجدے سے اٹھ گئے، دیوی نے قدم آگے بڑھائے وہ صبا کو پکڑنا چاہتی تھی کہ صبا زخمی پاؤں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دوڑتی ہوئی احتشام کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دیوی نے احتشام اور صبا کی طرف دیکھا ”پکڑلو ان کو۔“ دیوی کی گرجدار آواز سنائی دی۔

دیوی کے حکم پر کالک، مہاراج، کلاوتی کی نظریں، احتشام اور صبا کی طرف گھوم گئیں، کالک ہاتھ میں تلوار لہراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس کے پیچھے کلاوتی بھی اٹھنے لگی۔

”اس ملیچھ کے لئے صرف کالک ہی کافی ہے۔“ یہ سن کر کلاوتی دوبارہ مہاراج کے سامنے بیٹھ گئی کالک کی گردن تن گئی دیوی کی بات سن کر جبکہ وہ احتشام سے پرانا حساب بھی بے باق کرنا چاہتا تھا۔ احتشام نے صبا کا ہاتھ چھوڑا اور کالک کے مقابلے میں نہتا آ گیا، کالک احتشام کو دیکھ کر غرور و تکبر سے بولا۔

”کبھی چیونٹی اور ہاتھی کی طاقت بھی برابر ہوئی ہے جو تم جیسی چیونٹی میرے مقابلے پر آرہی ہے میں جب چاہوں تمہیں پاؤں تلے مسل سکتا ہوں۔“

”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون ہاتھی ہے اور کون چیونٹی؟ بہت دیکھے ہیں میں نے تم جیسے چیتے کی کھال والے گیدڑ۔“

احتشام کی دھمکی سے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

کالک نے تلوار لہرا کر، احتشام پر وار کردیا احتشام ماہر قلاباز کی طرح اچھلا، اور کالک کا وار خطا ہوگیا۔ احتشام نے اپنی ٹانگ کالک کی ٹانگوں کے درمیان ماری اور اس پر مکوں کی بارش کردی۔

احتشام نے کالک کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ہی اس کے ناف میں لات ماردی تو کالک اڑتا ہوا کئی قدم دور جا گرا۔

کالک فوراً اٹھا اور منتر پڑھنا شروع کردیا احتشام فوراً سمجھ گیا کہ کالک پہلے ہی راؤنڈ میں پسپا ہونے کے بعد منتروں سے کام لے رہا ہے۔

احتشام نے فوراً بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھنی شروع کردی اور اپنے آپ پر پھونک ماری جس سے کالک کے منتر کا جادو، کارگر نہ ہوسکا، کالک بار بار احتشام پر منتر کا پھونک مارتا مگر احتشام پر اس کے منتر بے اثر ثابت ہورہے تھے۔

کالک نے منتر پڑھنا بند کردیئے اور دوبدو احتشام کے سامنے کھڑا ہوگیا کالک نے تلوار ہوا میں لہرائی اور احتشام کے سر کا نشانہ لے کر وار کردیا احتشام اپنی جگہ سے اڑتا ہوا دور ہوا، کالک کا وار خطا ہوگیا کالک دیوانہ وار احتشام پر وار کرنے لگا اور ہر بار احتشام اس کا وار ناکام کردیتا۔ احتشام نے اپنی جیب سے خنجر نکالا اور اس پر آیت الکرسی پڑھ کر کالک کے گردن پر وا کردیا، احتشام کا وار، کاری ثابت ہوا، کالک کی گردن سے خنجر آر پار ہوگیا۔

کالک دھڑام سے زمین پر گرا اور اس کے وجود کو آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا احتشام نے آگے بڑھ کر اس کے گردن سے خنجر کھینچ کے باہر نکال لیا، کالک اپنے بھیانک انجام کو پہنچ گیا تھا۔

”قہر ہو کالک پر، جو ایک ملیچھ، کے ہاتھوں بے بسی کی موت مرا.....“ دیوی کی غضب ناک آواز پورے ہال میں گونجی۔

”کلاوتی، تو اکیلی اس ملیچھ کا مقابلہ کر اور اسے بے بس کر کے میرے قدموں میں جھکا۔“ دیوی نے غضب ناک آواز میں کلاوتی سے کہا۔

دیوی کا حکم سن کر کلاوتی جھٹ سے کھڑی ہوگئی

اور اٹھ کر احتشام کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی۔

"اب تو نہیں بچے گا۔" کلاوتی نے زہر خند لہجے میں احتشام کو دھمکی دی۔

"تیرے ہاتھ بہت نازک ہیں اپنے آپ پر رحم کھا، میرے سامنے سے ہٹ جا ورنہ تیرا انجام تیرے ساتھی سے بدتر ہوگا۔" احتشام نے اسے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"میرے ہاتھ جتنے نازک ہیں اتنے ہی مضبوط بھی اور ابھی میں تجھے اس کا ثبوت بھی فراہم کردوں گی۔" کلاوتی زہر خند ہو کر بولی۔

کلاوتی نے اپنے لمبے ناخنوں سے احتشام کا چہرہ نوچنا چاہا تو احتشام فوراً جھکائی دے کر نیچے بیٹھ گیا اور بولا۔

"زہریلی بلی، تیری خیر نہیں۔"

احتشام نے پوری طاقت سے کلاوتی کی ناف پر لات رسید کی تو کلاوتی احتشام کی مضبوط لات کی وجہ سے کئی فٹ ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا گری پھر وہ فوراً اٹھی اور دوڑتی ہوئی احتشام کی طرف بڑھی اور اڑتی ہوئی اس کے کندھے سے لپٹ گئی اور مضبوط ناخنوں سے اس کے سر کے بال پکڑ لئے اور پھر اپنے ناخن اس کی گردن میں پیوست کردیئے جس سے احتشام کی تکلیف میں اضافہ ہوگیا صبا اور سارے حبشی حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے اور ان کی نظریں احتشام اور کلاوتی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

صبا نے جب احتشام کی گردن سے خون بہتے دیکھا تو اسے جیسے ہوش آ گیا وہ دوڑتی ہوئی احتشام کی پشت پر آن کھڑی ہوئی۔

احتشام کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر گر گیا، صبا نے چھلانگ لگائی اور کلاوتی کے بالوں میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور پھر اس نے جھٹکا دے کر کلاوتی کو احتشام کے کندھے سے فرش پر نیچے پشت کی جانب گرا دیا، احتشام پرسے سے جیسے بوجھ ہٹ گیا اور پھر صبا نے کلاوتی کے چہرے پر لاتوں کی بارش شروع کردی۔ احتشام نے فوراً خنجر اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے میں کلاوتی کے سینے کے آر پار کردیا۔

کلاوتی کی دل دوز چیخ ہال میں چنگھاڑتی ہوئی خاموش ہوگئی پھر احتشام نے جھٹ سے اس کے سینے سے خنجر نکال لیا۔ خنجر کے نکلتے ہی کلاوتی کے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے اور پھر وہ جل کر کوئلہ ہوگئی۔

احتشام فتح یاب نظروں سے دیوی کی طرف دیکھنے لگا، دیوی کا چہرہ کرخت، بھیانک اور ہیبت ناک ہوگیا۔

"ان دونوں کو نیست و نابود کردو۔" دیوی غضب ناک آواز میں گرجی۔

دیوی کا حکم سنتے ہی تمام حبشی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراج سب سے پہلے احتشام کی طرف دوڑا، احتشام نے صبا کو دھکا دیا۔

مہاراج جیسے ہی احتشام کے قریب پہنچا احتشام نے خود کو بچانا چاہا مگر مہاراج نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ کو بلند کیا اور زور سے احتشام کے منہ پر رسید کردیا کچھ دیر تک تو احتشام کو کچھ دکھائی نہیں دیا اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھا گئی۔

اپنا پہلا کامیاب کاری وار دیکھ کر مہاراج نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا اور غرور سے بولا۔

"اس کمبخت کے لئے صرف میرا ایک ہاتھ ہی کافی ہے، ابھی تو صرف ایک مکا مارا ہے۔ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں دیکھو۔" ان سب کی نظریں احتشام اور مہاراج پر مرکوز ہوگئیں احتشام کے ذہن سے جب دھند چھٹی تو اس نے خونخوار نظروں سے مہاراج کو گھورا اور اسی لمحے ہوا میں اڑتا ہوا مہاراج کے سینے پر فلائنگ کک ماری اور پھر اسے محسوس ہوا کہ اس نے کسی انسان کو نہیں بلکہ کسی پتھر کو کک ماری ہو، کک سے مہاراج کا جسم ذرا سا ڈگمگا مگر جلدی ہی سنبھل گیا، کافی دیر تک دونوں میں جنگ جاری رہی اور پھر بالآخر احتشام نے موقع پر مہاراج کے سینے میں خنجر گھونپ دیا اور پے در پے وار کر کے اس کو لولہان کردیا اور مہاراج فرش پر تڑپتے ہوئے ٹھنڈا ہوگیا۔

احتشام کے ہاتھوں مہاراج کا حال دیکھ کر دیوی گرجی، دیوی کے چیلے جو دیوی کے قدموں میں بیٹھے تھے دیوی کا حکم سن کر اٹھے اور احتشام کی طرف دوڑے۔

احتشام، پہلے تو اس اچانک پڑنے والی افتاد پر گھبرا گیا لیکن پھر اس نے سنبھل کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر حبشی چیلوں پر طوفان کی طرح کود پڑا جو اس کے سامنے آتا گیا اس نے ہاتھوں سے لاتوں سے اور خنجر کے کاری واروں سے انہیں مار گرایا، احتشام پر ایک جنون سوار تھا، اس وقت وہ جیسے مردیا مارو کے مصداق دشمنوں پر شیر کی طرح جھپٹ پڑا تھا۔

دیوی اپنے حبشی چیلوں کو گاجر مولی کی طرح کٹتے دیکھ کر غضب ناک ہوگئی احتشام نے اس کے سارے چیلے جہنم واصل کردیئے اگر دیوی کے چیلوں میں کسی کی سانس باقی بھی تھی تب بھی ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اٹھ کر احتشام کے سامنے آسکتے۔

دیوی اپنے لمبے قد اور بھاری جسم کے ساتھ ہال کے سخت فرش پر کھڑی ہوگئی تو جیسے پورا فرش لرزنے لگا، احتشام نے صبا کا ہاتھ پکڑا اور ہال سے باہر نکلنے والے راستے کی طرف بھاگا، مختلف راہ داریوں اور زینوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں باہر نکلے باہر ایک بڑا کھلا میدان تھا جہاں چاروں طرف بے شمار درخت اور دور دور تک سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ دیوی ہاتھ میں ترشول پکڑے مست ہاتھی کی طرح لہراتی ہوئی مسلسل ان کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی۔

احتشام کے ایک ہاتھ میں صبا کا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا، دونوں دیوانہ وار دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اچانک سطح زمین سے ایک بڑا سیاہ ہاتھ نکلا اور اس نے دوڑتی ہوئی صبا کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ صبا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور منہ کے بل زمین پر اوندھے منہ گر پڑی اور احتشام سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

احتشام فوراً رک گیا اور صبا کی طرف مڑا احتشام نے اس کالے ہاتھ کو اپنے خنجر سے ایک ہی وار میں صبا کے پاؤں سے جدا کردیا، دیوی ان کے تعاقب میں تھی اس نے اپنا ترشول ان کی طرف پھینکا ترشول اڑتا ہوا صبا اور احتشام کی طرف آنے لگا احتشام نے صبا کو دوبارہ دھکا دیا اور خود اس کے اوپر گر گیا۔

دیوی کی طرف سے پھینکا گیا ترشول ان دونوں کے اوپر سے گزر گیا، صبا نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تو صبا کے چہرے کے اوپر احتشام کا چہرہ تھا احتشام کے مضبوط جسم نے صبا کو چھپا لیا تھا پھر احتشام جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اس نے بازو سے صبا کو پکڑ کر کھڑا کردیا۔

لیکن اب دیر ہو چکی تھی دیوی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ دیوی نے اپنا موٹا اور لمبا ہاتھ بڑھا کر احتشام کو گردن سے پکڑ لیا اور اسے زمین سے کئی فٹ بلند کردیا۔ اور گیند کی طرح فضا میں اچھال دیا، احتشام نے خود کو بچانے کی بھرپور کوشش کی مگر دیوی جیسی زخمی ناگن سے خود کو بچانا اسے مشکل لگ رہا تھا احتشام زمین پر گرا، زمین نرم تھی اور گھاس کی وجہ سے اسے کوئی خاطر خواہ چوٹ نہیں لگی تھی۔

دیوی ایک بار پھر احتشام کی جانب لپکی تو وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف سرکنے لگا، بھاگنے یا کھڑے ہونے کی اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

دیوی اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

"بلیچھا اگر تو ہمارے چرنوں میں جھک کر ہم سے یہ کہے کہ مجھے معاف کردو تو ہم معاف کردینگے اور تجھے چھوڑ دیں گے۔" دیوی اپنے غضب ناک آواز میں چنگھاڑی۔

صبا کی نظریں احتشام پر اور احتشام کی نظریں دیوی کی بدہیبت کالے چہرے پر جمی تھیں۔

"یہ تمہاری بھول ہے کہ میں تمہارے قدموں میں جھک کر تم سے رحم کی بھیک مانگوں گا اس خیال کو ذہن سے نکال دو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں مرنا پسند کروں گا لیکن کبھی بھی تمہارے قدموں میں جھکوں گا نہیں۔" احتشام غصے سے بولا۔ "خوب بہت خوب۔" دیوی قہقہے لگانے لگی۔ "اب تیری موت یقینی ہے۔"

دیوی نے یہ کہہ کر اپنا بھاری پاؤں اٹھایا اور احتشام کی گردن پر رکھ دیا، احتشام اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوی کا پاؤں اپنی گردن سے ہٹانے کیلئے زور آزمائی کرنے لگا مگر وہ ناکام رہا، وزنی پاؤں کی وجہ سے احتشام کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

صبا نے جب احتشام کا یہ حال دیکھا تو اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں اسے ایک جگہ پر احتشام کا خنجر چمکتا

ہوا نظر آ گیا تو وہ خنجر کی طرف دوڑی او رجھٹ خنجر اٹھا کر دیوی پر جھپٹ پڑی۔ اور پھر اس نے پوری قوت سے خنجر، دیوی کے پاؤں میں گھسیڑ دیا، دیوی نے ایک کراہیت ناک چیخ ماری اور اپنا پاؤں احتشام کی گردن پر سے اٹھالیا۔ اس کے پاؤں سے بھل بھل خون بہنے لگا، دیوی نے ہاتھ بڑھا کر صبا کو پکڑلیا اور پوری قوت سے اسے گیند کی طرح پھینک دیا صبا اڑتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں گر گئی دیوی نے صبا کی طرف دیکھا اور غصے سے صبا کی طرف بڑھنے لگی صبا بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی، صبا کی نظر اچانک ترشول پر پڑی تو اس نے جھٹ سے ترشول کو مضبوطی سے پکڑا اور دوڑتی ہوئی دیوی کی جانب بڑھی، احتشام کی نظریں صبا اور دیوی کے درمیان کم ہوتے فاصلے پر مرکوز تھیں۔

صبا نے پوری شدت سے ترشول دیوی کے سینے کے مقام پر پیوست کر دیا، دیوی نے خود کو بچانے کی کوشش مگر صبا جیسے کفن سر باندھ کر دیوی کی جانب دوڑی تھی۔ ترشول دیوی کے سینے میں پیوست ہو گیا، دیوی کی آنکھیں باہر ابل پڑیں اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گئیم اس کے گرتے ہی اس کے وجود نے کسی سوکھی لکڑی کی طرح آگ پکڑلی۔ ماحول دیوی کے ہولناک چیخوں سے گونج اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑنے لگیں۔ دیوی کے فنا ہوتے ہی مہاراج کا استھان دھماکے سے اڑ گیا، جہاں سے صبا اور احتشام بھاگ کر اس میدان میں آئے تھے۔

صبا نے احتشام کو سہارا دے کر اٹھایا۔

دونوں کے حلیے بہت زیادہ خراب تھے مگر وہ دونوں قریبی جنگل میں گھس گئے اور شام تک بھٹکنے کے بعد بالآخر ایک سڑک پر پہنچ گئے، جنگل میں بہتی ایک ندی پر دونوں نے ہاتھ منہ دھوئے اپنے حلیے کافی حد تک درست کئے پیٹ بھر کر پانی پیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ دونوں گھر پہنچے تو صبا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ صبا کے پورے رشتے دار جمع تھے اور آہ وزاری کر رہے تھے۔ صبا کی ماں کی تدفین و تکفین، سہ پہر 4 بجے کی جا چکی تھی۔

صبا بے ہوش ہو گئی جب اسے پتہ چلا کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

احتشام غم و غصے سے ان منحوس لمحوں کو سوچنے لگا جب آسیہ بیگم نے صبا کے ہاتھوں یاسر کو پکوڑے بھجوائے تھے۔

انہیں اب اندازا ہوا کہ دونوں ایک رات اور پورا دن گھر سے غائب رہے تھے اور اب وہ رات کے آٹھ بجے گھر پہنچے تھے۔

تین دن بعد صبا اسپتال سے گھر آئی، وہ گم صم تھی۔ احتشام کی ماں اور احتشام نے پورے تین دن صبا کے پاس اسپتال میں گزارے تھے، سب سے پہلے صبا اپنی ماں کی قبر پر گئی۔

جب صبا فاتحہ پڑھ کر احتشام کے ساتھ گھر لوٹی تو احتشام نے اپنی ماں کے سامنے صبا سے کہا۔

"صبا اب تم اکیلی اس گھر میں نہیں رہ سکتی، میں اب تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔"

صبا نے احتشام کی بات سن کر اس کی ماں کی طرف دیکھا تو احتشام کی ماں نے صبا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہاں میں گردن ہلائی۔

"مگر ابھی تو امی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی۔" صبا منمنائی

"ہم سادگی سے نکاح کریں گے اور تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے، صرف خاندان کے بڑوں کو نکاح میں شریک کریں گے، کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہوگا۔" احتشام کی امی نے صاف گوئی سے کہا جبکہ احتشام مسکراتی نظروں سے صبا کو دیکھا۔ صبا اپنی جگہ سے اٹھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بولی۔ "ٹھیک ہے چچی جان مجھے منظور ہے۔" اور کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

چند دنوں کے بعد صبا احتشام کی دلہن بن کر اس کے گھر آئی اور اس نے احتشام کی محبت کو پالیا، احتشام نے صبا کو اتنا پیار دیا کہ اس کی محبت نے صبا کے ہر غم کو بھلا دیا۔

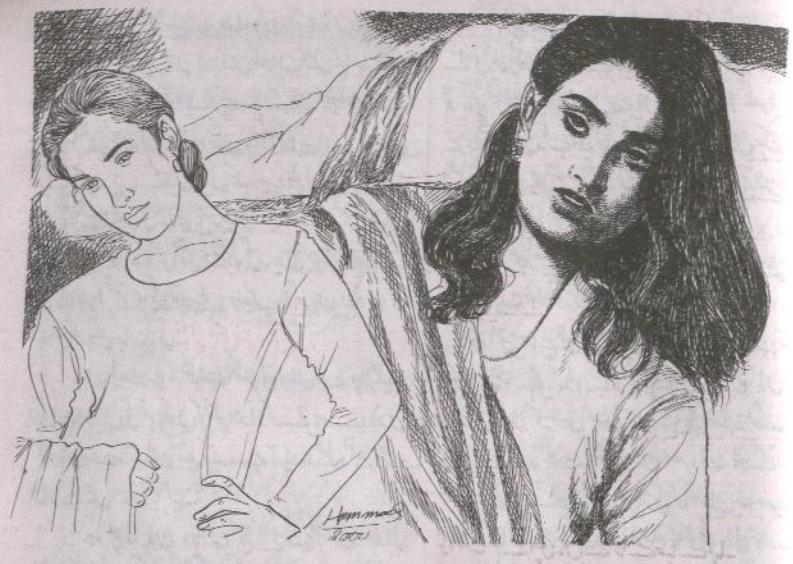

اینجل

اقصیٰ رباب-فیصل آباد

رات کے اندھیرے میں ایک نوجوان نمودار ہوا، اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے دھک رہے تھے، نوجوان نے چاروں سمت دیکھا اور پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا تو اس کے ہاتھ سے چنگاریاں نکل کر آگے بڑھنے لگیں۔

اچھی کہانیاں پڑھنے والوں کے لئے ایک دلگداز، دلفریب، اچھوتی اور انوکھی کہانی

مقسود اور ردا سر جھکائے کھڑے تھے۔

"شہنشاہ مشتری حساد" ان دونوں کو غضب ناک نگاہوں سے تک رہا تھا۔ وہ دونوں بہت شریر تھے اور ان دونوں کی آئے دن کی شرارتوں نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہر کوئی ان سے عاجز آ چکا تھا۔ اور سب کی برداشت ختم ہو چکی تھی اب تو "حساد" بھی ان دونوں کی آئے دن کی شکایتوں سے تھک چکا تھا۔ اور ان دونوں کی معصوم صورتوں کو دیکھ کر بھی اب رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

پوری مجلس میں اس وقت خاموشی طاری تھی کیونکہ شہنشاہ مشتری فیصلہ سنانے والا تھا "مقسور اور ردا ما، آج حقیقت میں پریشان تھے کیونکہ آج انہیں حساد کے انداز میں کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔

کچھ دیر اپنے فیصلے پر اچھی طرح غور و فکر کے

بعد حساد گویا ہوا ''مقسور اور رداما دونوں شرارتوں میں حد سے بڑھ چکے ہیں۔ اس بار انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ سزا کے طور پر دونوں کو ایک ایسے سیارے پر بھیجا جارہا ہے جہاں انہی جیسے لوگ آباد ہیں۔ وہیں یہ دونوں انسانی روپ میں رہیں گے دس سال تک، یہ دونوں یہاں واپس نہیں آسکتے اور کسی مسئلے یا پریشانی کی صورت میں یہاں سے انہیں کوئی مدد بھی نہیں ملے گی۔ دس سال بعد جب ان کی سزا ختم ہوگی تو یہاں واپس بلا کر ان دونوں کی شادی کردی جائے گی۔''

اپنا فیصلہ سنا کر شہنشاہ مشتری وہاں سے چلا گیا۔ اور ان دونوں کی نم پلکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں کو وہاں سے ''زمین'' پر ایک بے آباد نامکمل تعمیر شدہ عمارت میں اتار دیا گیا۔

وہ پورا دن دونوں کا ''اپنوں'' کی جدائی میں روتے ہوئے گزرا۔ مگر دونوں پھر اپنے دل کو سمجھا ہی لیا کہ اب دس سال تو مجبوراً یہاں گزارنے ہی ہیں۔

ان دونوں نے اسی بے آباد عمارت کو اپنی رہائش بنالیا۔ رداما ہر وقت وہیں رہتی۔ مگر مقسور نے باہر آبادی میں جانا اپنا معمول بنالیا۔ 4-5 لڑکوں سے اس کی دوستی بھی ہوگئی یونہی وقت گزرتا رہا کہ ایک دن ان سب دوستوں نے ''ام الخبائث'' سے خود کو آلودہ کیا اور دیر تک غیر اخلاقی گفتگو میں مصروف رہے۔

رات دیر گئے جب مقسور لوٹا تو اس کے ڈولتے قدموں اور جھومتے ہوئے ہوش سے بیگانہ اور بے باک نظروں نے رداما کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

رداما نے ایک پرندے کا روپ اپنایا اور وہاں سے اڑ گئی، کثرت شراب کے باعث مقسور اس وقت اس حالت میں نہیں تھا کہ اس کو روک پاتا۔ مگر اسے علم تھا کہ اس نشے کے اثر سے نکلتے ہی وہ اس قابل ہوگا کہ رداما کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ رداما بھی جانتی تھی کہ مقسور کی طاقتیں اس سے زیادہ ہیں۔ اب تو وہ ''اپنے لوگوں'' کو بھی دس سال پہلے مدد کے لئے نہیں پکار سکتی تھی۔ عجیب بے بسی تھی کہ کوئی جائے پناہ نہیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اس نے دیکھا تھا کہ مقسور جب اکثر دنیا کا نقشہ دیکھتا ہے تو کچھ جگہیں ایسی ہیں جہاں اس کی آنکھوں میں تیز روشنی پڑتی ہے اور چاہ کر بھی کچھ دیکھ نہیں سکتا اگر وہ انہی جگہوں میں سے کسی ایک جگہ کے آس پاس رہے تو وہ اسے کبھی ڈھونڈ نہیں پائے گا۔

مسجد سے نمازی نماز پڑھ کر نکلے تو سیڑھیوں پر بیٹھی ایک خوبصورت لڑکی کو روتا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ لڑکی اس علاقے کی نہیں تھی کیونکہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے لڑکی سے پوچھنے کی کوشش میں انہیں احساس ہوا کہ لڑکی بول نہیں سکتی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے گفت وشنید میں مصروف ہوگئے باہمی مشورے سے طے پایا کہ اس لڑکی کو احسان صاحب کے گھر رکھا جائے جب تک لڑکی کا کوئی والی وارث نہ آجائے۔

ملک احسان اس علاقے کے بہت معتبر اور عزت دار انسان تھے اور مسجد کے پاس ہی ان کا گھر تھا۔ لڑکی کو جسے سب خود بخود ''گڑیا'' کہنے لگے سب نے سمجھا بجھا کر ملک احسان کے گھر بھیج دیا ملک احسان کی بیوی بہت نفیس عورت ثابت ہوئیں اور ملک احسان بھی شریف الطبع انسان تھے۔ رداما کی ساری فکر دور ہوگئی۔

یونہی دن گزرتے گئے اور رداما کو یہ گھر اپنا ہی محسوس ہونے لگا۔ مگر کبھی کبھی اسے مقسور بھی بہت یاد آتا اور ایسے میں اس کی پلکیں نم ہوجاتیں، مقسور اس کے ہر دکھ درد کا ساتھی تھا۔

دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا۔ دونوں نے اکٹھے سب کو ستایا، ایک ساتھ ڈانٹ سنی، سزا بھی ایک ساتھ ملی..... مگر یہاں آکر..... ''میرے مقسور کو ان انسانوں نے خراب کیا۔'' اس کے دل میں اکثر آتا مگر ساتھ ہی ملک احسان اور اس کی شفیق بیوی اس کی نظر کے سامنے آجاتے۔ اور اسے اپنی رائے بدلنی پڑتی۔

رداما کو ملک احسان کے گھر رہتے ہوئے آٹھ سال گزر گئے مقسور اپنا سارا زور لگا بیٹھا مگر رداما کو نہ ڈھونڈ سکا۔۔ وہ اس واقعہ پر نادم تھا معافی مانگنا چاہتا تھا۔ مگر رداما کا کوئی اتا پتا ہی نہیں تھا۔ اسے کسی پل سکون نہیں ملتا تھا۔ مگر بے بسی کا احساس بڑھتا ہی جارہا تھا اس کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی تھی۔ اکثر چیخ پڑتا۔ ''رداما..... میں تیرا مجرم، مجھے معاف کردے۔'' مگر اس کی آواز رداما کی پہنچ سے بہت دور تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ملک احسان کے سسرالی رشتے داروں میں سے کسی کا انتقال ہوگیا تھا دونوں میاں بیوی کو وہاں جانا پڑ گیا۔ کفن دفن کے بعد احسان ضروری کام کا بہانا کر کے لوٹ آیا رداما کو احسان کی شرافت نے اتنا متاثر کیا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ پائی کہ انسان کو شیطان بنتے دیر نہیں لگتی۔ طوفان آیا اور آکر گزر گیا۔ مگر اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے گیا اب احسان کو احساس ہوا کہ اس کی شرافت کا بھید نہ کھل جائے اس نے رداما پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی اور گھر کی حالت ایسے کردی کہ جیسے چولہے کی آگ سے رداما جھلسی اور اس کی موت ہوگئی۔

بیگم احسان بھی صدمے میں واپس آگئی۔ اتنی پیاری لڑکی کی موت کا دکھ انہیں تڑپائے دے رہا تھا۔ اتنی خوبصورت گڑیا کے ساتھ ہوئے اس حادثے پر ہر آنکھ پرنم تھی، شرافت کے لبادے میں لپٹا شیطان بھی پلکیں نم کئے بیٹھا تھا۔ اور ساری بستی اسے حوصلہ اور صبر کا درس دے رہی تھی اس سوگ کی کیفیت میں رداما کو سپرد خاک کردیا گیا۔

اسی وقت مقسور کی تلاش ختم ہوئی اور اسے رداما نظر آگئی۔ مگر کس حالت میں۔ ''یہ سب میری رداما کے ساتھ۔''

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، صبح پوری بستی آگ کی لپیٹ میں تھی، ہر گھر کے ایک دو افراد جھلس گئے تھے ان میں ملک احسان بھی شامل تھا۔ بستی والوں کو روتا اور بین کرتا دیکھ کر مقسور کو سکون آرہا تھا اب وہاں آگ

یوں بھی ہوتا ہے

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ''منا اتنی دیر سے رو رہا ہے۔ مگر تمہیں اتنی فرصت نہیں کہ ذرا اسے گود میں اٹھالو تم تو ایسے کرتے ہو۔ جیسے میں اپنے جہیز میں لے کر آئی تھی۔''

شوہر غصے سے۔ ''اور تم تو مجھے ایسے سنا رہی ہو۔ جیسے میں اسے اپنا بارا تی بنا کر لایا تھا۔''

(روبینہ ناز..... کراچی)

لگنا اور جھلس کر مرنا معمول بنتا جارہا تھا لوگوں نے تنگ آکر وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا مگر جو لوگ وہاں سے جاتے مقسور ان کا بھی پیچھا نہ چھوڑتا کہیں مسافر بس الٹ جاتی اور کہیں شارٹ سرکٹ ہوجاتا۔

اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی مقسور کا جذبۂ انتقام کم ہونے کی بجائے بڑھتا جارہا تھا۔ جو آگ ایک بستی سے شروع ہوئی وہ شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی کسی کو سمجھ نہیں آئی تھی کہ کیسے اچانک آگ بھڑک اٹھی اور بجھانے کی ساری کوششیں ناکام رہتیں اور آگ اپنی مرضی سے بجھتی جب ناقابل تلافی نقصان ہوچکا ہوتا۔

اس حد سے بڑھے ہوئے انتقام کی خبر شہنشاہ مشتری کو بھی پہنچ گئی اور ایک دن جب مقسور عادت کے مطابق ایک گھر میں آگ بھڑکا رہا تھا کہ اچانک آگ بجھ گئی وہ حیران رہ گیا جب دیکھا تو اسے اپنے سامنے شہنشاہ مشتری حسد کھڑا نظر آیا وہ مقسور کو ایک ویرانے میں لے گیا اور دکھ سے مقسور کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بے گناہ کی جان لینا بھی تم نے اب سیکھ لیا۔ قاتل بھی بن گئے اب تم.....''

''تو کیا کروں؟ ان لوگوں نے میری رداما کے ساتھ جو کیا اس کی سزا تو انہیں دوں گا، رداما کی موت میری برداشت سے باہر ہے۔'' مقسور گہرے کرب سے بولا۔

شہنشاہ مشتری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سامنے دیکھنے کو کہا۔ وہاں ایک منظر چل رہا تھا ایک پیاری سی لڑکی وائٹ کوٹ پہنے ایک بزرگ آدمی کی جان بچانے کے لئے تگ ودو کررہی تھی۔

شہنشاہ مشتری نے مقور سے کہا۔ ''یہ اب ہورہا ہے اس بچی پر جو بیتی وہ بھی دیکھ لو ماضی میں۔'' اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو سارے مناظر کسی فلم کی طرح چلنے لگے ایک ماں اور ایک ننھی بچی ایک شخص کی میت پر بلک بلک کررورہی تھیں اس شخص کی تدفین کردی گئی گھر میں غربت کا راج تھا جو شخص فوت ہوا وہ معمولی مزدور تھا۔ جو جمع پونجی تھی اس شخص کے علاج پر خرچ ہوگئی، تدفین والے دن رشتہ داروں نے دنیا دکھاوے کے لئے کھانے کا انتظام کردیا مگر اس کے بعد پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔

دونوں ماں بیٹی دو دن سے بھوکی بیٹھی ہیں کہ اس عورت کا جیٹھ آتا ہے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینکنے لگتا ہے، عورت منتیں کرتی ہے مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بچی سہمی ہوئی اپنے تایا اور چچا کو دیکھ رہی ہے جو انہیں گھر سے بے گھر کررہے ہیں وہ ان دونوں کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اس کی ماں رورہی ہے کہ اب کہاں جائیں، ماں بچی کو لے کر قبرستان جاتی ہے اور شوہر کی قبر پر بیٹھ کر روتی ہے کہ ''تمہارے بھائیوں نے یہ کیا۔ اب ہم دونوں کہاں جائیں۔''

وہاں سے ایک خدا ترس بندہ گزر رہا ہوتا ہے۔ یہ سن کر ان دونوں کو ساتھ لے جاتا ہے بچی کی ماں سارا دن لوگوں کے گھروں کا کام کرتی ہے۔ بچی کی ماں کا بس ایک ہی خواب ہے کہ اس کی بیٹی پڑھ لکھ کر کسی اعلیٰ مقام پر پہنچے۔ بیٹی کے لئے بھی اپنی ماں کا یہ سپنا ہر چیز سے بڑھ کر اہم ہے۔ اس لئے وہ دن رات محنت کرتی ہے ٹیوشن پڑھاتی ہے ساری ساری رات خود پڑھتی ہے۔

یہاں شہنشاہ مشتری نے مقور سے پوچھا۔ ''اس لڑکی کی جگہ اگر تم ہوتے تو کیا کرتے؟''

مقور نے طیش سے جواب دیا۔ ''اس کے چچا اور تایا کو عبرت کا نشان بنادیتا۔ سارا خاندان ان کا مار ڈالتا میں تو۔''

شہنشاہ مشتری کے لبوں پر تبسم پھیل گیا۔ ''مگر یہ لڑکی انسان ہے۔ جس کے لئے انسانیت سب سے پہلے ہے۔''

آج وہ ڈاکٹر ہے اور اپنے اسی تایا کی جان بچانے کے لئے تگ ودو کررہی ہے۔ خون کا انتظام نہیں ہو پایا تو اپنا خون دیا ہے۔''

یہ سن کر مقور کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے طیش سے کہا۔ ''کیا اسے معلوم نہیں یہ ظالم اس کا تایا ہے؟''

''اسے علم ہے کہ اس کا اس ضعیف آدمی سے کیا رشتہ ہے۔'' شہنشاہ مشتری نے جواب دیا۔

''پھر اسے یاد نہیں ہوگا کہ یہ انسان اس کے ساتھ کیسا سلوک کرچکا ہے۔'' مقور نے یقین سے کہا۔

حساد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بھولی نہیں ہے۔ اسے ہر ایک بات یاد ہے۔''

''کیا پھر یہ پاگل ہے؟ اسے تو چاہئے اسے زہر کا انجکشن لگادے مار ڈالے اسے۔ کیوں کررہی ہے یہ اس کی جان بچانے کی کوشش؟'' مقور نے غضب ناک انداز میں سوال کیا۔

اس سوال پر شہنشاہ مشتری حساد مسکرادیا۔

''اس لئے کہ اسے پتا ہے معاف کرنے والے کا درجہ بدلہ لینے والے سے کہیں بڑا ہے اور یہ فقط بہادروں کے بس کی بات ہے، اپنے ساتھ برا کرنے والوں کے ساتھ اچھائی کریں۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے یہ.....''

حساد نے جب دیکھا کہ مقور پر اس کی بات اثر کررہی ہے تو مزید بولا.....

''روداما کے ساتھ یقیناً برا ہوا۔ ہم سب کو اس کا دکھ ہے مگر جو تم کررہے ہو، وہ سب اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ بے گناہوں کو جھلسا کر ماررہے ہو، ان کی

جانیں لے رہے ہو اگر وہ سب بھی اپنا اپنا بدلہ لینے پر اتر آئے تو؟ جن کے گھر تباہ کئے ایک مرتبہ واپس ان کی طرف بھی دیکھ لو۔

اس لڑکی کے تایا نے تو ایک گھر تباہ کیا اور تمہیں دیکھ کر ہی اتنا غصہ آیا تم نجانے کتنے گھر تباہ کرچکے ہو۔''

مقور نے شرمندگی سے سر جھکالیا، احساس گناہ اس کے دل میں بیدار ہوچکا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر علینہ کو اب جا کر سکون ملا تھا کہ اس کے تایا کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ گھر والے اس کی اتنی محنت اور اپنائیت پر اس کا شکریہ ادا کررہے تھے۔ جب ڈاکٹر علینہ ذرا سا آگے بڑھی تو اس نے دیکھا چھوٹا سا ایک بچہ اپنے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا خوبصورت گلدستہ لئے کھڑا ہے۔

ڈاکٹر علینہ حیران رہ گئی بچے نے پھول اس کی طرف بڑھائے جو اس نے شکریہ کے ساتھ تھام لئے، وہ جیسے ہی کوریڈور سے دوسری رو میں مڑی پیچھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔ کیوٹ اینجل! ظالم تایا کے لئے بھی اتنی فکر۔''

ڈاکٹر علینہ حیرت سے واپس پلٹی کیونکہ اس نے اپنے تایا کی فیملی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ انہیں اپنے سامنے شرمندگی سے سر جھکا تا نہیں دیکھ سکتی تھی پھر ایک بچے کو کیسے پتا چلا؟ اسی حیرت میں اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔

مگر بچہ وہاں موجود نہیں تھا، اس نے پورا کوریڈور دیکھا مگر بچہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اسی حیرت میں وہ گلدستہ ہاتھ میں لئے اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

وہ تو بس اپنے تایا کی جان بچانے کی خوشی میں سرشار تھی۔ اسے کیا علم تھا کہ اس نے آج ایک نہیں، اپنے عمل سے دو نیکیاں کمالی تھیں۔

حسن سیرت والے لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں جن کی نگاہ اور حسن عمل زمانوں کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔

مقور جو پوری دنیا کو جلانے کا پختہ ارادہ کرچکا تھا جس کے سامنے بڑے بڑے مکان ریت کی دیوار ثابت ہورہے تھے ایک کمزور سی لڑکی کے عمل نے اس کے ارادوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اسے سر تا پا بدل دیا تھا کہ اب اسے اپنے کئے پر ندامت ہورہی تھی۔ اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اب جتنا عرصہ وہ اس زمین پر رہے گا نیک انسانوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا رہے گا تاکہ اپنے کئے کا کچھ تو ازالہ کرسکے اور اسے بھی کوئی پیار سے ''اینجل'' کہہ کر پکارے۔

جب کسی کے دل میں ''اینجل'' کہلوانے کی خواہش بیدار ہوجائے تو پھر اس سے برائی سرزد ہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔

مقور نے بھی نیک لوگوں کی مدد کا ارادہ کرلیا۔ مگر نیک لوگ اسے ملتے کہاں سے؟ ہر کسی میں منافقت بھری تھی ہر کسی کا ظاہر اور باطن الگ الگ۔

جو اس کے دل میں آگ تھی دوسروں کو جلادینے کی ستر فیصد لوگوں کے دلوں میں وہی جذبہ موجود تھا۔ کوئی کسی کو معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کہیں لوگ اندھا دھند فائرنگ کرکے بے گناہوں کی جان لے رہے تھے کہیں بم بلاسٹ کرکے ہر طرف درندگی اور وحشت کا راج تھا۔

گھبرا کر مقور اپنے سیارے پر لوٹ گیا۔ اپنے لوگوں کو جب بھی دنیا کی باتیں بتانے بیٹھتا تو یا تو وہ کسی بم بلاسٹ کی ہوتی یا فائرنگ کی، وہ لوگ کانپ جاتے کہ مقور ایسی خطرناک جگہ رہ کر آیا ہے۔

آخر سب نے شہنشاہ مشتری سے درخواست کی کہ مقور اتنی خطرناک جگہ رہ کر آیا ہے اسے کوئی بہادری کا ایوارڈ دیا جائے۔

آخر ایک دن مقور کو ''شجاعت ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ کہ وہ اتنے بھیانک سیارے ''زمین'' پر اتنا عرصہ رہ کر واپس آیا ہے۔

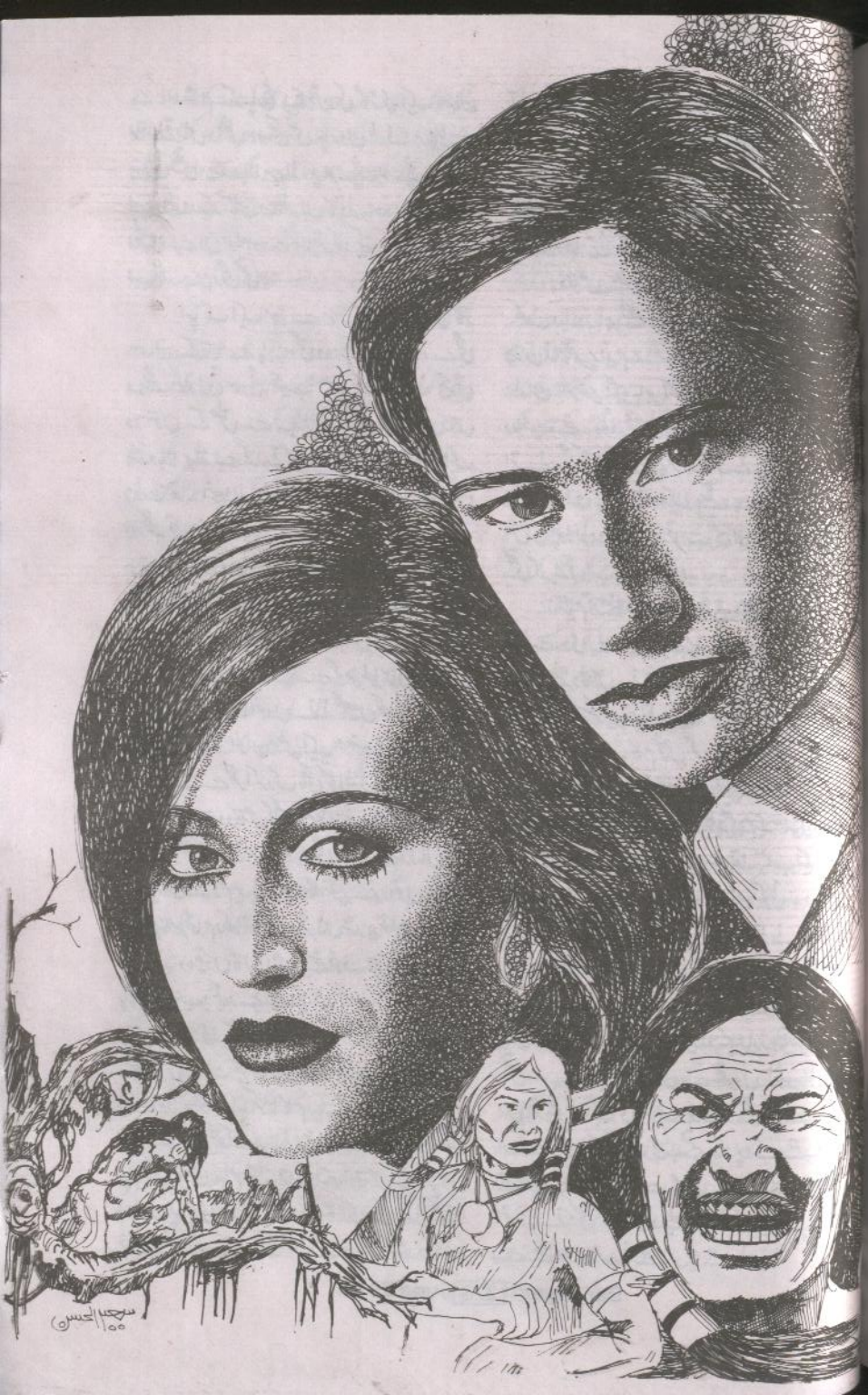

نیو وکی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

دہشت ناک

شہزادہ چاند زیب عباسی۔کراچی

نوجوان نے جیسے ہی خوب صورت اور دیدہ زیب پھول کو توڑا تو ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھول کی شاخ سے جہاں سے کہ پھول توڑا تھا اس جگہ سے قطرہ قطرہ انسانی خون ٹپکنے لگا اور پھر……

سطر سطر رونگٹے کھڑے کرتی اور انگشت بدنداں کرتی عجیب و غریب لہولہو عبرت ناک کہانی

بلیک ہنڈا اکارڈ تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اس میں موجود تین بے فکرے دوست موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، تیس سالہ وقاص، اٹھائیس سالہ سلمان اور پچیس سالہ تنویر تینوں کا تعلق امیر گھرانوں سے تھا، یہ تینوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ دولت مند گھرانوں سے تعلق کے باوجود تینوں میں کوئی اخلاقی کمزوری نہ تھی ملکہ کوہسار مری میں ان کے ایک گہرے دوست فراز کی شادی تھی جس میں شرکت کے لئے وہ تینوں شہر سے جا رہے تھے۔

شادی کے ہنگاموں کے اختتام پر انہوں نے فراز سے جانے کی اجازت طلب کی اور واپسی کے لئے نکل پڑے۔ ابھی انہوں نے چند کلومیٹر کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ موسم کے تیور بدل گئے۔ گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ سلمان نے گاڑی کی رفتار کم کردی۔ پہاڑی علاقے کی سڑک پر ناواقف ڈرائیور کے لئے گاڑی چلانا یوں بھی دشوار ہوتا ہے یہاں کے مور انتہائی خطرناک ہیں سڑک پر موڑ کاٹتے وقت سامنے سے آنے والی گاڑی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ڈرائیوروں کی سہولت کے لئے سڑک کے کنارے کئی مقامات پر آئینے نصب ہیں جن میں موڑ کاٹتے وقت سامنے سے آنے والی گاڑی دکھائی دیتی ہے۔ بارش میں ان سڑکوں پر پھسلن بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

سلمان اگرچہ ماہر ڈرائیور تھا لیکن اس خطرناک پہاڑی علاقے میں اس نے کبھی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ گرجتے برستے بادلوں کی آواز فضا کا کلیجہ دہلانے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی خوف زدہ کر رہی تھی۔ ایک موڑ کاٹتے وقت سامنے سے آنے والی مسافر وین اچانک سامنے آ گئی۔ سلمان نے بوکھلا کر تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا دونوں گاڑیوں میں تصادم ہوتے ہوتے بچا اور مسافر وین ان کے قریب سے گزر گئی۔

"یار سلمان احتیاط سے گاڑی چلاؤ۔ یہاں کے موڑ بہت خطرناک ہیں اس لئے خاص کر موڑ پر محتاط رہو۔" تنویر نے خوف زدہ لہجے میں ہدایت کی۔

"بکومت میں زندگی میں پہلی مرتبہ گاڑی نہیں چلا رہا، وین اچانک سامنے آ گئی تھی اس لئے ایسا ہوا۔" سلمان نے کہا۔

"شہر کی سڑکوں اور یہاں کی سڑکوں میں بہت فرق ہے سلمان۔" عقبی نشست پر بیٹھا ہوا وقاص بولا۔ "اچھا گھبراؤ نہیں، اب میں محتاط رہوں گا۔" اس نے گاڑی کی رفتار مزید کم کردی۔

شام کے پانچ بجے ان کی گاڑی ایک ویران علاقے میں داخل ہوچکی تھی چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی بلندوبالا پہاڑ پراونچے اونچے درخت اوراردگرد کے حسین مناظران کا دل موہ رہے تھے وہ دلچسپی سے ان خوبصورت مناظر کو دیکھ رہے تھے بارش اب تک برس رہی تھی۔

اچانک ایک موڑ سے مڑتے وقت ان کی کار سلمان کے قابو سے باہر ہوگئی وہ سڑک کے کنارے لگی ریلنگ کوتوڑتی ہوئی نشیب میں گرنے لگی، تینوں دوستوں کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں اس بلندوبالا پہاڑ سے گرنے کا مطلب تھا انتہائی دردناک موت تھا۔ انہوں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں اورکلمہ پڑھنے لگے۔

ایک زوردار جھٹکا گاڑی کولگا اوروہ رک گئی۔ سلمان کا سر اسٹیئرنگ سے جالگا۔اس کی پیشانی پر چوٹ لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے تنویر کے سر پر بھی چوٹ لگنے سے گومڑ سا بن گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا انہوں نے آنکھیں کھولیں اور باہر دیکھا، گاڑی ڈھلوان میں ایک مضبوط درخت کے موٹے تنے سے ٹکرا کر رک چکی تھی خوش قسمتی سے پچھلی نشست پر موجود وقاص کو کسی قسم کی چوٹ نہ لگی تھی۔

سلمان نے اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا اور پیشانی کے زخم پر باندھنے لگا،تنویر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا،اسے سر میں شدید تکلیف ہورہی تھی اب وہ تینوں گاڑی میں بیٹھے خوف زدہ نظروں سے باہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔

گاڑی کے سامنے اوراردگرد کے شیشے ٹوٹ چکے تھے گاڑی کا بونٹ ٹیڑھا ہوچکا تھا سلمان نے اپنی طرف والا دروازہ کھولنا چاہا مگر نا کام رہا۔گاڑی کا دروازہ جام ہوچکا تھا۔یہ دیکھ کرتنویر نے اپنی طرف والا دروازہ کھولنا چاہا مگروہ بھی جام تھا۔ اسی وقت وقاص کی نظر اس درخت پر پڑی جس سے ٹکرا کر گاڑی رکی ہوئی تھی۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ درخت آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جھک رہا تھا۔ شاید زوردار تصادم کی وجہ سے اس کی جڑیں اکھڑ رہی تھیں۔

"وقاص پچھلی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرو، درخت کے گرتے ہی گاڑی سمیت ہمارے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔" سلمان چلایا۔

وقاص نے ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا اور باہر نکلنے کی کوشش کی اور پھر باہر نکل کر وہ چٹان نما پتھر پر قدم جما کر کھڑا ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی سلمان اورتنویر بھی باہر آگئے اردگرد درجنوں چیڑ کے درخت تھے۔ وہ درختوں اور چٹانوں کے سہارے نیچے اترنے لگے کئی دفعہ وہ نیچے گرتے گرتے بچے بالآخر ایک گھنٹے کی محنت کے بعد وہ ایک پتلے سے راستے پر آگئے، اس کی چوڑائی دو فٹ کے قریب تھی ان کی قسمت اچھی تھی کہ بارش اب رک چکی تھی۔

شام ڈھلتے ہی چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا وہ سست روی سے اس ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنے لگے ،چلتے چلتے وقاص نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا۔اسکرین پر نظر پڑتے ہی وہ مایوس ہوگیا۔" یہاں پر نیٹ ورک کام نہیں کررہا۔" وہ بولا۔ سلمان اورتنویر نے بھی اپنے اپنے موبائل فون نکالے،تنویر کے موبائل فون کی بیٹری ڈاؤن ہوچکی تھی جبکہ سلمان کے موبائل فون پر بھی نیٹ ورک کا مسئلہ تھا۔"اب ایک ہی حل ہے اس راستے پر چلتے رہو شاید کوئی مدد میسر آجائے۔" تنویر نے کہا۔

اچانک وقاص خوشی سے چلایا۔" وہ دیکھو سامنے ایک عمارت نظر آرہی ہے۔" انہوں نے دیکھا واقعی کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی قدیم عمارت نظر آرہی تھی، اب وہ تیز تیز قدموں سے پتھروں سے بنائی گئی اس قدیم عمارت کی طرف بڑھنے لگے عمارت کے اردگرد درجن کے قریب عجیب قسم کے پودے تھے۔جن میں نہایت ہی خوبصورت پھول لگے تھے ایسے پھول انہوں نے کبھی بھی نہیں دیکھے تھے وہ گلاب کے پھول سے ملتے ہوئے سرخ تھے۔

وقاص نے ہاتھ بڑھا کر بے اختیار ایک پھول توڑا، دوسرا ہی لمحہ انہیں خوف میں مبتلا کرگیا۔

پودے کی جس شاخ سے پھول توڑا تھا اس سے انسانی خون کے قطرے نکل رہے تھے۔اس نے کانپتے ہاتھ سے شاخ سے نکلنے والے خون کو انگلی سے چھوا اور بغور اسے دیکھنے لگا، چاند کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا وہ خون کا قطرہ ہی تھا، وہ خوف زدہ ہوکر دوسرے پودے کی طرف بڑھے وہاں سے پھول توڑا پھول توڑتے ہی خون کے قطرے پودے کی شاخ سے ٹپکنے لگے یار یہ تو انسانی خون لگتا ہے! لگتا ہے اس جگہ آسیب کا سایہ ہے۔"

وقاص بہت گھبرایا ہوا تھا تنویر بھی خوف زدہ نظر آرہا تھا جبکہ سلمان کچھ حوصلے والا ثابت ہوا تھا۔"تم لوگ کہاں ہو آج کے جدید دور میں اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔" سلمان کو غصہ آگیا تھا۔

"اگر یہاں آسیب یا کوئی ماروائی قوت نہیں تو تم بتاؤ جہاں سے ہم نے عجیب وغریب پھول توڑا ہے۔ اس شاخ سے انسانی خون کیوں ٹپک رہا ہے۔" تنویر نے اپنی دلیل پیش کی۔

"اس کی بھی ضرور کوئی وجہ ہوگی ہوسکتا ہے یہاں کی زمین میں کوئی خرابی ہو،ان پھول پودوں کے علاوہ کسی دوسرے پودوں کو چیک کرتے ہیں۔"

وہ تینوں چیڑ کے ایک درخت کی طرف بڑھے۔ سلمان نے ہاتھ بڑھا کر ایک چھوٹی سی ٹہنی توڑی ان کی تشویش میں اضافہ ہوگیا اس درخت کی شاخ سے خون نہیں نکلا تھا اب وہ ایک اسی قسم کے دوسرے پھول کے پودے کی طرف بڑھے سلمان نے جیسے ہی پھول توڑا ان کے دل دھک سے رہ گئے یہاں سے بھی خون بہہ رہا تھا اب سلمان بھی خوف زدہ ہوچکا تھا۔"تم لوگ سچ کہتے ہو یہاں آسیب کا سایہ ہے واپس چلو۔" سلمان خوف زدہ لہجے میں بولا۔"اس اندھیرے میں واپسی کا سفر حماقت ہوگا چاروں طرف پھسلن ہے۔" وقاص بولا۔

"ایسا کرتے ہیں اس عمارت میں پناہ لیتے ہیں۔" وقاص بولا۔اب وہ تینوں عمارت کے دروازے پر جا پہنچے۔ لوہے کا زنگ خوردہ دروازہ کھلا ہوا تھا دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوگئے وسیع وعریض صحن سے گزرتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ چاروں طرف جالے لگے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت سالوں سے ویران پڑی ہو، اندھیرے کی وجہ سے وہ بمشکل دیکھ پارہے تھے۔

"سلمان تمہارے موبائل میں ٹارچ ہے اسے روشن کرلو۔" تنویر نے مشورہ دیا اور سلمان نے جیب سے موبائل نکال کر ٹارچ روشن کرلی۔

وقاص نے عمارت کے اندر جانے کے لئے لکڑی کے بوسیدہ دروازے کو دھکیلا وہ دھڑکتے دل سے عمارت کے اندر داخل ہوگئے ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ بلند آواز سے قہقہوں کی آواز سنائی دی، تینوں نے آواز کی سمت دیکھا تو ان کے دل اچھل کر حلق میں آگئے وہ اپنی جگہ خوف سے منجمد ہوگئے ان کے سامنے کفن میں ملبوس چار بھیانک صورت افراد کھڑے تھے جن کے سامنے کے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے تھے۔ان چاروں نے قہقہے لگاتے ہوئے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

"بھاگو۔" وقاص چلایا۔

اسی وقت ایک کفن پوش مردے نے گیند نما کوئی چیز فرش پر پھینکی،اس گیند نما چیز سے دھواں سا نکلا۔ایک ناگوار سی بو ان کے دماغ پر چھا گئی اور وہ تینوں ہوش وحواس سے بیگانے ہوگئے۔

سلمان کو ہوش آیا تو وہ ایک تاریک کمرے میں کھڑا تھا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ کوشش کے باوجود کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ کوئی بھی حرکت کرنے سے قاصر ہے،اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولنا چاہا۔مگر یہ بھی اس کے لئے ناممکن تھا گویا وہ ہلنے جلنے اور بولنے کے قابل نہ رہا تھا البتہ وہ صرف سوچ سکتا تھا وہ سوچنے لگا کہ کونسی جگہ ہے، ان کفن پوش

بھیانک مردوں نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا ہے کہ وہ ہل جل نہیں سکتا، نہ ہی بول سکتا ہے۔ اس کے دو دوست اس وقت کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں کہیں وہ مرتو نہیں گئے؟ قبر بھی تو اسی طرح تاریک ہوتی ہے۔"

اچانک دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کمرے میں ایک دم روشنی ہوگئی۔ جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو اس کے سامنے پانچ کفن پوش مردے کھڑے تھے، چار مردے تو وہی بھیانک صورت تھے جنہیں اس نے بے ہوش ہونے سے قبل دیکھا تھا پانچویں کا چہرہ کفن سے ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں ظاہر تھیں ان مردوں کے عقب میں جو منظر تھا اسے دیکھتے ہی ڈر اور خوف سے اس کے دل کی دھڑکن تھمنے لگی۔ تقریباً چار فٹ کے قریب بڑے بڑے دو قد آور گملوں میں بغیر سر کے دو انسانی جسم دبے تھے ان کی گردن میں سر کی جگہ اس عجیب قسم کے پھولوں کے پودے کی شاخیں گڑی ہوئی تھیں یہ وہی عجیب قسم کا پودا تھا جو اس نے عمارت سے باہر دیکھا تھا۔ ساکت ہونے کے باوجود خوف سے اس کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا۔

سلمان صرف سامنے کے مناظر ہی دیکھ سکتا تھا اس کی آنکھ کی پتلیاں ایک ہی جگہ پر رکی ہوئی تھیں چاروں خوف ناک مردے اپنی جگہ پر خاموش کھڑے تھے۔ پانچواں چلتا ہوا اس کے قریب آیا "تم ضرور سوچ رہے ہوگے کہ تمہارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں کس جرم کی سزا دی جارہی ہے؟ میں تمہیں کوئی سزا نہیں دے رہا بلکہ تم امر ہونے والے ہو۔ ایک انسان کی زندگی ہوتی ہی کتنی ہے، تیس سال، چالیس سال اور زیادہ سے زیادہ پچاس سال اور ہوسکتا ہے وہ اس سے بہت پہلے کسی ٹریفک حادثے میں مرجائے یا کسی مہلک بیماری کی وجہ سے ہلاک ہوجائے کرنٹ لگنے سے دریا یا سمندر میں ڈوب جانے سے یا کسی کے ہاتھوں قتل ہوجانے سے یا کسی بھی حادثاتی موت کی صورت میں انسان وقت سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے میں سائنسی طریقے سے یہاں بھولے بھٹکے آنے والوں کو اس عجیب قسم کے پھول کے پودے میں تبدیل کردیتا ہے یہ میرا ایجاد کردہ خاص قسم کا پودا ہے جو کئی برسوں تک صحیح سلامت رہتا ہے۔ تمہیں اس حالت میں یہاں کھڑے چھبیس گھنٹے گزر چکے ہیں ان چھبیس گھنٹوں کے دوران ہر چار گھنٹے بعد تمہیں خاص قسم کا انجکشن لگایا جاتا رہا ہے اب سے کچھ دیر بعد تمہیں آخری انجکشن لگایا جائے گا اور پھر تم سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

تمہارا سر گردن کے اوپر سے بڑی نفاست سے کاٹ کر اس پودے کی شاخ کو تمہاری کٹی ہوئی گردن میں پیوست کردیا جائے گا اور پھر تمہیں عمارت سے باہر زمین میں گاڑ دیا جائے گا، اس پودے کی جڑیں تمہارے جسم میں بڑھتی ہوئی پھیل کر زمین میں پیوست ہوجائیں گی اور پھول کا یہ پودا بڑھتا چلا جائے گا، یہ جو گملوں میں بغیر سر کے انسانی جسم ہیں یہ تمہارے ساتھیوں کے ہیں، ان کے جسم میں پودے کی پیوندکاری کی جاچکی ہے اور اب تمہاری باری ہے، اب لگے ہاتھوں اپنا تعارف بھی کروادوں۔" میں صدیوں پرانے ایک سائنسدان کی روح ہوں اور یہ بھوت میرے معاون ہیں، یہاں مجھے ڈاکٹر بھوت کہا جاتا ہے اور یہ عمارت بھوت محل کہلاتی ہے اس کی ڈراؤنی باتیں سن کر سلمان اندر ہی اندر لرز اٹھا۔ پھر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں موجود سرنج سلمان کے جسم میں اتار دی سلمان کو ذرا برابر بھی تکلیف یا درد نہ ہوا اس کا جسم بالکل بے حس و حرکت ہوچکا تھا، چند لمحوں بعد اس کے ذہن پر تاریکی چھانے لگی۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف ایک یلو کیب شہر کی پررونق سڑک سے گزر رہی تھی ٹیکسی کی عقبی نشست پر خالد اپنی بیوی فائزہ کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اچانک فائر کی ہولناک آواز فضا میں گونجی، ٹیکسی بری طرح لہرائی اور دائیں سمت چلتے ہوئے ایک ٹرالر سے ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچی، گولی ان دونوں کے بالکل قریب

سے گزرتی ہوئی نکل گئی، خوف سے ان دونوں کا چہرہ زرد پڑ گیا، خالد نے فائزہ کا ہاتھ تھاما اور عقبی نشست پر جھکنے کے سے انداز میں لیٹ گیا، گولی ایک موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے شخص کی رائفل سے نکلی تھی، یہ شہر کی مصروف ترین سڑک تھی نشانہ خطا ہوتے دیکھ کر موٹر سائیکل سوار تیزی سے فرار ہوگئے، ٹیکسی ڈرائیور نے خالد کے کہنے پر ٹیکسی فٹ پاتھ کے قریب روکی اس نے سو روپے کا نوٹ ڈرائیور کی طرف بڑھایا اور بیوی کا ہاتھ تھام کر ٹیکسی سے باہر نکل گیا۔

"اس سے پہلے کہ پولیس آجائے یا حملہ آور پلٹ کر ہم پر وار کریں یہاں سے جلدی سے نکلو۔" وہ دونوں سڑک کے قریب ایک نزدیکی گلی میں جا گھسے مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک دوسری سڑک پر آنکلے، سامنے سے آتی ایک ٹیکسی کو اس نے ہاتھ دے کر روکا اور پھرتی سے فائزہ سمیت پچھلی نشست پر ڈھیر ہوگیا۔ "ریلوے اسٹیشن چلو۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور فائزہ کی سمت دیکھا۔ ڈرائیور کی وجہ سے دونوں میں کوئی گفتگو نہ ہوئی انہوں نے یہ سفر خاموشی سے طے کیا، اسٹیشن پہنچ کر خالد نے ٹکٹ خریدا اور ویٹنگ روم میں موجود فائزہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ "یہ آپ نے کیا کیا، وہاں جا کر ہم کیا کریں گے۔" فائزہ نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"فائزہ اس شہر میں ہم تمہارے باپ اور بدمعاش کزن کی پہنچ سے دور نہیں وہ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہیں دوبار تو ہم قاتلانہ حملوں سے بچ گئے۔ تیسری بار بچنا مشکل ہے۔" خالد بولا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلیں۔

ماضی کے واقعات اس کے ذہن کے پردۂ اسکرین پر چلنے لگے۔ خالد کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کے والد عنایت اللہ ایک محنت کش انسان تھے ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا خالد پڑھ لکھ کر معاشرے میں اچھا مقام حاصل کرے، اس خواب کو تعبیر دینے کے لئے انہوں نے دن، رات محنت کی،

ان دنوں خالد سیکنڈ ائیر میں تھا جب سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار سے ایکسیڈنٹ ہوگیا، وہ کار فائزہ چلا رہی تھی، خالد کو معمولی چوٹیں لگی تھیں اس کے باوجود اصرار کر کے اسے اسپتال لے گئی بالکل فلمی سچویشن تھی، دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور آپس میں پیار ہوگیا دونوں نے اپنے جذبات دل میں چھپائے رکھے اقرار کی دونوں میں ہمت نہ تھی۔

چند ملاقاتوں کے بعد ایک روز فائزہ نے لڑکی ہونے کے باوجود پہل کی اس طرح دونوں کے بیچ محبت کا پودا تناور درخت بن گیا ان ہی دنوں خالد کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے، ان کے گھر صف ماتم بچھ گئی اور پھر کچھ ہی ہفتے بعد اس کی والدہ مریم بی بی بھی ایک روز ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں۔

خالد کے مستقبل کے حوالے سے سوچ گئے سب خواب بکھر چکے تھے۔ وہ دن رات تاریک کمرے میں پڑا اپنے والدین کو یاد کر کے روتا رہتا۔ ان دنوں فائزہ کالج سے اس کے فلیٹ پر آجاتی۔ رفتہ رفتہ خالد کی حالت سنبھلنے لگی دونوں کے درمیان بڑی پاکیزہ محبت تھی تنہائی کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے دور رہتے تھے پھر ایک روز فائزہ اسے اپنے والد ضیاء ہمدانی سے ملوانے لے گئی۔ تب خالد پر یہ انکشاف ہوا کہ فائزہ کے والد ایک ملٹی نیشنل سرمایہ کار تھے انٹرنیشنل سرکل میں بھی ان کا نام بڑی عزت رکھتا تھا اندرون ملک ہی کیا بیرون ملک میں بھی ان کی دولت کے چرچے تھے۔ انکا اپنا ایک پرائیویٹ بوئنگ سیون فورسیون تھا۔ اس کے پرسنل اسٹاف میں بہترین افراد شامل تھے ان شاندار قسم کا آفس جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھا کاریڈور سے لے کر آفس تک جگہ جگہ A-C کی ٹھنڈک تھی۔ وہ جب ضیاء ہمدانی کے آفس میں داخل ہوا تو فائزہ کے والد سرد نگاہوں سے خالد کو گھورتے ہوئے فائزہ سے کہا۔ "بیٹی تم ذرا باہر جاؤ مجھے خالد سے ضروری بات کرنی ہے۔"

''فائزہ شرماتی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔ ''مسٹر خالد مخمل میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔ تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ میرا کاروبار کتنا وسیع ہے میں کڑوروں روپے ایک ہی روز میں کمالیتا ہوں، میری بیٹی کے ایک روز کا خرچہ بھی تم اپنی زندگی بھر کی کمائی سے ادا نہ کرسکو گے۔ تمہیں جتنا روپیہ چاہئے لے لو اور فائزہ کی زندگی سے جتنا دور جاسکتے ہو چلے جاؤ، یہ نہ ہو کہ تمہارا انجام بہت برا ہو۔ اور ہاں ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کی میری بیٹی کو ہوا نہ لگے، وہ اگرچہ میری اکلوتی اولاد ہے لیکن میں اسے کھیلنے کے لئے اس کے ہاتھوں میں دہکتا ہوا انگارہ نہیں دے سکتا۔''

''سیٹھ صاحب ہر انسان یکاؤ مال نہیں ہوتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ فائزہ آپ جیسے گھمنڈی دولت مند کی بیٹی ہے تو میں اس کی طرف کبھی نہ بڑھتا مجھے دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی بیٹی کو سمجھائیں کہ وہ مجھے بھول جائے۔'' وہ غصے سے لال بھبھوکا چہرہ لئے دفتر سے باہر نکل گیا۔

باہر موجود فائزہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اسے غصے کے مارے نظرانداز کرکے اپنے گھر آ گیا کچھ روز بعد فائزہ ایک سوٹ کیس سمیت اس کے گھر آ گئی۔ ''یہ سب کیا ہے فائزہ؟''

''خالد میں اپنا گھر چھوڑ آئی ہوں ڈیڈی میرے اوباش کزن پرویز کے ساتھ میری شادی کرانا چاہتے ہیں۔'' وہ رونے لگی۔ خالد کے اوسان خطا ہوگئے اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک دولت مند باپ اثر ورسوخ کا مالک دوسری طرف پرویز تھا جو ایک کرمنل گینگ کا لیڈر تھا۔ غنڈا گردی، ڈکیتی ہر قسم کے جرائم میں ملوث۔ بہرحال کچھ بھی اب اسے بھگتنا تھا گھر کو تالا لگا کر فائزہ کے ہمراہ اپنے شادی شدہ دوست شاہ رخ کے گھر جا پہنچا ان دونوں کی روداد سن کر شاہ رخ کے بھی ہوش اڑ گئے اس نے اپنے ایک دوست وکیل کی مدد سے انکی کورٹ میرج کروادی۔ وہ کورٹ سے نکل کر باہر آ رہے تھے کہ ایک بلیک ہنڈا اکارڈ سے خالد پر آٹومیٹک رائفل سے برسٹ مارا گیا وہ خوش قسمتی سے بچ نکلا اس فائرنگ سے ایک راہ گیر مارا گیا، وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے ایک دوسرے دوست کے گھر جا پہنچے آج وہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلے تھے کہ ٹیکسی پر فائرنگ ہوئی اب وہ اپنی جان بچانے کے لئے یہ شہر چھوڑ کر کوہسار مری جا رہا تھا جہاں خالد کا کلاس فیلو دوست اپنی فیملی کے ہمراہ رہتا تھا۔

ٹرین کی آمد کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی وہ بھی فائزہ کے ہمراہ ٹرین میں سوار ہوگیا دوسرے روز شام کے 4 بجے وہ راولپنڈی پہنچ چکے تھے تھکن کی وجہ سے قریبی ہوٹل میں رہے اور صبح سویرے وہاں سے نکل گئے اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے وہ دونوں اس پرائیویٹ ٹیکسی کی عقبی نشست پر موجود تھے ان کی ٹیکسی ایک دشوار گزار پہاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔ اچانک ٹیکسی کے بریک چرچرائے اور تصادم کی آواز سنائی دی انہوں نے دیکھا ان کی ٹیکسی نے سڑک پر کھڑی ایک وائٹ ہنڈا کار کو ٹکر ماری تھی، کار بلندی سے نیچے گرنے لگی ان کی ٹیکسی بھی تصادم کے نتیجے میں سڑک کے کنارے نصب ریلنگ کو توڑتی ہوئی نیچے کی طرف جھول رہی تھی بڑی خطرناک صورتحال تھی کسی بھی لمحہ وہ ٹیکسی سمیت اس بلند وبالا پہاڑ سے نیچے ہوتے۔

چوبیس سالہ صنوبر اپنے چھوٹے بھائی فیصل کے ساتھ کار میں اس بلند وبالا پہاڑ پر سفر کر رہی تھی صنوبر کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ اس کا بھائی سلمان تین روز قبل مری اپنے دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گیا تھا اس کے دو دوست وقاص اور تنویر بھی اس کے ہمراہ تھے شادی کی تقریب سے نکلتے وقت اس نے گھر فون کرکے اپنے وہاں سے روانہ ہونے کی اطلاع دی تھی۔ رات گئے تک جب وہ نہ پہنچا تو اس کی تلاش شروع ہوئی ان کے والد فیض احمد ریٹائرڈ DSP تھے پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں ان کی ہنڈا اکارڈ سڑک سے نیچے ایک درخت سے ٹکرائی ہوئی ملی، گاڑی کی حالت بہت خراب تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ تو وہ زندہ حالت میں ملے تھے اور نہ ہی ان کی لاشیں ملی تھیں، دو روز کی تفتیش کے بعد بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملا، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں زمین نگل گئی یا آسمان نگل گیا۔

فیض صاحب بیٹے کے صدمے سے نڈھال تھے جب کہ ان کی بیوی کا رو رو کے برا حال تھا صنوبر سے ماں باپ کا حال دیکھا نہیں جا رہا تھا اس کے علاوہ بھائی سے محبت فطری بات تھی وہ گھر پر بتائے بغیر نکلی۔ 18 سالہ فیصل بھی اصرار کرکے اس کے ہمراہ ہولیا۔ حادثے والی جگہ گاڑی روک کر وہ نیچے اترے چند قدم چل کر انہوں نے نیچے جھانکا یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سلمان کی گاڑی نیچے گری تھی۔

اچانک کسی گاڑی کے بریک چرچرائے گاڑیوں کے ٹکراؤ کی آواز سن کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک پرائیویٹ ٹیکسی ان کی ہنڈا کارڈ سے ٹکرا چکی تھی اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہنڈا کارڈ بلندی سے نیچے گر گئی ٹیکسی بھی ٹکرا کر بے قابو ہو کر نیچے کی طرف جھول رہی تھی۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیکسی کے قریب پہنچے.....

''فیصل ڈگی پر اپنا وزن ڈالو۔'' صنوبر چلائی دونوں بہن بھائی کار کو پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''آپ لوگ آہستگی سے باہر آجائیں۔'' وہ چلائی۔

''سب سے پہلے فائزہ گھبرائی ہوئی باہر نکلی اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلا۔ آخر میں خالد باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی ٹیکسی ایک دھماکے سے نشیب میں گر گئی۔

''میں برباد ہوگیا۔'' ڈرائیور دھاڑیں مار کر واویلا مچانے لگا۔

''خاموش رہو۔ شکر نہیں کرتے تم لوگوں کی زندگی بچ گئی۔'' صنوبر نے اسے ڈانٹا۔

''آپ لوگ گاڑی اس طرح سڑک کے کنارے کھڑی کرکے کھڑے تھے قصور آپ لوگوں کا ہے وہ تو شکر ہے ہم بال بال بچے۔'' فائزہ اس پر بگڑ گئی۔

''میڈم نقصان ہمارا بھی ہوا ہے، لاکھوں روپے کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں اس کے باوجود ہم سکون سے کھڑے ہیں۔'' فیصل بولا۔

''میرا سوٹ کیس بھی ٹیکسی میں تھا میرے اکاؤنٹ سے نکالے 10 لاکھ بھی اسی میں تھے۔'' فائزہ چلائی۔

''خاموش رہو اللہ بہتر کرے گا۔'' خالد نے اسے تسلی دی۔

''آئی ایم سوری! دراصل کچھ دن پہلے میرے بھائی اور اس کا دو دوستوں کی گاڑی کا حادثہ اس مقام پر ہو چکا ہے، تباہ حال گاڑی ملی لیکن ان تینوں کا سراغ نہیں ملا۔ آج میں انکی تلاش میں اپنے بھائی فیصل کے ساتھ آئی تھی۔'' صنوبر نے وضاحت کی۔

''اوہ! یہ سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ کرے آپ کا بھائی اور ان کے دوست صحیح سلامت مل جائیں۔'' خالد خلوص دل سے بولا۔

''ایسا کرتے ہیں نیچے چل کر جائزہ لیتے ہیں ان کا سوٹ کیس بھی ہوسکتا ہے ٹیکسی سے مل جائے، بھائی کی تلاش بھی کرلیتے ہیں۔'' فیصل نے کہا۔ ''لیکن یہاں سے اترنے میں رسک ہے۔'' خالد بولا۔

''سر یہاں چند قدم کے فاصلے پر تین فٹ کے قریب ایک چھوٹا سا راستہ نیچے کی طرف جاتا ہے جس سے ہم نیچے جاسکتے ہیں۔'' فیصل بولا۔

''لیکن یہاں سننے میں آیا ہے کہ بھوتوں کا سایہ بھی ہے اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ ڈر کے مارے اس طرف نہیں جاتے۔ ڈرائیور نے کہا۔

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' صنوبر نے اسے گھورا ''وہ جی میں یہاں قریبی گاؤں دھنوئی میں رہتا ہوں۔ رات کو اکثر یہاں عجیب قسم کی آوازیں آتی ہیں، سنتے ہیں کہ نیچے ایک قدیم عمارت ہے یہاں جو جاتا ہے واپس لوٹ کر نہیں آتا، ہوسکتا ہے آپ کے بھائی وہاں گئے ہوں اور بھوتوں کا شکار ہوگئے

ہوں۔'' ڈرائیور بولا۔

''یہ کیا بکواس ہے آج کل کے جدید دور میں بھوت پریت کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔'' فیصل بولا۔

''دیکھئے میں آدھے راستے سے واپس آجاؤں گا، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں گاڑی کی خیر ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔'' ڈرائیور خوف زدہ لہجے میں بولا۔

اب وہ نشیب میں اترتے راستے پر چل رہے تھے کچھ دیر بعد ڈرائیور واپس لوٹ گیا اور وہ آگے بڑھنے لگے قریب ہی ایک بڑے سے درخت کے تنے سے ٹکرائی ٹیکسی ٹوٹی پھوٹی نظر آئی۔ لیکن وہ ایسی دشوار جگہ تھی کہ جہاں چڑھنا کسی کے بس میں نہ تھا چند لمحے رکنے کے بعد وہ دوبارہ آگے بڑھنے، اب پتھروں سے بنی قدیم عمارت انہیں دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ ''چلو اس عمارت تک چلتے ہیں۔'' صنوبر پرجوش انداز میں بولی۔

''یہ دیہاتی لوگ ویسے ہی قصے کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔'' فیصل منہ بناتے ہوئے بولا۔

اچانک موسم کے تیور بدل گئے۔ بادل گرجنے سے بارش شروع ہوگئی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''ایسا کرو واپس چلتے ہیں۔'' فائزہ بولی۔

''واپسی کا سفر بہت زیادہ ہے بارش کی وجہ سے پھسلن ہو رہی ہے، بارش رکنے تک عمارت میں پناہ مل سکتی ہے۔'' خالد نے کہا۔ اب وہ بارش میں بھیگتے ہوئے عمارت کے گیٹ پر جا پہنچے خالد نے دروازہ دھکیلا چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہ چاروں عمارت میں داخل ہوگئیں، برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اب ہوہ بارش میں بھیگنے سے محفوظ ہو چکے تھے۔ اندرونی دروازہ کھول کر کوریڈو میں داخل ہوگئے آمنے سامنے قطار میں درجن بھر کمرے تھے جن کے دروازوں پر زنگ آلود تالے تھے۔ ''حیرت ہے اس ویرانے میں یہ عمارت کس نے بنائی، زنگ آلود تالوں سے تو یہ ظاہر ہے کہ یہاں برسوں سے کوئی آیا ہی نہیں۔'' صنوبر بڑبڑائی۔

''ویران عمارتوں میں ہی اکثر بھوت پریت اور جنات کا سایہ ہوتا ہے۔'' فائزہ بولی۔

''تم اس جدید دور میں توہم پرستی کا شکار ہو۔'' صنوبر منہ بناتے ہوئے بولی۔

پتہ نہیں یہ بارش کب رکے گی۔ اس علاقے کا موسم بھی ایک دم تبدیل ہو جاتا ہے پتہ ہی نہیں چلا اور ایک دم بارش ہوگئی اگر ہمیں علم ہوتا کہ بارش ہوگی تو کم از کم ہم میاں بیوی اس سڑک سے نیچے اس ویرانے میں نہ آتے۔'' فائزہ دائیں بائیں کمروں کے مقفل دروازوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپی ٹھنڈ بہت ہے میں کسی طرح کسی ایک کمرے کا تالا توڑتا ہوں۔ یہاں کی نسبت کمرے گرم ہوں گے۔'' فیصل نے کہا اور عمارت سے باہر نکل گیا کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط پتھر تھا۔ اس نے تیسرے نمبر والے کمرے کے تالے کو پتھر سے توڑنے کی کوشش کی زنگ آلود تالا کھل گیا، وہ دروازہ کھول کر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کمرے کے فرش پر درجنوں انسانی کھوپڑیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں بعض کھوپڑیاں بہت پرانی ہونے کی وجہ سے گوشت پوست سے محروم تھیں، کمرے میں درجنوں موٹے موٹے چوہے اور چھپکلیاں ان کھوپڑیوں کے گوشت سے ضیافت فرما رہی تھیں اور انتہائی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

کمرے کے اندرونی منظر پر نظر پڑتے ہی فائزہ خوف سے چیخ پڑی اس کے مقابلے میں صنوبر حوصلہ مند ثابت ہوئی اس نے خالد اور فیصل کی طرح ناک پر ہاتھ رکھ کر منہ پھیر لیا فیصل نے دروازہ واپس بند کر دیا۔ ''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی وہ ڈرائیور سچ کہہ رہا تھا، یہاں بھوت پریتوں کا سایہ ہے اس سے پہلے کہ ان کھوپڑیوں میں ہمارے سروں کا اضافہ ہو ہمیں اس عمارت سے نکل جانا چاہئے ایسی بھیانک موت سے بارش میں بھیگ کر نمونیہ سے مرنا بہتر ہے۔'' فائزہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

باوجود سنگین حالات کے صنوبر کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی جبکہ دوسروں کے چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ''فیصل اس کے ساتھ دوسرے کمرے کا تالا بھی توڑ دو۔ وہ عجیب انداز سے بولی۔ فیصل نے پتھر سے دوسرے کمرے کا زنگ آلود تالا بھی توڑ دیا۔ اس کمرے میں قالین بچھا تھا دائیں سمت ٹرالی پر کیا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ کمپیوٹر کے قریب ہی ایک پلاسٹک کی کرسی پڑی تھی۔ ''لگتا ہے یہاں کے بھوت نفاست پسند اور کمپیوٹر سے واقفیت رکھتے ہیں۔'' صنوبر نے فائزہ کی سمت دیکھا۔

''ہوسکتا ہے یہ سب عمارت کے مالکان کا ہو جو مرکھپ چک ہوں یا یہاں سے کہیں اور چلے گئے ہوں۔'' خالد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''چلو اب یہاں سے دوسرے کمرے کی تلاشی لیتے ہیں۔'' صنوبر بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ فیصل نے پتھر سے تیسرے کمرے کے تالے پر پہلی ضرب لگائی تھی کہ کوریڈور میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ان چاروں نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو کمزور دل فائزہ بے اختیار چیخ پڑی۔

☆.....☆.....☆

ایک سوزوکی کار تیز رفتاری سے اس پہاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی جمیل اور شکیل کے چہرے خوف سے زرد پڑ رہے تھے وہ دونوں بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔

ان کے خوف زدہ ہونے کی وجہ پرویز اور اس کے چار ساتھی تھے۔

شکیل اور جمیل دونوں بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ افراد بھی تھے وہ پرویز کے گینگ میں شامل تھے۔ شہر میں انہوں نے پرویز کے ساتھ مل کر بینک ڈکیتی کی، اس واردات میں ان کے ہاتھ ایک کروڑ کی رقم لگی۔ ابھی وہ رقم والا بیگ لے کر فرار ہو ہی رہے تھے کہ پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں اس فائرنگ سے ایک پولیس افسر ہلاک ہوگیا حالات سنگین ہو چکے تھے پولیس کا گھیراؤ رفتہ رفتہ ان کے گرد تنگ ہو رہا تھا مجبوراً انہیں فرار کی راہ اختیار کرنی پڑی وہ مختلف سمتوں میں بھاگے تھے۔ رقم والا بیگ شکیل کے ہاتھ میں رہ گیا، کروڑوں روپے کی رقم نے ان کی نیت بدل دی۔ وہ بجائے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے ایک سوزوکی کار والے سے گاڑی چھین کر اس پہاڑی علاقے کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی بدقسمتی کہ راستے میں پرویز اور اس کے ساتھیوں کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی وہ بلا ناگہانی کی طرح اپنی جیپ میں ان کے پیچھے میں لگ گئے۔ ایک جگہ پر شکیل نے جیپ پر فائرنگ کی، گولی جیپ کے اگلے ٹائر پر لگی، جیپ کا ٹائر ناکارہ ہونے کے سبب پرویز اور تینوں ساتھی ان کا تعاقب نہ کر سکے۔ ان کی گاڑی اس دشوار پہاڑی علاقے سے ابھی کافی فاصلے پر تھے کہ گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔

شکیل اب محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا کافی دور آجانے کے باوجود وہ دونوں بار بار پلٹ کر دیکھ رہے تھے ایک طرف تو پرویز اور اس کے ساتھی کا خطرہ تھا تو دوسری طرف پولیس کا ڈر تھا اب تو ایک پولیس آفیسر کا قتل بھی ان کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔

بدصورت

ایک افریقی اپنے بچے کے ساتھ بس میں چڑھا۔ کنڈیکٹر: ''اتنا بدصورت بچہ آج تک نہیں دیکھا۔'' افریقی کو بہت غصہ آیا۔ بس میں بیٹھے ایک سردار نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

افریقی۔ ''کنڈیکٹر نے میری بے عزتی کی ہے۔''

سردار: ''جاؤ مارو کم بخت کو..... اپنا بندر مجھے پکڑا دو۔''

(تارہ-لاہور)

اچانک ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

''اس کو بولتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑنا۔ ابھی بارش کی آفت کیا کم تھی کہ گاڑی کا فیول بھی ختم ہوچکا تھا۔'' شکیل اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اب کیا کریں گاڑی میں بھی بیٹھے نہیں رہ سکتے، گاڑی والے نے گاڑی چھن جانے کی اطلاع اب تک پولیس میں کردی ہوگی۔'' جمیل کے لہجے میں تشویش تھی وہ دونوں رقم والا بیگ اٹھا کر باہر نکلے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ رقم جس بیگ میں تھی وہ واٹر پروفا تھا۔ ''وہ دیکھو نشیب کی طرف ایک چھوٹا سا راستہ جارہا ہے۔'' شکیل حیرت بھرے لہجے میں بولا اور جمیل کا ہاتھ پکڑ کر اس راستے پر چلتا ہوا نیچے اترنے لگا کافی تنگ اور دشوار راستہ تھا وہ چلتے ہوئے ایک قدیم عمارت کے قریب جا پہنچے عمارت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ''اندر چلو کم از کم بارش سے تو محفوظ رہیں گے دوسرا یہ جگہ آبادی سے دور ہے یہاں پولیس کا ڈر بھی نہیں ہوگا۔'' وہ دونوں چلتے ہوئے برآمدے میں جا پہنچے۔

''ایک منٹ رکو۔'' جمیل نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟'' شکیل نے پوچھا۔

''اندر سے کسی کی باتوں کی آواز آرہی ہے۔'' دونوں نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لئے اور دبے قدموں اندر داخل ہوگئے اندر دو لڑکیاں اور اسمارٹ سے دو نوجوان موجود تھے ایک کے ہاتھ میں پتھر تھا جس سے وہ دروازے پر لگا تالا توڑ رہا تھا اسی وقت ان چاروں نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور لڑکی ان کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر چیخ پڑی۔ ''خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا اور نہ ہی کوئی غلط حرکت کرے گا ورنہ مجبوراً ہمیں گولی چلانی ہوگی۔'' جمیل نے دھمکی دی۔

''تم لوگ کون ہو اور اس طرح ہم پر ریوالور تاننے کا کیا مطلب ہے؟'' صنوبر نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ موجود نہ تھی۔

''ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں، نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ ہے۔ فی الحال ہمیں یہاں پناہ چاہئے۔'' جمیل بولا۔

''لگتا ہے تم لوگ جرائم پیشہ ہو اور پولیس سے چھپتے پھر رہے ہو۔'' صنوبر نے درست اندازہ لگایا۔ ''اس بھاری بھرکم بیگ میں کیا ہے؟ چھینی ہوئی رقم یا زیورات۔'' اور وہ دونوں لڑکی کو دیکھتے رہ گئے کم بخت درست اندازہ لگا رہی تھی۔

''اپنی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان کو روکو، تم نے پولیس والوں کی طرح ہم پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔'' جمیل غصے میں آگیا۔

''تم لوگ اس کمرے کا دروازہ کیوں توڑ رہے تھے؟'' شکیل نے پوچھا۔

''ہماری گاڑیاں حادثے کا شکار ہوچکی ہیں ہم خود بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگئے، یہاں ہر کمرے پر تالے ہیں اس کمرے کا تالا توڑ ہی رہے تھے کہ تم لوگ'' فیصل منہ بناتے ہوئے بولا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر ایک طرف پھینکا۔

''پتھر اٹھا کر تالا توڑو مگر خیال رکھنا کوئی ہوشیاری مت دکھانا ہم دونوں کے ہاتھ میں ریوالور ہیں۔'' جمیل غرایا۔

فیصل نے پتھر اٹھا کر تالے پر زور آزمائی شروع کردی زنگ آلود تالا ٹوٹتے ہی فیصل نے دروازہ کھول دیا وہ دونوں ان چاروں کو ریوالور کی زد پر کمرے میں لے گئے یہ ہال نما کمرہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ بڑی بڑی لکڑی کی پیٹیاں رکھی تھیں جو کہ درجنوں کی تعداد میں تھیں۔ ''شکیل تم ان کا خیال رکھنا میں پیٹیوں کو چیک کرتا ہوں۔'' جمیل آگے بڑھا۔

''یہ پتھر مجھے دے دو۔'' وہ فیصل سے مخاطب تھا۔ فیصل نے اپنے ہاتھ میں موجود پتھر اسے تھمادیا۔ اس نے پتھر سے ایک پیٹی پر ضربیں لگائیں اندر تھیلوں میں پاؤڈر نما سفوف تھا اس نے ایک تھیلی نکالی اور تھوڑی سی پھاڑ کر سونگھی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اب وہ بے تابی سے دوسری پیٹی کی طرف بڑھا وہاں بھی یہی پاؤڈر تھا۔

جمیل لگاتار نصف درجن پیٹیاں چیک کرنے کے بعد ان کی طرف مڑا۔

''ان پیٹیوں میں اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن ہے اگر ہم کسی طرح یہ مال مارکٹ میں پہنچادیں تو کروڑوں پتی ہوجائیں گے۔'' خوشی کے مارے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''چلو اب باہر نکلو۔'' وہ سب کمرے سے باہر آگئے۔

''اب اس کمرے کا تالا توڑو۔'' جمیل پتھر فیصل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یار تالے توڑ توڑ کر میرے ہاتھ میں چھالے پڑ چکے ہیں تمہاری طرح خاندانی چور نہیں۔''

''بکواس بند کرو ورنہ تمہاری کھوپڑی میں روشن دان کھول دوں گا۔'' جمیل نے دھمکی دی۔

جمیل غصے سے اس کی طرف بڑھا اور فیصل نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر سے تالے پر زور آزمائی شروع کردی تالا ٹوٹتے ہیں اس نے جمیل کے حکم پر دروازہ کھولا اس کمرے میں درجن کے قریب بڑی بڑی پیٹیاں تھیں یہ بھی لکڑی کی تھیں جمیل نے فیصل کے ہاتھ سے پتھر لیا اور ایک بڑی پیٹی پر زور آزمائی شروع کردی جبکہ شکیل ریوالور تانے ان کی طرف کھڑا تھا۔ پیٹی کے اندر جھانکتے ہی جمیل حیرت زدہ رہ گیا۔ پیٹی میں جدید طرز کی رائفلیں موجود تھیں اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک رائفل نکال کر کندھے سے لٹکائی اور دوسری پیٹیوں کی طرف بڑھا۔ ''اسے اپنے پاس رکھو۔'' شکیل کو رائفل دینے کے بعد پیٹی سے ایک اور رائفل نکال کر کندھے سے لٹکائی اور دوسری پیٹیوں کی طرف بڑھا۔ ان پیٹیوں میں کارتوس اور جدید طرز کی مختلف اقسام کی پسٹلز موجود ہیں۔ اس نے اپنی رائفل میں میگزین لوڈ کیا۔ پھر شکیل سے رائفل لے کر اس کی رائفل بھی لوڈ کر کے اسے لوٹادی۔ ''چلو اب کمرے سے باہر نکلو۔'' جمیل نے حکم دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو یہ اسلحہ اور کروڑوں کی اعلیٰ درجے کی ہیروئن یہاں ایسے ہی پڑی ہوں گی یہ ضرور کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا مال ہے۔ جو ضرور کسی وجہ سے وقتی طور پر یہاں سے گئے ہوں گے، وہ واپس یہاں لوٹتے ہی ہم سمیت تم دونوں کا بھی کام تمام کردیں گے۔'' صنوبر سنجیدہ لہجے میں بولی۔ فائزہ اور خالد کے چہرے خوف سے تاریک ہوچکے تھے وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھے کہ یہ دونوں بہن بھائی اتنے سنگین حالات میں بھی پرسکون ہیں۔

''بے بی ہمیں ڈراؤ مت ہم کوئی معمولی انسان نہیں اب تو ہمارے پاس اسلحہ بھی وافر مقدار میں موجود ہے۔'' جمیل نے قہقہہ لگایا۔

دیگر کمرے تلاشی لینے پر خالی نکلے۔ آخری کمرے کے ساتھ ہی چھت پر جانے کے لئے سیڑھیاں موجود تھیں ''چلو سب چھت پر چلو۔'' جمیل نے انہیں رائفل کی نال سے دھکیلا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

بارش رک چکی تھی ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی وہ چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے۔ ''ارے وہ دیکھو اس عمارت کی پچھلی طرف خاصے فاصلے پر ایک اور عمارت موجود ہے۔'' شکیل حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ انہوں نے دیکھا واقعی اس عمارت سے کافی دور ایک دوسری عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ شکیل جھکے جھکے انداز میں دوڑتا ہوا چھت کے سامنے والے حصے میں آگیا۔ عمارت سے کچھ فاصلے پر چار افراد ہاتھوں میں رائفلیں تھامے اسی عمارت کی طرف آرہے تھے شکیل نے رائفل کی نال کا رخ عمارت کی طرف آنے والے افراد کی طرف کیا اور ٹریگر دبادیا۔ رائفل گرجی اس کی گولی آگے چلنے والے سیاہ چہرے والے شخص کے سینے میں لگی وہ سینے پر گولی کھا کر چیختا ہوا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا اس کے تینوں ساتھی پھرتی سے مختلف درختوں کی آڑ میں چھپ گئے۔ ''جمیل اور شکیل یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ رقم والا بیگ ہمارے حوالے کردو ورنہ اس عمارت کو تمہارا قبرستان بنادوں گا۔'' ایک درخت کی آڑ سے کسی نے انہیں بلند آواز میں دھمکی دی۔

"پرویز تم سانپ ہو۔" میں تم پر بھروسہ کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔" شکیل چلایا اور ساتھ ہی پرویز پر فائر کردیا، پرویز درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے گولی سے محفوظ رہا اس نے اور اس کے دونوں ساتھیوں نے آواز کی سمت برسٹ مارے۔" شکیل تم جھکے ہوئے انداز میں چلتے ہوئے پیچھے آ کر ان چاروں کو کور کرو، پرویز لوگوں کو میں سنبھالتا ہوں یہ تمہارے بس کے نہیں۔" جمیل اس سے بولا۔

شکیل جھکے ہوئے انداز میں دوڑتا ہوا فیصل وغیرہ کے سر پر جا پہنچا اور ان پر رائفل تان کر ایک طرف بیٹھ گیا جبکہ جمیل وہاں پہنچ گیا جہاں چند لمحے قبل شکیل موجود تھا جمیل بہت ہوچکی ان کی چوکیداری اگر تم اجازت دو تو ان چاروں کو اوپر پہنچادوں۔" شکیل سفاک لہجے میں بولا۔

اسی وقت تینوں اطراف سے ان پر پے در پے فائر ہوئے شکیل جذبات میں آ کر گالیاں بکتے ہوئے اٹھا اور پرویز پر فائر کیا یہ اس کی پہلی اور آخری غلطی تھی جیسے ہی وہ کھڑا ہوا نیچے سے چلائی جانے والی گولی اس کے سر میں پیوست ہوگئی وہ بھیانک انداز میں چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ جمیل شکیل کو مرتا دیکھ کر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اور پے در پے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔

"مسٹر تم جذبات میں آ کر اپنے بھائی کی طرح غلطی کررہے ہو، اس طرح گولیاں ضائع کرنے سے کچھ بھی نہیں ملے گا اور تم خود اپنے بھائی کی طرح کسی اندھی گولی کا شکار ہوجاؤ گے۔ بہتر ہے ہدف کو نشانہ بناؤ۔" اپنی پشت پر صنوبر کی آواز سن کر اس نے اپنی گردن گھمائی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ شکیل والی رائفل صنوبر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی رائفل پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے رائفل چلانے میں مہارت حاصل ہے۔

"تت..... تم کوئی عام لڑکی نہیں؟ کون ہو تم؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پرویز اور اس کے ساتھیوں کا خوف چند لمحوں کے لئے اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

اب ایک نیا خطرہ اس کے سامنے تھا۔ "یہ جواب اور سوال بعد کے لئے سنبھال کر رکھو فی الحال ہمیں مل کر باہر موجود افراد کا مقابلہ کرنا ہوگا ہاں البتہ ایک بات سے تمہیں آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں میں DSP فیض احمد کی بیٹی ہوں اور میرا تعلق قانون نافذ کرنے والے ایک حساس ادارے سے ہے۔ لہٰذا کسی قسم کی حماقت کی کوشش کرکے اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالنا۔" صنوبر سنجیدگی سے بولی اور درخت کی آڑ سے نکل کر عمارت کی طرف بھاگ کر آنے والے گرانڈیل شخص پر پے در پے دو فائر کئے دونوں گولیاں اس شخص کے سینے پر عین دل کے مقام پر پیوست ہوگئیں۔ وہ بنا کوئی آواز نکالے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اپنے ایک اور ساتھی کو مرتا دیکھ کر پرویز جنونی ہوگیا اس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا، ایک گیند نما گول سی کوئی چیز اڑتی ہوئی چھت کی طرف آئی صنوبر اور جمیل نے چھت کی پچھلی طرف چھلانگ لگادی۔ گیند نما چیز جو کہ ہینڈ گرنیڈ تھا وہاں گرا جہاں چند لمحے قبل وہ دونوں موجود تھے۔

ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا اور گرد وغبار کا ایک بادل سا چھا گیا۔ اس دھماکے سے پوری عمارت لرز اٹھی۔

"جلدی چھت سے نیچے اترو۔" صنوبر چلائی وہ جھکے جھکے انداز میں تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے ان کٹھن حالات میں بھی جمیل رقم والے بیگ کو نہیں بھولا تھا۔ چھت سے اترتے وقت اس نے رقم والا بیگ شکیل کی خون آلود لاش کے پاس سے اٹھالیا تھا۔ اس خونی دولت کی خاطر پولیس، آفیسر شکیل اور پرویز کے دو ساتھیوں سمیت چار افراد مارے جاچکے تھے اور نہ جانے مزید کتنی زندگیاں اس خونی رقم کی خاطر موت کی اندھی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہونا تھیں۔"

"آپی آپ اور جمیل انہیں عمارت میں

داخل ہونے سے روکیں۔ جب تک میں اپنے لئے رائفل لے کر آتا ہوں۔ فیصل اسلحہ والے کمرے میں جاتے ہوئے بولا۔ صنوبر اور جمیل دو ستونوں کی آڑ میں دبک گئے۔

ہینڈ گرنیڈ نے عمارت کے سامنے والی دیوار کے پرخچے اڑا دیئے تھے صنوبر اور جمیل نے پرویز غیرہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے چند فائر کئے فوراً ہی باہر سے برسٹ کی صورت میں انہیں جواب دیا گیا۔ "جمیل یا شکیل میں جانتا ہوں تم دونوں میں سے ایک مارا جاچکا ہے۔ اب بھی تمہاری بہتری اس صورت میں ہے کہ خود کو رقم سمیت ہمارے حوالے کردو، ورنہ تم جانتے ہی ہو میرا نام پرویز ہے میں دشمنوں کے لئے موت کا دوسرا روپ ہوں۔" باہر سے پرویز کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

فیصل، فائزہ اور خالد کے ہمراہ صنوبر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس وقت فیصل کے ہاتھ میں بھی رائفل موجود تھی اسے اسلحہ چلانے کی تربیت خود صنوبر نے دی تھی کچھ اسے اس کا شوق بھی اس لئے جلد ہی پسٹل اور رائفل جیسے ہتھیاروں میں مہارت حاصل کرلی۔

"یہ یہ..... تو پرویز کی آواز ہے" فائزہ کی آواز میں لرزش تھی۔

"کون پرویز؟" فیصل نے پوچھا اور فائزہ نے مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنا ڈالی۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے جدید دور کے لیلیٰ مجنوں کی داستان سن رہے تھے جبکہ جمیل گاہے بگاہے پرویز کے ساتھی کی گولیوں کا جواب دے رہا تھا۔ اچانک ایک ہینڈ گرینڈ عمارت کے اگلے حصے سے ٹکرایا ساعت شکن دھماکے سے عمارت کے در و دیوار لرز اٹھے۔ اس عمارت کی سامنے کی باقی ماندہ دیوار بھی پرخچے اڑ چکے تھے دھوئیں اور گرد وغبار کے بادل چھاتے ہی وہ اندر کی طرف بھاگے۔

"سنو فیصل تم ان کو یہاں الجھائے رکھو میں اور جمیل عمارت کی عقبی سمت سے نکل کر ان کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں کیونکہ اگر یہ اسی طرح ہینڈ گرنیڈ برساتے رہے تو یہ عمارت ہمارا مدفن بن جائے گی۔" وہ دونوں بھاگتے ہوئے عمارت کی عقبی سمت گئے اور دیوار پھلانگ کر باہر نکلے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر عمارت کے سامنے آئے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بھی صنوبر اس کی طرف سے محتاط تھی۔ اسے اس عادی مجرم پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ بھی ایسا مجرم جو یہ جان چکا ہو کہ صنوبر کا تعلق حساس ادارے سے ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پرویز سے بچ بھی نکلا تو صنوبر اسے قانون کے حوالے کردے گی۔

اچانک وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ایک درخت کی آڑ میں ایک پستہ قامت گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص عمارت کی طرف فائر کررہا تھا۔ جمیل نے جلدی بازی سے کام لیتے ہوئے پے در پے چند فائر کئے۔ پستہ قامت شخص چیختا ہوا گرا گولیاں اس کی پیٹھ اور گردن میں پیوست ہوچکی تھیں اس وقت ان پر دائیں سمت سے چند فائر ہوئے۔ صنوبر نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور فضا میں قلابازی کھاتے ہوئے ایک درخت کی آڑ میں چلی گئی۔ گولی جمیل کے سینے میں لگی تھی وہ چیختا ہوا گرا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے برسٹ چلادیا تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اس کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے پرویز کے جسم کو چھلنی کردیا وہ چیختا ہوا گرا چند لمحے تڑپنے کے بعد دم توڑ دیا۔

صنوبر شدید زخمی جمیل کی طرف بڑھی۔ "دیکھ لیا تم نے ناجائز ذرائع سے حاصل کی جانے والی دولت کا انجام۔"

"ہاں..... میڈم میں غلطی..... پر..... تھا..... ساری زندگی لوٹ مار میں بسر کردی..... جس دولت کے حصول کے لئے..... قتل کئے وہ بھی ہاتھ..... نہ آئی میرا بھائی بھی مارا گیا..... اب خود بھی اپنی..... جان گنوا بیٹھا ہوں....." وہ اٹک اٹک کر بولا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

صنوبر چلتی ہوئی عمارت کی طرف بڑھنے لگی

عمارت سے کچھ فاصلے پر پرویز کے دوساتھیوں کی لاشیں دیدہ عبرت بنی پڑی تھیں جن سے ٹھوکر کھا کر وہ گری اس نے بے اختیار سہارے کے لئے قریب ہی پھولوں کے ایک پودے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ ایک نازک سی شاخ پر پڑا، شاخ ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ شاخ پر موجود پھول اس کی ہاتھ میں مسل چکا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھی اور ہاتھ میں موجود پھول اور ٹوٹی ہوئی شاخ ایک طرف پھینکی۔

اچانک وہ حیرت سے اچھل پڑی اس کا ہاتھ سرخ خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تعجب سے اپنے خون آلود ہاتھ کو دیکھ رہی تھی پھر وہ مسلے ہوئے پھول کی طرف بڑھی پھول بھی خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اب اس نے اس پودے کا رخ کیا جس کی شاخ اس کے ہاتھوں ٹوٹی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرا پھول توڑا اس سے بھی خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اس قسم کے دوسرے پودوں سے بھی پھول توڑے۔ وہاں بھی یہی صورتحال تھی وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی یہ تمام صورت حال اس کی سمجھ سے بالاتر تھی وہ انتہائی ذہین ترین آفیسر تھی بے شمار کیسز حل کئے تھے کئی خطرناک مجرموں کو گرفتار کیا ان عجیب قسم کے پھول تورنے سے پودوں سے انسانی خون بہنا اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

بھوت پریت پر وہ یقین نہیں رکھتی تھی اگر کوئی دوسرا اسے ایسے پودوں کے بارے میں بتاتا تو وہ یقین نہ کرتی لیکن اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ کر وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی وہ سوچنے لگی۔ ”وہ ٹیکسی ڈرائیور سچ کہہ رہا تھا۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں کٹے ہوئے انسانی سر اس نے خود دیکھے تھے وہ کس کا کام تھا کسی ماورائی قوت کا یا کسی انسان کا اگر یہ کسی بھوت پریت کا کام تھا تو اس ویران عمارت میں بھاری اسلحہ اور کروڑوں کی ہیروئن کا کیا مطلب تھا۔ بھوتوں اور جنوں کو ہیروئن اور اسلحہ سے کیا سروکار لیکن پھر ان عجیب پھولوں کے پودوں سے انسانی خون کیوں نکلتا ہے؟ اس نے زندگی بھر نہ ہی ایسے پودے دیکھے تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں سنا تھا۔ اس کا بھائی اور بھائی کے دوست کیسے غائب ہوئے وہ بھی اس ماورائی طاقت یا بھوت پریت کا شکار تو نہیں ہو گئے۔“ یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اس نے اس وقت جلدی میں ان کٹے ہوئے انسانی سروں کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔

”کہیں ان سروں میں گمشدہ سلمان کا سر تو نہیں۔“ یہ سوچتے ہی اسے اپنے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی وہ اٹھی اور اس پراسرار عمارت کی طرف بڑھی۔ عمارت کی بیرونی دیوار مارے جانے والے پرویز اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے پھینکے جانے والے بموں سے ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی وہ چلتی ہوئی صحن میں جا پہنچی۔ ”فیصل کہاں ہو تم لوگ باہر آ جاؤ؟ ان درندوں کا خاتمہ ہو چکا ہے“ اس نے بلند آواز میں کہا اور یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ اس کی آواز کے جواب میں وہ تینوں نہ ہی سامنے آئے اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔

”فیصل، فائزہ، خالد کہاں ہو تم لوگ؟“ اس بار وہ زور سے چیخی، عمارت میں چاروں طرف خاموشی کا راج تھا لگتا تھا یہاں پر کسی انسان کا وجود ہی نہیں۔

سلمان پہلے ہی حادثے کا شکار ہو چکا تھا اب دوسرا بھائی بھی خالد اور فائزہ سمیت غائب ہو چکا تھا۔

وہ دیوانوں کی طرح عمارت کی تلاشی لینے لگی پوری عمارت میں ان تینوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ چھت پر شکیل کی لاش بے گور وکفن پڑی تھی، پوری عمارت کی تلاشی لینے کے بعد دھڑکتے دل سے اس کمرے کی طرف بڑھی جس میں کٹے ہوئے انسانی سر دیکھے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک بھبکا اٹھا اسے ابکائی سی آنے لگی مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے انسانی سروں کی طرف بڑھی، اندر موجود چوہے اور چھپکلیاں کونے کھدروں میں بھاگنے لگے، وہ غور سے ادھر ادھر بکھرے انسانی سروں کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس

کے سر پر آ گرا ہو۔ کمرے کے ایک کونے میں کٹا ہوا انسانی سر اس کے بھائی سلمان کا تھا، دائیں آنکھ کی جگہ گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف کے رخسار سے گوشت نچا ہوا تھا۔ باوجود انتہائی ضبط کے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کافی دیر تک بے آواز روتی رہی اس پر گویا صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے جوان بھائی سلمان کا سر دھڑ سے الگ لاوارث حالت میں بے شمار کٹے ہوئے سروں کے درمیان پڑا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سلمان انتہائی بے دردی سے قتل ہو چکا تھا۔ فیصل غائب تھا یہاں آتے وقت ان کے موبائل نیٹ ورک نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اب تو بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے موبائل فون بھی آف ہو چکا تھا۔ وہ فوری طور پر انتظامیہ سے مدد بھی طلب نہیں کر سکتی تھی۔ قانونی کارروائی کے لئے اسے اس ویران پہاڑی علاقے سے دور جانا پڑتا جب تک نہ جانے فیصل اور ان دونوں میاں بیوی پر کیا گزرتی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا اس عمارت سے کافی فاصلے پر جو دوسری عمارت ہے وہاں جائے شاید کوئی سراغ ملے اس نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

دوسری طرف فیصل فائزہ اور خالد ایک ستون کے پیچھے روپوش تھے۔ اچانک انہیں اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کئی آدمی چلتے ہوئے آ رہے ہوں انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو انہیں اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہوا ان سے کچھ فاصلے پر چار کفن پوش مردے کھڑے تھے۔ جن کی شکلیں نہایت بھیانک تھیں ان کے لمبے لمبے نوکیلے دانت ڈریکولا کی طرح ہونٹوں سے باہر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے اس قدر خوفناک تھے کہ انہیں دیکھ کر فائزہ اور خالد اپنے ہوش کھو کر لہراتے ہوئے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

جبکہ فیصل سنبھل چکا تھا اس نے اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف کر دیا اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا ایک مردے نے اپنے کفن جیسے لباس سے گیند نما کوئی چیز نکال کر اس کی طرف لڑھکا دی اس گیند نما چیز سے دھواں نکلا تو فیصل چکراتا ہوا گرا اور ہوش وحواس سے عاری ہو گیا۔ ان میں سے تین کفن پوش مردوں نے انہیں اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کوریڈور میں چلتے ہوئے آخری کمرے کے دروازے پر جا رکے، وہ دروازہ دھکیل کر کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کفن پوش نے دیوار کے کونے میں جا کر دیوار کی جڑ میں ایک جگہ مخصوص انداز سے ٹھوکر ماری کمرے کا فرش درمیان سے تین فٹ کے قریب کھل گیا اندر خلا تھا جس میں سیڑھیاں قطار کی صورت میں تھیں وہ چاروں نیچے اترنے لگے۔

آخری والے نے نیچے اتر کر چھت میں نصب کوئی بٹن دبایا۔ کمرے کا فرش دوبارہ برابر ہو گیا۔ اب وہ تیز قدموں سے چل رہے تھے کچھ دیر بعد دوبارہ ان کے سامنے سیڑھیاں آ گئیں وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے ان میں سے ایک نے چھت پر نصب ایک بٹن دبایا سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ اوپر خلا نمودار ہو گیا وہ باہر نکل گئے۔ یہ عمارت سے کافی فاصلے پر درختوں کا جھنڈ تھا اردگرد بہت سے تناور درخت تھے ان کے باہر نکلتے ہی خود کار راستہ خود بخود بند ہو گیا۔ اب وہ ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے ٹیڑھے میڑھے دشوار گزار راستے پر وہ بڑی مہارت سے چل رہے تھے۔ ان کا یہ سفر کافی دیر بعد وسیع وعریض پیلے رنگ کی ایک عمارت کے پاس اختتام پذیر ہوا۔ اس عمارت کے اردگرد کھیت بنے ہوئے تھے جن مین فصل لہرا رہی تھی۔ عمارت کا بڑا سا گیٹ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل وئے اس کمرے میں ایک بھاری بھرکم الماری رکھی تھی ان میں سے ایک نے الماری کا پٹ کھولا ایک جگہ ابھارسا تھا اسے دبانے سے الماری اپنی جگہ سے خود کار طریقے سے سرک گئی۔ نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں وہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ ان کے اندر داخل

ہوتے ہی الماری خود کار طریقے سے اپنی جگہ پر آ گئی وہ سیڑھیوں سے اترے تو سامنے تنگ سی راہداری تھی وہ راہداری میں چلتے ہوئے ایک ہال میں پہنچے۔

یہاں نصف درجن رائفل بردار ٹولی کی شکل میں کھڑے تھے انہیں آتا دیکھ کر ایک عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''ڈاکٹر بھوت کے ساتھی آ گئے۔''

کفن پوش انہیں غصے سے گھورتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے یہ کافی بڑا کمرہ تھا جو دراصل ایک قسم کی تجربہ گاہ تھی چاروں طرف مختلف ٹیبلوں پر درجنوں کی تعداد میں مختلف محلولوں سے بھرے جار پڑے تھے ایک طرف میز پر کمپیوٹر دھرا تھا۔ جس کے سامنے کرسی پر ایک نقاب پوش بیٹھا تھا انہیں آتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''انہیں گملوں میں کھڑا کر کے مٹی ڈال دو۔'' وہ کھرکھراتی آواز میں بولا۔

کمرے کے ایک کونے میں درجن کے قریب بوریاں رکھی تھیں۔ ان بوریوں کے قریب بڑے بڑے نصف درجن گملے رکھے تھے جن کی اونچائی کوئی چار پانچ فٹ کے قریب تھی وہ کفن پوش انہیں اٹھائے ہوئے ان گملوں کے پاس جا پہنچے انہوں نے ان تینوں کو فرش پر لٹایا تین گملوں کو کھسکا کر کمرے کے وسط میں کیا۔ پھر فائز کو اٹھا کر گملے میں کھڑا کر دیا ایک کفن پوش اس کی پشت پر اس کی کمر کے گرد بازو حائل کئے کھڑا رہا دوسروں نے ایک بوری اٹھائی گملے کے قریب لا کر بوری کے منہ پر بندھی رسی کھول کر بوری میں موجود مٹی گملے میں ڈال دی۔ اسی طرح ایک اور بوری لا کر اسے بھی گملے میں الٹ دیا۔ اب فائزہ اس بڑے سے گملے میں سینے تک مٹی میں دھنسی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہی سلوک فیصل اور خالد کے ساتھ بھی کیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کام کے دوران وہ آپس میں کسی قسم کی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ ''اب تم چاروں جاؤ۔'' نقاب پوش نے حکم دیا تو وہ چاروں سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔

نقاب پوش نے میز پر سے سرجیکل آلات میں سے ایک سرنج اٹھائی اور باری باری تینوں کو انجکشن لگا دیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ ہوش میں آ چکے تھے ڈاکٹر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ تینوں آنکھیں تک نہیں جھپک رہے تھے۔ بس سامنے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ''لگتا ہے تم لوگ کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن کہہ نہیں سکتے کیونکہ تم بولنے چالنے اور کوئی بھی حرکت کرنے سے قاصر ہو، تم صرف سن سکتے ہو اور سمجھ سکتے ہو۔ سب سے پہلے میں تمہیں بھوت محل میں خوش آمدید کہتا ہوں، میں ہوں بھوت محل کا ڈاکٹر بھوت، تم تینوں یہ جان کر خوش ہو گے کہ میں تمہیں امر کرنے والا ہوں ہر دو گھنٹے بعد تمہیں انجکشن لگائے جائیں گے یہ کورس چوبیس گھنٹے تک جاری رہے گا چوبیس گھنٹے بعد تمہارا سر کاٹ کر دھڑ سے الگ کر کے ایک خاص قسم کے پھول کے پودے کو تمہارے جسم میں داخل کر کے پیوند کاری کی جائے گی اور پھر تمہیں اسی عمارت کے سامنے زمین میں دفن کر دیا جائے گا جہاں سے تمہیں اغوا کیا گیا ہے تم پھولوں کی طرح ہمیشہ مہکتے رہو گے۔'' وہ جنونی انداز میں بولتا چلا گیا۔

ان تینوں کا دل اپنے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کے تصور سے ڈوبنے لگا۔ فیصل ڈاکٹر بھوت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا اس کا مطلب ہے اس عمارت کے ایک کمرے میں کٹے ہوئے انسانی سر ڈاکٹر بھوت کا وحشیانہ تجربہ ہے۔ اب وہ ان تینوں کے ساتھ بھی خوفناک تجربہ کرنے جا رہا تھا۔ فیصل اگرچہ کم عمر تھا لیکن ذہین بھی تھا اس کا ذہن ان لوگوں کو بھوت سمجھنے سے انکار تھا۔ ڈاکٹر بھوت اب کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کسی کارروائی میں مصروف تھا۔

کافی دیر بعد اٹھا اور ان تینوں کو باری باری انجکشن لگانے کے بعد دوبارہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا فیصل سوچنے لگا۔ ''صنوبر اور جمیل کہاں ہوں گے؟''

جمیل عادی مجرم تھا کہیں موقع پا کر صنوبر کو نقصان نہ پہنچا دے اگر وہ صحیح سلامت بھی ہوئی تو فیصل تک اس کا پہنچنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ سوچتے

سوچتے فیصل کو ایسا خیال آیا جس نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔

کہیں سلمان بھائی اور اس کے دوست اس پاگل کے ہتھے تو نہیں چڑھے جنہیں اس نے اپنے بھیانک تجربے کی بھینٹ چڑھا دیا ہو۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ ایسا نہ ہوا ہو۔ اسی دوران ڈاکٹر بھوت دوبارہ اٹھا اور انہیں انجکشن لگا کر واپس کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی، پھر قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ڈاکٹر بھوت اپنی جگہ سے اٹھا اور آنے والے شخص کے قریب جا پہنچا۔ "ہیلو باس کیسے ہو بڑے دنوں بعد آنا ہوا؟ آپ تو مہینوں ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے۔"

کمرے کے اندر آنے والا ایک دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا اس نے شاندار قسم کا تھری پیس سوٹ پہن کر رکھا تھا اور چہرے پر نقاب کی شکل کا ماسک چڑھایا ہوا تھا جس سے اس کی نیلی آنکھیں ظاہر تھیں۔

باس چند لمحے خاموش کھڑا ڈاکٹر بھوت کو گھورتا رہا پھر ان تینوں کی طرف مڑا لمحہ بھر کے لئے وہ انہیں دیکھ کر چونک گیا۔ فیصل کو اس کی آنکھوں میں حیرت اور پریشانی کے آثار دکھائی دیئے۔ "یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے لائے گئے؟ بھوت محل کا پوائنٹ ون بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، میں نے دور سے دیکھا تو وہاں گولیوں سے چھلنی چند لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟" باس بھاری آواز میں بولا۔

"باس تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے، میں پوائنٹ ون سے یہاں ضروری کام سے آیا تو اس دوران تیز بارش شروع ہوگئی۔ میں یہ سوچ کر رک گیا کہ بارش کے رکتے ہی دوبارہ پوائنٹ ون پر چلا جاؤں گا یہاں تجربہ گاہ میں بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی اسی دوران مخصوص سائرن کی آواز سنائی دی۔ آپ جانتے ہی ہیں میں نے پوائنٹ ون میں ایسا سسٹم نصب کر رکھا ہے۔ جیسے ہی کوئی غیر متعلقہ فرد وہاں داخل ہوگا پوائنٹ ٹو کی اس تجربہ گاہ میں سائرن بجنا شروع ہو جائے گا جب ہم وہاں موجود ہوتے ہیں تو سسٹم آف رہتا ہے جب ہمیں وقتی طور پر کہیں جانا پڑتا ہے تو میں وہ سسٹم متحرک کر دیتا ہوں سائرن بجنے کے بعد میرے معاون میرے کہنے پر خفیہ راستے سے وہاں داخل ہوئے، لازمی ہے کہ انہیں وہاں جاتے ہوئے وقت لگا ہوگا اس دوران وہاں ان کے اور دوسرے گروپ کے درمیان معرکہ ہو چکا تھا۔" ڈاکٹر بھوت نظریں جھکائے ہوئے بولا۔

"تم نے حماقت کا ثبوت دیا ہے، وہ پوائنٹ ون میں ہمارا مال دیکھ چکے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ اور بھی لوگ ہیں جو تمہارے ہاتھ نہیں لگے اگر ایسا ہوا اور ان کے ساتھیوں نے یہاں سے نکل کر پولیس کو خبر کر دی تو ہماری برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا اپنے معاون دوبارہ پوائنٹ ون پر بھیجو انہیں حکم دو کہ اس علاقے کا چپہ چپہ چھان ماریں اگر ان کا کوئی ساتھی ملے تو اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں۔

میرے خیال میں تم نے انہیں پیوند کاری کے انجکشن لگانے شروع کر دیئے ہیں، سب سے پہلے تو اس لڑکی کو گلے سے نکال کر ان سے الگ کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دو، یہاں سے جاتے وقت میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔ ان دونوں نوجوانوں کو اس قابل کر دو کہ یہ بول سکیں، میں ان سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، پھر فوراً ہی انہیں دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر دینا۔" نقاب پوش نے ڈاکٹر بھوت کو ہدایات دیں۔"

ڈاکٹر بھوت نے اپنے معاون بلوائے فائزہ کو فوراً ہی گلے سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے معاون پوائنٹ ون کی طرف چل دیئے باہر سے دو راٹھل بردار افراد کو بلوایا گیا جو ڈاکٹر کے حکم پر فیصل وغیرہ پر رائفلیں تان کر کھڑے ہوگئے، خالد اور فیصل کو باری باری دوسری قسم کا انجکشن لگایا گیا، کچھ ہی دیر بعد وہ حرکت کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ "اب تم لوگ اپنی اصل حالت میں لوٹ آئے ہو مگر کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہیں گولیوں سے

بھون دیا جائے گا۔" نقاب پوش نے انہیں تنبیہ کی۔

"تم لوگ پوائنٹ ون کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون کون تھا اور تم لوگ ہو کون؟" نقاب پوش نے یکے بعد دیگرے ان سے تین سوالات پوچھے۔

خالد بہت خوف زدہ تھا اسے بولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی فیصل البتہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"آخری بار کہہ رہا ہوں میرے سوالات کے سنجیدگی سے جواب دو۔" نقاب پوش دانت پیستے ہوئے بولا۔

"ہم یہاں اپنے بھائی سلمان اور اس کے دو دوستوں کی تلاش میں آئے تھے۔ دو روز قبل ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا ان کی گاڑی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نشیب سے ملی مگر ان تینوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ہم انہیں تلاش کر ہی رہے تھے کہ بارش برسنے لگی عمارت دکھائی دینے پر بارش سے بچنے کے لئے وہاں جا گھسے۔ اسی دوران دو جرائم پیشہ افراد اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے وہاں آ گئے جنہوں نے ہمیں یرغمال بنا لیا۔ ان کے دشمن وہاں بھی پہنچ گئے۔ ان کے درمیان معرکہ ہوا دونوں اطراف کے بندے مارے گئے اور ہمیں تمہارے کارندے اٹھا کر لے آئے۔" فیصل بولا۔

"یہ سب درست ہے مگر تم لوگ ہو کون اور تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟" نقاب پوش نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہم تینوں آپس میں کزن ہیں ہمارا گارمنٹس کا کاروبار ہے۔" فیصل نے کہانی گھڑی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو تم تینوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں خیر کوئی بات نہیں ہمارے پاس اس کا حل ہے۔"

"ڈاکٹر اب تم اس پر سچ بولنے والا فارمولا آزماؤں۔" نقاب پوش نے رسان سے بولتے ہوئے حکم دیا۔

ڈاکٹر سرنج لیکر فیصل کی طرف بڑھا۔ انجکشن لگتے ہی فیصل کی آنکھوں کا رنگ گہرا سرخ ہوگیا تقریباً دو منٹ بعد ڈاکٹر بھوت بولا اور اب یہ سوالات کے جواب سچ سچ دے گا۔" "تمہارا نام؟"

"فیصل!" اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟" نقاب پوش نے پوچھا۔

"ریٹائرڈ DSP فیض احمد۔"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں پڑھتا ہوں۔"

"تمہارے ساتھ اور کون تھا؟"

"میری بڑی بہن صنوبر۔"

"وہ کیا کرتی ہے؟"

"ان کا تعلق قانون نافذ کرنے والے ایک حساس ادارے سے ہے۔" فیصل نے حساس ادارے کا نام بھی بتا دیا۔ اس کے جواب سے نقاب پوش بری طرح چونکا اس کی آنکھوں میں تشویش کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔

"تمہاری بہن اب کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا جس وقت تمہارے کارندوں نے مجھے اغوا کیا وہ عمارت سے باہر گئی ہوئی تھی۔" فیصل نے جواب دیا۔

نقاب پوش کے اشارے پر ڈاکٹر بھوت نے ایک اور انجکشن اسے لگایا فیصل پہلے والی کیفیت میں آ گیا۔

"اچھا تو تمہاری بہن کا تعلق حساس ادارے سے ہے۔" ڈاکٹر اب ان دونوں کو فوراً اپنے تجربے کی بھینٹ چڑھا دو۔ میں اس لڑکی کو لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔" نقاب پوش کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ڈاکٹر بھوت ان کی طرف مڑا۔ "وہ نوجوان جن کی تلاش میں تم آئے تھے وہ میرے تجربے کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اب تمہاری باری ہے۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر بھوت سرنج لے کر ان کی طرف بڑھا، یہ وہی انجکشن تھا جو جسم کو بے حس حرکت کر دیتا تھا۔ "یہ

آخری انجکشن ہے اسے لگانے کے بعد تم دونوں کے سر دھڑ سے الگ کردیئے جائیں گے پھر میں تمہارے جسم میں پیوندکاری کروں گا، تم سدا مہکتے رہو گے۔'' وہ ہذیانی انداز میں ہنستا ہوا ان کی طرف بڑھا انہیں اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔

دوسری طرف صنوبر رائفل ہاتھ میں تھامے ٹیڑھے مڑھے دشوار گزار راستوں پر چلتی ہوئی دوسری عمارت کی طرف بڑھتی جارہی تھی اسے اس راستے پر چلتے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی وہ ہنوز اس عمارت سے دور تھی۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی وہ لڑکھڑا کر نیچے گری۔ رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ڈھلان سے گرتی ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ نیچے گرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی گرنے سے اس کے گھٹنے اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بری طرح چھل گئی تھیں وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ رائفل کے ساتھ ساتھ خود بھی نہیں ڈھلوان سے گری تھی ورنہ اس کی ایک بھی ہڈی پسلی سلامت نہ ملتی۔ اب وہ محتاط انداز میں چل رہی تھی۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رک گئی دور سے کچھ افراد اس طرف آرہے تھے کچھ ہی دیر میں وہ اسے صاف دکھائی دے رہے تھے وہ بھوت نما چار افراد تھے جن کے جسم پر کفن جیسا لباس موجود تھا چہرے نہایت ہی بھیانک اور لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر آرہے تھے ان کی خوف ناک شکل دیکھنے کے باوجود وہ ذرا بھی نہ ڈری۔ اس کے خیال میں انہوں نے ماسک پہن رکھے تھے۔ جو شاید لوگوں کو ڈرانے کے لئے تھے تاکہ کوئی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرے اور وہ اس کی آڑ میں اطمینان سے ہیروئن اور اسلحہ یہاں محفوظ رکھ سکیں۔ وہ بھوت نما افراد اس سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ان کے چہروں پر یہ دیکھ کر حیرت تھی کہ یہ لڑکی ان سے ذرا بھی نہیں ڈری ان میں سے ایک نے اپنے کفن جیسے لباس سے گیند نما کوئی چیز صنوبر کی طرف لڑھکا دی۔ اس سے دھواں نکلتے ہی وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی، ان میں سے ایک نے صنوبر کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور واپسی کے راستے پر چل دیئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تجربہ گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہورہے تھے۔

اسی وقت ڈاکٹر بھوت فیصل اور خالد کو انجکشن لگانے والا تھا، انہیں اندر آتا دیکھ کر وہ رک گیا پھر صنوبر کو ان کے کندھے پر دیکھ کر چونک پڑا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ان کی ساتھی ہوگی۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''اسے کمرے میں ایک طرف ڈال کر تم لوگ باہر جاؤ میں پیوندکاری کا عمل مکمل کرلوں پھر اس کا بھی کچھ کرتا ہوں۔'' وہ چاروں باہر نکلنے لگے۔

ڈاکٹر سرنج ہاتھوں میں لے کر دوبارہ ان کی طرف بڑھا اسی وقت صنوبر کے جسم میں حرکت ہوئی وہ بجلی کی سی تیزی سے رول ہوتی ہوئی ڈاکٹر بھوت کی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ وہ منہ کے بل گرا سرنج ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گری کھٹ پٹ کی آواز سن کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ چاروں پلٹے رائفل بردار بھی چوکنا ہوگئے مگر صورتحال ان کے بس سے باہر تھی۔

صنوبر ڈاکٹر بصورت کی پشت پر موجود تھی اس کا بازو ڈاکٹر بھوت کی گردن کے گرد مضبوطی سے حمائل تھا جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں مضبوط تیز دھار خنجر ڈاکٹر شہ رگ پر اس سختی سے موجود تھا کہ اس کی شہ رگ سے خون رسنے لگا تھا اگر وہ اپنے جسم والے ہاتھ کا دھار معمولی سا بھی بڑھاتی تو ڈاکٹر کی شہ رگ کٹ جاتی۔

وہ چاروں صنوبر کی طرف بڑھے۔ ''اپنی جگہ پر رک جاؤ ورنہ شہ رگ کٹ جائے گی۔'' وہ سرد لہجے میں بولی تو وہ چاروں اپنی جگہ منجمد ہوگئے۔

''ڈاکٹر اپنے چمچوں سے کہو انہیں گلموں سے باہر نکالے جلدی کرو ورنہ۔'' اس نے خنجر کا دباؤ بڑھا دیا۔

''یہ جیسا کہتی ہے ویسا ہی کرو۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ان چاروں نے مل کر فیصل اور خالد کو گلموں سے نکال کر تجربہ گاہ کے فرش پر لٹا دیا۔

''ڈاکٹر اگے بڑھو اور ان دونوں کو اس کیفیت سے باہر نکالو اور یاد رہے تم نے یا تمہارے ساتھیوں میں

ذرا لاپرواہی کی چالاکی دکھائی تو تمہاری گردن کٹی لاش اس تجربہ گاہ کے فرش پر پڑی ہوگی۔'' وہ سانپ کی طرح پھنکاری اور ڈاکٹر کو دھکیلتے ہوئے اس میز کی طرف بڑھنے لگی جہاں مختلف قسم کے محلول پڑے تھے۔

ڈاکٹر نے کپکپاتے ہاتھوں سے ایک سرنج اٹھائی اور ساتھ ہی چھوٹی سی محلول کی شیشی بھی اٹھائی۔ ''انہیں انجکشن لگانے کے لئے مجھے بیٹھنا پڑے گا یہ فرش پر پڑے ہے میں کھڑے ہوکر انہیں انجکشن نہیں لگا سکتا۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ خوف سے اس کی حالت پتلی ہورہی تھی اس قسم کے حالات سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اس طرح اس کی تجربہ گاہ میں اس کی شہ رگ پر خنجر رکھ کر اسے بے بس کردے گا۔

''تمہارے معاون بھی انجکشن لگا لیتے ہونگے سرنج ان کے حوالے کردو۔'' ڈاکٹر کے اشارے پر ایک معاون آگے آیا اور اس کے ہاتھوں سے سرنج اور محلول کی شیشی لے کر فیصل اور خالد کی طرف بڑھا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہیں باری باری انجکشن لگانے لگا۔

تقریباً دو منٹ بعد ہی وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔ ''آپی تم نے تو کمال کردیا۔ لیکن تم اتنی جلدی ہوش میں کیسے آئی۔''

''میں بے ہوش ہی کب ہوئی تھی۔ جیسے ہی انہوں نے گیند نما چیز میری طرف لڑھکا تو میں سمجھ گئی کہ یہ کیا ہے، میں نے فوراً ہی سانس روک لی تھی تم جانتے ہو میں یوگا کی ماہر ہوں۔ چند منٹ کے لئے سانس روکنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ مجھے بے ہوش سمجھتے ہوئے یہاں لے آئے انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ یہ بھوت اوت نہیں انہوں نے بھوت بننے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔'' صنوبر تفصیل بتاتے ہوئے ڈاکٹر بھوت کے چہرے سے نقاب ہٹالیا اندر ایک غیر ملکی کا چہرہ تھا۔

''چلو اس تہہ خانے سے باہر نکلو یہاں چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔'' صنوبر نے انہیں دوبارہ خبردار کیا وہ چاروں آگے ان کے پیچھے صنوبر ڈاکٹر کی شہ رگ پر خنجر رکھے ہوئے اور اس کے پیچھے فیصل اور خالد چلتے ہوئے ہال میں پہنچے وہاں نصف درجن افراد رائفلیں تھامے کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ صورتحال دیکھ کر ان کی طرف رائفلیں تان لیں ''خبردار کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ تمہارے ڈاکٹر بھوت کا یہیں کام تمام ہوجائے گا۔ اپنی اپنی رائفلیں نیچے پھینک دو۔'' صنوبر نے بلند آواز میں حکم دیا۔

''وہ لاچاری سے ڈاکٹر بھوت کی طرف دیکھنے لگے۔'' جیسا یہ کہتی ہے ویسا ہی کرو۔'' وہ بے بسی سے بولا تو انہوں نے اپنی رائفلیں پھینک دیں۔

فیصل نے ایک رائفل اپنے قبضے میں لے لی اور دوسری رائفل صنوبر کو تھمائی۔ بقایا رائفلیں ایک کونے میں لے جا کر رکھ دیں۔ ''اب سر سے ہاتھ بلند کرکے باہر نکلو۔'' فیصل نے رائفل کی نال کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے حکم دیا وہ ہاتھ سر سے بلند کرکے ان سے آگے چلنے لگے۔ ابھی وہ بیس قدم آگے چلے ہی تھے کہ ڈاکٹر بھوت اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کراہنے لگا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ ''کیا ناٹک کررہے ہو۔'' صنوبر غرائی۔

''ناٹک نہیں..... میں ہارٹ پیشنٹ ہوں مجھے گولی کھانے دو ورنہ میں یہیں ..... مرجاؤں گا۔'' وہ بمشکل اٹکتے ہوئے بولا۔

صنوبر نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے خنجر اس کی گردن سے ہٹا کر رائفل تان لی اور خنجر اپنی پنڈلی سے دوبارہ باندھ لیا ڈاکٹر نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی گولی نکال کر اپنی زبان کے نیچے رکھی تقریباً ایک منٹ بعد ہی وہ تیورا کر فرش پر گرا اور ساکت ہوگیا فیصل نے آگے بڑھ کر اس کی نبض تھامی اس کے بعد اس کے سینے سے کان لگا دیئے۔ اور مایوس ہوکر اٹھ کھڑا ہوا ڈاکٹر کے چہرے پر حیرانی پھیلتی جارہی تھی ''اس گولی میں زہر تھا اس نے خودکشی کرلی'' وہ سر سراتے

ہوئے لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر کی لاش وہیں چھوڑ کر بقایا افراد کو رائفلوں کی زد میں لئے ہوئے وہ عمارت سے باہر نکلے فوراً ہی درجن کے قریب باوردی پولیس اہلکاروں نے درختوں کی آڑ سے نکل کر انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ ''خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے اور اپنے ہتھیار پھینک دو'' انسپکٹر ریک کا آفیسر رائفل تانے ان کی طرف بڑھا۔

''انسپکٹر میں .....'' فیصل نے کچھ کہنا چاہا۔

''پہلے اپنی رائفل پھینکو۔'' پولیس انسپکٹر غرایا۔

فیصل اور صنوبر نے اپنی اپنی رائفلیں پھینک دیں خالد ویسے بھی خالی ہاتھ تھا وہ میدان عشق کا کھلاڑی تھا جو صرف اپنے محبوب کی شان میں شاعری کر سکتا تھا۔

صنوبر نے اپنا آئی ڈی کارڈ انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ کارڈ پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ''سوری میڈم میں آپ کو نہیں جانتا تھا۔'' اس نے صنوبر کو سیلوٹ کیا۔ اس کے دیکھا دیکھا پولیس پارٹی کے بقایا افراد بھی اٹین شن ہو گئے۔ ''یہ ہے آپ کی فرض شناسی آپ لوگ اب پہنچے ہیں۔'' صنوبر نے طنز کیا۔ ''وہ جی میڈم ہمیں جیسے ہی اطلاع ملی کہ یہاں سے دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں ہم تھانے سے روانہ ہو گئے تھے۔'' انسپکٹر نے اپنی صفائی پیش کی۔

ملزمان کو حراست میں لے لیا گیا۔ عمارت کی تلاشی پر حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ تہہ خانے کے ایک حصے میں ہیروئن بنانے کا کارخانہ بنایا گیا تھا جہاں جدید ترین مشینری نصب تھی۔ عمارت کے اردگرد کھیتوں میں پوست کی کاشت کی جاتی تھی پر وہاں اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔

اس سے بھی حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر بھوت کی لاش وہاں سے غائب ہو چکی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ آئے تھے۔

ملزمان سے تفتیش کی گئی تو وہ باس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے باس ان کے سامنے ہمیشہ نقاب پہن کر آتا تھا ڈاکٹر بھوت دراصل غیر ملکی تھا اس کا اصل نام رچرڈ تھا۔ وہ افیون سے ہیروئن تیار کرنے کا ماہر تھا۔

عجیب قسم کے پودے اس نے افریقہ سے منگوائے تھے زندہ انسانوں کو مخصوص انجکشن لگانے کے بعد ان کی گردن کاٹ کر پودے کی پیوند کاری کرتا تھا یہ ایسا حیرت انگیز پودا تھا کہ انسانی جسم کے اندر اس کی جڑیں بڑھنا شروع ہو جاتی تھیں انسانی جسم کو زمین کے اندر دفن کر دیا جاتا تھا اس پودے میں اپنی خاصیت تھی کہ اس کا پھول توڑنے سے یا شاخ توڑنے سے پودے سے انسانی خون ٹپکنا شروع ہو جاتا تھا۔ یہ سب کمال ڈاکٹر بھوت کے فارمولے کا تھا۔ یہ بھوتوں کا سیٹ لوگوں کو ڈرانے کے لئے پھیلایا گیا تھا تاکہ کوئی بھولے سے بھی یہاں کا رخ نہ کرے عمارت کے کمرے میں پائے گئے انسانی سر دفنا دیئے گئے اور وہ سب سوگوار چہرہ لئے شہر لوٹ گئے۔ ان کے دل میں بس ایک ہی خلش تھی وہ اصل مجرم کو گرفتار نہ کر سکے تھے خالد کی حالت بھی بری تھی باس جاتے ہوئے اس کی بیوی کو لے کر غائب ہو چکا تھا صنوبر اور فیصل نے اسے تسلی دی اور اپنا نمبر اسے دے کر رخصت ہو گئے کچھ عرصہ سوگ کی کیفیت میں رہے۔ پھر آہستہ آہستہ معمولی پر آتے چلے گئے۔ گزرتا وقت ایسا مرہم ہے جو بڑے سے بڑے غم کو بھلا دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

اس وقت DSP حسن رات کے دو بجے اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا آج نیند کی دیوی اس سے روٹھ چکی تھی اسے اپنا مرحوم بیٹا یاد آ رہا تھا جو ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ DSP ایک ایماندار افسر تھا راشد اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو کالج سے لوٹتے وقت ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا اس حادثے کے وقت جائے وقوعہ پر موجود لوگوں نے اسے اسپتال پہنچانے میں سستی سے کام لیا تھا راشد چونکہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا اس نے اس کی یاد سے ہر پل تڑپا تی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ''پتہ نہیں رات کے

اس پہر کسے تکلیف ہوئی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے خود کلامی کی اور فون کی طرف بڑھا قدرے سستی سے ریسور اٹھایا۔ ''ہیلو DSP حسن اسپیکنگ بھئی رات کو خود بھی سکون سے سویا کرو اور دوسروں کو بھی سونے دیا کرو۔''

''میں ایس پی صفدر حسین عرض کر رہا ہوں DSP صاحب۔'' دوسری طرف سے ایس پی صاحب کی آواز سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ''سوری سر! میں سمجھا پتا نہیں کون ہے؟'' وہ معذرتی لہجے میں بولا۔

''مسٹر حسن شہر کی ایک معروف سڑک سے پانچ کٹے ہوئے سر ملے ہیں۔ جن کے ماتھے پر ڈاکٹر بھوت مارکر سے لکھا ہوا ہے ایس پی کی بات سنتے ہی وہ بے اختیار بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ایسا کرو جلدی سے جاؤ وقوعہ پر پہنچ جاؤ علاقہ SHO اپنی پارٹی کے ہمراہ وہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں پہنچتا ہوں۔''

5 کٹے ہوئے انسانی سروں کی اطلاع اور ان کے ماتھے پر مارکر سے ڈاکٹر بھوت لکھا ہونے کے بارے میں سن کر وہ بوکھلا اٹھا تھا۔ اس نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی بیوی کو جگا کر حالات سے باخبر کیا پھر جلدی سے تیار ہو کر باہر نکلا اس کے جائے حادثہ پر پہنچنے تک SP خود بھی وہاں پہنچ چکا تھا صورتحال انتہائی گھمبیر تھی۔

سڑک کے کنارے پانچ انسانی سر پڑے تھے۔ جن کی پیشانی پر مارکر سے ڈاکٹر بھوت لکھا ہوا تھا۔ دوسرے تکنیکی شعبے سے تعلق رکھنے والی ٹیمیں بھی جائے حادثہ پر پہنچ چکی تھیں۔ مختلف زاویوں سے تصویریں لی گئیں۔ پھر انسانی سروں کو ضروری کارروائی کے بعد وہاں سے اٹھوا لیا گیا۔

''حسن جو صورتحال اس وقت سامنے آئی ہے اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' ایس پی اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''سر میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ میں مجرم تک جلد پہنچ جاؤں گا۔'' DSP نے اسے تسلی دی اور خدا حافظ کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

صبح کے اخبارات میں اس المناک درندگی بھرے واقعہ کی خبر چھپی تھی پولیس ڈپارٹمنٹ پر بھرپور انداز میں تنقید کی گئی تھی دوسرے روز بھی شہر کی ایک دوسری سڑک سے تین کٹے ہوئے انسانی سر ملے ان کی پیشانی پر بھی ڈاکٹر بھوت تحریر تھا۔ لوگوں نے خوف کے مارے اکیلے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا پولیس ڈپارٹمنٹ پر میڈیا کی طرف سے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا شہر میں پولیس کا گشت بڑھا دیا گیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا چند دنوں بعد ایک پارک سے پھر 2 انسانی سر ملے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ملنے والے انسانی سر دو معصوم بچوں کے تھے اس شہر کے لوگوں کی اکثریت نے ڈر کے مارے بچوں کا گھر سے نکلنا بند کر دیا، شہر میں ہر طرف ڈاکٹر بھوت کے نام سے ایک ڈر سا پیدا ہو چکا تھا۔

لاکھوں انسانوں کے اس شہر میں کتنے ہی افراد گھر سے نکلتے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں زندہ لوٹنا نصیب نہیں ہوتا ایک روز میں کتنے ہی لوگ حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں کچھ بیماری سے مرتے ہیں بہت سے قدرتی موت مرتے ہیں مرنے والوں کے لواحقین کچھ روز ان کا سوگ مناتے ہیں پھر رفتہ رفتہ مرنے والوں کی یاد ماند پڑنے لگتی ہے لیکن جو زندہ غائب ہو جاتے ہیں ان کے لوٹ آنے کا انتظار رہتا ہے۔ خالد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا فائزہ کو نقاب پوش اس کی نظروں کے سامنے سے لیا گیا تھا شہر آنے کے بعد سے اس کا برا حال تھا، فائزہ کی یاد اسے چین سے نہیں جینے دیتی تھی وہ اپنے فلیٹ پر تنہا پڑا رہتا۔ آخر اس نے لائحہ عمل بنا لیا کہ اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہے گا۔ صرف اس کے فراق میں آنسو بہانے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا یہ انتہائی سنگین

معاملہ تھا اس کی بیوی اس کی نظروں کے سامنے سے اغوا ہوچکی تھی اور وہ کچھ نہیں کرسکا تھا۔

وہ اپنی کھٹارا بائیک پر سارا دن گھومتا رہتا سڑک پر نظر آنے والی ہر خوبصورت لڑکی کو غور سے دیکھتا مگر فائزہ اسے نظر نہ آئی۔ ایک روز اسی طرح اپنی کھٹارا بائیک پر وہ سڑکوں کی خاک چھان رہا تھا کہ ایک سپر اسٹور کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بی ایم ڈبلیو سے نکلتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی دیکھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ فائزہ تھی اس کی فائزہ۔ اس نے بے اختیار بائیک روکی اور سڑک پار کرنے لگا وہ فائزہ کو دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا بنا ادھر ادھر دیکھے سڑک پر بھاگا کئی گاڑیوں کے بریک چرچرائے بہت سے ڈرائیوروں نے اسے بلند آواز سے کوسا۔ مگر اسے اس وقت کسی بات کا ہوش نہ تھا اس کی محبت اس کی زندگی اس کی بیوی جس کی تلاش میں وہ پاگل ہوچکا تھا اس سپر اسٹور میں داخل ہوچکی تھی وہ بی ایم ڈبلیو پر نظر ڈالتے ہوئے سپر اسٹور میں داخل ہوگیا ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور مستعد بیٹھا تھا جب کہ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک گن مین کلاشنکوف لئے بیٹھا تھا۔

خالد نے اندر جا کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا فائزہ ایک طرف ہینگر میں لٹکے ہوئے ملبوسات دیکھ رہی تھی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا اسی وقت فائزہ کی نظر اس کی طرف اٹھی۔ یہ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا کہ فائزہ کی نگاہوں میں اس کے لئے اجنبیت تھی۔ ''جی فرمائیے۔'' اس نے اپنے سامنے کھڑے خالد کو بے تاثر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''فائزہ میں خالد ہوں کیا ہوگیا ہے تمہیں شاید تم مذاق کررہی ہو۔'' وہ تڑپ اٹھا۔

''دیکھئے مسٹر پہلی بات تو یہ ہے کہ میں فائزہ نہیں! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلیز! راستہ چھوڑیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ خالد پریشان نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''فائزہ کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ اسے پہچاننے سے کیوں انکاری ہے۔'' فائزہ تمہاری یادداشت تو درست ہے ناں میں خالد ہوں، ہم نے اپنی پسند سے کورٹ میرج کی تھی تمہارے باپ کے بھیجے ہوئے غنڈوں سے بچنے کے لئے پہاڑی مقام پر جا پہنچے جہاں تمہیں ڈاکٹر بھوت کے باس نے اغوا کرلیا تھا۔'' وہ فائزہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے تم پاگل ہو کیا یہاں پر سیکورٹی نہیں کہ پاگل بھی یہاں گھس آتے ہیں۔'' وہ خالد کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے چلائی۔

فوراً ہی سیکورٹی گارڈز آگے بڑھے۔ ''کیا مسئلہ ہے مس؟''

''دیکھئے یہ صاحب بلاوجہ مجھے تنگ کررہے ہیں جبکہ میں انہیں جانتی تک نہیں۔''

''آپ کا مسئلہ کیا ہے مسٹر؟'' گارڈز کے تیور جارحانہ تھے۔

''آپ ہمارے درمیان نہ آئیں یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے یہ بیوی ہے میری۔'' خالد کے انداز میں برہمی تھی۔

''لگتا ہے واقعی تم پاگل ہو۔'' گارڈز اسے دھکیلتے ہوئے سپر اسٹور سے باہر لے آئے۔ وہ چیختا چلاتا رہا مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ ''اگر یہ دوبارہ اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو اس کی جی بھر کے مرمت کرکے پولیس کے حوالے کردینا۔ ان میں سے ایک گارڈ نے اسٹور کے باہر کھڑے دو سیکورٹی گارڈز سے کہا۔

خالد کپڑے جھاڑتا ہوا نیچے سے اٹھا اور سڑک پار کرکے اپنی بائیک کے پاس جا پہنچا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فائزہ نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا وہ سوچتا رہا اور سپر اسٹور کی طرف دیکھتا رہا تقریباً پندرہ منٹ بعد فائزہ سپر اسٹور سے باہر نکلی بی ایم ڈبلیو فائزہ کو لے کر جیسے ہی ایک طرف روانہ ہوئی خالد اپنی بائیک پر محتاط انداز میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔

گاڑی اب شہری حدود سے نکل کر سنسان علاقے میں جارہی تھی، کچھ دیر بعد گاڑی ایک وسیع

وعریض عالی شان عمارت کے پھاٹک نما گیٹ پر جا کر رک گئی۔ گیٹ پر دو قوی ہیکل گارڈز جدید طرز کی رائفلیں لئے کھڑے تھے گیٹ کے کھلتے ہی گاڑی اندر داخل ہوگئی اور گیٹ دوبارہ بند ہوگیا۔

خالد حیران اور پریشان کھڑا دور سے اس عمارت کو دیکھ رہا تھا اس سنسان علاقے میں واحد یہی ایک عمارت تھی۔ دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ رائفل بردار گارڈز کو دیکھ کر اس کا حوصلہ پست ہوچکا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بائیک پر بیٹھ کر دوبارہ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر بائیک دوڑا دی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

فائزہ اس سے بے وفائی کررہی تھی یہ تصور ہی اس کے لئے سوہان روح تھا۔ ''جس زندگی میں فائزہ نہیں اس سے مرجانا بہتر ہے'' اس نے سوچا اور بائیک سامنے سے آنے والی تیز رفتار کار سے ٹکرا دی۔ کار کے بریک چرچرانے کی زوردار آواز سنائی دی اور بائیک کار سے ٹکرا گئی خالد بائیک پر سے اڑتا ہوا کار کی چھت پر گرا اور لڑھکتا ہوا سڑک پر گر کر ساکت ہوگیا۔ کار بائیک کو گھسیٹتی ہوئی آگے تک لے گئی۔

☆.....☆.....☆

ادھر صنوبر اپنے ادارے کے افسر اعلیٰ کے آفس میں موجود تھی، افسر اعلیٰ اسے کافی دیر تک گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''تم نے رپورٹ پیش کی تھی کہ ڈاکٹر بھوت نے خودکشی کی ہے، تمہاری موجودگی میں اس کی لاش غائب ہوگئی، یہ ہمارے محکمے کا کیس نہیں تھا۔ تم دونوں اپنے بھائی کی تلاش میں وہاں پہنچے اور اس چکر میں الجھ گئے۔ ان کاکروڑوں کا مال ہیروئن بنانے کا لیبارٹری اور پوست کی کاشت یہ سب قانون کی نظر میں آگیا۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت اس شہر پر اس واقعہ کے کچھ ہفتے بعد ٹوٹ پڑی۔ سڑکوں پر مختلف پارکوں سے کٹے ہوئے انسانی سر ملنا شروع ہوگئے ان سروں کی پیشانی پر ڈاکٹر بھوت تحریر تھا۔ پولیس اب تک اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے عوام میں کافی غم وغصہ پایا جاتا ہے میڈیا کی طرف سے بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں پر تنقید کی جارہی ہے اب سے چند گھنٹے قبل آئی جی صاحب کے 10 سالہ بیٹے زبیر کو گراؤنڈ سے کھیلتے ہوئے اغوا کرلیا گیا ہے اس کے ساتھی بچوں نے ملزم کا جو حلیہ بتایا ہے وہ حلیہ اس ڈاکٹر بھوت سے ملتا ہے وہی ڈاکٹر بھوت جس کا ذکر تم نے اپنی رپورٹ میں کیا تھا۔ ایسا ہی حلیہ تم نے بھی اپنی رپورٹ میں لکھا تھا پولیس ڈپارٹمنٹ کی ناکامی کے بعد یہ کیس ہمارے ادارے کے سپرد کردیا گیا ہے معاملہ چونکہ آئی جی صاحب کے بیٹے کا ہے اس لئے اوپر سے سخت دباؤ ہے۔ تمہیں جلد از جلد زبیر کو صحیح سلامت بازیاب کروا کر ان ملزمان کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے اس کیس کی فائل میز پر پڑی فائل میں مغوی زبیر کی تصویر بھی موجود ہے۔ اوکے'' افسر اعلیٰ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سر آپ بے فکر رہیں، میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔'' صنوبر نے فائل میز پر سے اٹھائی اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر کار میں فیصل موجود تھا۔ ''کیا ہوا آپی تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔''

''یہ منحوس ڈاکٹر بھوت دوبارہ کہاں سے زندہ ہوگیا لگتا ہے اپنے نام کی طرح واقعی بھوت ہے۔'' صنوبر نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''آپی اس کمبخت ڈاکٹر بھوت کا میرے سامنے نام بھی مت لو منحوس نے انجکشن لگا لگا کر میرا ستیاناس کردیا ویسے ایک بات ہے ڈاکٹر بھوت کا فارمولا بہت کمال کا تھا ایک انجکشن لگاؤ بندے کی بولتی بند، وہ بت کی طرح ساکت رہتا تھا۔ اگر وہ یہ فارمولا مارکیٹ میں فروخت کردے تو دوا ساز کمپنیاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گی، یہ انجکشن بہت بکے گا۔ اور اسے خریدنے والے سب بیوی کے ہاتھوں ستائے ہوئے مظلوم شوہر ہوں گے۔'' وہ چہکتے ہوئے بولا۔

''فیصل ہر وقت فضول بکواس مت کیا کرو۔'' سنجیدہ مزاج صنوبر نے اسے جھڑکا اور کار دائیں سمت

مڑتی ہوئی سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑا دی۔

فیصل نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ایک بائیک مخالف سمت سے تیز رفتاری سے آئی اور ان کی کار سے ٹکرا گئی، صنوبر نے بے اختیار بریک لگائے، بائیک سوار اڑتا ہوا کار کی چھت سے ٹکرا کر سڑک پر جا گرا جب کہ کار بائیک کو گھسیٹتی ہوئی دور تک لے گئی وہ دونوں کار رکتے ہی تیزی سے باہر نکل کر بائیک سوار کی طرف لپکے وہ خون میں لت پت ساکت پڑا تھا۔ فیصل اس کا چہرہ دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ''آپی یہ تو خالد ہے۔'' وہ بے اختیار چلایا اور اس کی نبض چیک کرنے لگا۔ ''یہ ابھی زندہ ہے اسکی نبض سست چل رہی ہے۔''

فیصل نے شدید زخمی خالد کو بمشکل اٹھایا اور کار کی عقبی نشست پر لٹا کر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ صنوبر نے کار اسٹارٹ کی اور آندھی طوفان کی طرح تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف دوڑا دی۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ICU کے باہر بیٹھے تھے خالد کی حالت سیریس تھی ڈاکٹرز اس کی زندگی بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسپتال پہنچنے پر پہلے تو ڈاکٹروں نے اس کا فوری علاج کرنے سے انکار کر دیا ان کا کہنا تھا کہ یہ پولیس کیس ہے پھر صنوبر کا سروس کارڈ دیکھ کر کے رویے میں تبدیلی آئی تقریباً دو گھنٹوں بعد ایک ڈاکٹر ICU سے باہر آیا۔ ''مریض کو ہوش آچکا ہے اور وہ فائزہ فائزہ پکار رہا ہے۔ آپ کسی بھی طرح فائزہ کو لے آئیں۔'' ڈاکٹر پریشان کن لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹر کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں۔'' فیصل نے پوچھا۔

''ضرور! لیکن صرف چند منٹ کے لئے ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں، سر پر بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔'' وہ ڈاکٹر کے ساتھ ICU میں داخل ہو گئے۔ خالد بیڈ پر لیٹا ایک ہی نام دہرا رہا تھا۔ ''فائزہ فائزہ''

''کیا ہوا خالد!'' وہ اس کے بیڈ کے قریب جا پہنچے۔

فیصل کو یہ معصوم سا شخص بہت اچھا لگا تھا۔

''فیصل فائزہ نے مجھے..... پہچاننے..... سے انکار..... کر دیا تھا.....'' اس نے اٹکتے ہوئے انہیں فائزہ کے ملنے اور اس عمارت میں جانے سے متعلق بتایا۔ صنوبر کے پوچھنے پر اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں اس عمارت کا ایڈریس بتایا۔ جہاں اس نے فائزہ کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ''فیصل وہ بیوفا ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا اور اس کے جسم کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ ''پلیز! اب آپ لوگ باہر جائیں۔''

''فیصل جلدی چلو! اس عمارت کی طرف جہاں فائزہ موجود ہے۔'' صنوبر نے اس کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے اسپتال سے باہر نکل گئی۔

وہ بری طرح لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے فیصل کے چہرے اور جسم پر بے شمار زخم تھے جن سے نکلتے خون نے اس کے لباس کو سرخ کر دیا تھا۔ صنوبر نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اس کے یہ زخم خود ساختہ تھے ان دونوں نے کسی حد تک حلیہ تبدیل کر رکھا تھا۔ کلین شیو فیصل کے چہرے پر داڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ چہرے پر بڑے سے مسے نے بھی اس کی شناخت مٹانے میں مدد دی تھی ناک کے نتھنوں میں موجود اسپیرنگ کی وجہ سے اس کا ناک چوڑا ہو چکا تھا بقایا کسی چہرے پر ملے محلول نے پوری کر دی تھی اس کا گندمی رنگ سیاہی مائل ہو چکا تھا وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت میں داخل ہو کر فائزہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ انہیں علم ہو جائے کہ فائزہ یہاں کیسے پہنچی اسے تو باس نے اغوا کیا تھا۔ عمارت کے مکین کون تھے، اگر وہ جرائم پیشہ ہوتے تو قانونی کارروائی آسان تھی۔

وہ چلتے ہوئے عمارت کے دروازے پر جا پہنچے گیٹ پر پہنچتے ہی فیصل بظاہر زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ گیا دروازے پر موجود دونوں رائفل بردار محافظ ان کی طرف لپکے۔ فیصل نے سانس روک لی اور اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کیا کہ جیسے وہ زخموں کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا، محافظوں نے قریب آ کر اس کا جائزہ لیا۔ ''یہ تو بہت زخمی ہے۔ کیا ہوا اسے؟'' ایک

محافظ نے صنوبر سے پوچھا۔

''ہم اپنی گاڑی میں یہاں سے گزر رہے تھے کہ چند مسلح افراد نے روک کر ہمیں لوٹنا چاہا، مزاحمت پر میرے بھائی کو تشدد کر کے اس حالت میں پہنچا دیا۔'' صنوبر روتے ہوئے بولی وہ اس وقت غضب کی اداکاری کر رہی تھی اس کا چہرہ بھی میک اپ کی وجہ سے کسی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ کچھ دیر آپس میں کانا پھوسی کرتے رہے پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ایسا کرتے ہیں تم لوگوں کو اندر پہنچاتے ہیں اندر ڈاکٹر موجود ہے اس کی مرہم پٹی کر دے گا۔'' ایک محافظ معنی خیز لہجے میں بولا۔

فیصل بدستور بے ہوش پڑا تھا انہوں نے مل کر فیصل کو اٹھایا اور عمارت کے اندر جانے لگے صنوبر دوپٹے میں منہ چھپائے کسی شرمیلی اور سیدھی سادھی لڑکی کی طرح ان کے ہمراہ ہولی۔ یہ کافی بڑی عمارت تھی ایک ایکڑ پر مشتمل اس شاندار عمارت کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مالک کوئی معمولی انسان نہیں۔ انہیں ایک ہال نما کمرے میں لے جایا گیا یہاں اسپتال کی طرح تین چار بیڈ پڑے تھے دو نرسیں اور ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے اس کے زخموں کی صفائی کی اور مرہم پٹی کر دی گئی اس دوران محافظ ڈاکٹر کو ان کے بارے میں بتا چکا تھا کہ فیصل کی یہ حالت کیسے ہوئی۔ یہ خود ساختہ زخم اس نوعیت کے تھے کہ دیکھنے میں خاصے بڑے لگتے تھے لیکن معمولی نوعیت کے تھے اسے پین کلر انجکشن بھی لگایا گیا۔ ''آپ فکر نہ کریں یہ جلد صحیح ہو جائے گا اب آپ اس کے قریب بیٹھی رہیں، کوئی مسئلہ ہو تو مجھے نرس کے ذریعے بلوا لیجیے گا۔'' وہ بولا اور کمرے سے باہر چلا گیا، محافظ بھی جا چکے تھے دونوں نرسیں البتہ وہیں موجود تھیں۔

رات آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر دوبارہ آیا اب بظاہر فیصل ہوش میں آ چکا تھا اور صنوبر سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک نرس وہیں موجود تھی جبکہ دوسری جا چکی تھی ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور پوچھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''طارق۔''

''مسٹر طارق اب آپ کی حالت کافی بہتر ہے ویسے آپ پر واقعی تشدد ہوا تھا۔'' وہ فیصل کو شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا بحیثیت ڈاکٹر کے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ زخم معمولی نوعیت کے ہیں۔

''بس ڈاکٹر صاحب سڑک سے گزرتے ہوئے چند لٹیروں سے مڈبھیڑ ہو گئی، مزاحمت پر انہوں نے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔'' فیصل نے جواب دیا۔

''اوکے، اب اپنا خیال رکھیئے گا کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو نرس سے کہہ دیجیے گا۔'' ڈاکٹر دوبارہ چلا گیا۔

کچھ دیر بعد کھانا آ گیا جو دونوں نے مل کر کھایا۔ نرس جس نے صنوبر کو اپنا نام مریم بتایا تھا قریب ہی موبائل فون میں مصروف تھی۔ ''مریم یہاں پر کتنے ڈاکٹر ہیں؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''فی الحال یہاں پر صرف یہی ایک ڈاکٹر ہیں ویسے اس عمارت کے مالک خود بھی بہت بڑے ڈاکٹر ہیں اس وقت وہ یہاں موجود نہیں ورنہ تم لوگوں سے ضرور ملتے۔'' صنوبر اس دوران اس سے غیر محسوس انداز میں معلومات حاصل کرتی رہی تقریباً رات دس بجے مریم سونے چلی گئی، وہ جاگتے رہے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔

رات تقریباً ایک بجے وہ دونوں کھڑے ہو گئے اب حرکت میں آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا غیر ضروری لائٹیں آف کی جا چکی تھیں صنوبر نے اپنے لباس میں پوشیدہ دو پسٹل نکالے ایک خود رکھا اور دوسرا فیصل کے حوالے کر دیا پسٹل اس نے احتیاط ساتھ رکھے تھے اگر یہ لوگ جرائم پیشہ ثابت ہوئے تو کسی بھی وقت ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلے۔ اور کوریڈور میں چلنے لگے ایک کمرے کا بلب جل رہا تھا فیصل نے آہستگی سے اس کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کی اس نے کھڑکی کو معمولی سا کھسکایا اور پھر پیدا ہونے والی جھری سے

اندر دیکھا۔ اندر بیڈ پر ایک نوجوان لڑکی سوئی پڑی تھی، چونکا دینے والی بات اس کی کلائی میں موجود ہتھکڑی تھی جو بیڈ سے منسلک ایک آہنی ہک میں بندھی تھی۔

لڑکی کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا، ''آپی یہ تو فائزہ ہے۔'' فیصل نے سرگوشی میں کہا تو صنوبر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور غور سے فائزہ کو دیکھنے لگی وہ واقعی فائزہ تھی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ فائزہ اب تک ڈاکٹر بھوت کے باس کے قبضے میں ہے اور یہ عمارت بھی اس کی ملکیت ہے۔'' آئی جی صاحب کا بیٹا زبیر بھی ہوسکتا ہے یہیں قید ہو، ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔'' اس نے فیصل کو سمجھایا اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی۔

ایک کمرے کے دروازے سے گزرتے ہوئے باتوں کی آواز سنائی دی انہوں نے بند دروزے سے کان لگا دیئے یہ نرس مریم تھی۔ ''ڈاکٹر فہیم اب کیا ہوگا؟'' مریم کی آواز سنائی دی۔ ''ہونا کیا ہے ڈاکٹر بھوت دیر سے آیا تھا اور آتے ہی تجربہ گاہ میں گھس گیا، صبح انہیں اس لڑکی اور طارق کے بارے میں بتادیں گے، ڈاکٹر بھوت بہت خوش ہوگا۔ اور اس لڑکے کے ساتھ ساتھ ان دونوں پر بھی پیوندکاری کا تجربہ کرڈالے گا۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے ان تجربات کا اسے جنون کی حد تک شوق ہے۔'' فہیم مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''پلیز! آج تو سونے دو تنگ مت کرو۔'' مریم کی خمار میں ڈوبی آواز سنائی دی اور وہ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

صنوبر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ''ایسے ہی کسی کمرے میں ہوسکتا ہے زبیر بھی قید ہو۔'' انہوں نے ایک ایک کرکے تمام کمرے چیک کئے مگر کسی کمرے میں بھی زبیر یا ڈاکٹر بھوت موجود نہ تھے۔ وہ کوریڈور سے گزر کر برآمدے میں جا پہنچے تقریباً ایک ایکڑ پر مشتمل اس وسیع وعریض احاطے میں اس عمارت کے سامنے ایک دوسری عمارت بھی موجود تھی احاطے کی بلند وبالا دیواروں پر خاردار تاریں تھیں جن میں شاید کرنٹ موجود تھا۔ دیواروں کے ساتھ مختلف اقسام کے پودوں کی کیاریاں تھیں وہ دبے قدموں چلتے ہوئے کیاریوں کے قریب جا پہنچے۔

اچانک ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ان کے قریب ہی قطار میں مخصوص ساخت کے ان عجیب وغریب پھولوں کے پودے موجود تھے۔ جو انہوں نے بھوت محل کے باہر دیکھے تھے جس کا پھول یا شاخ توڑنے سے انسانی خون رسنے لگتا تھا اب انہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ انجانے میں ڈاکٹر بھوت کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اب تک ان کا سامنا کسی پہرے دار سے نہیں ہوا تھا اتنے بڑے مجرم کے ٹھکانے پر کوئی بھی پہریدار نہ ہو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پھر اس نے سوچا ''ہوسکتا ہے وہ مطمئن ہوں یہاں اس قدر دیدہ دلیری سے کون آسکتا ہے۔'' صنوبر نے اپنے لباس میں موجود موبائل فون نکالا اور اپنے افسر اعلیٰ کا نمبر ملا کر اسے حالات سے آگاہ کیا اور عمارت کا محل وقوع بتا کر ریڈ کرنے کو کہا۔ اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ وہ دو پہرے دار تھے جو رائفلیں کندھے سے لٹکائے اسی طرف آرہے تھے دونوں جلدی سے پودوں کے پیچھے چھپ گئے دونوں پہرے داران کے قریب سے گزرنے لگے۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹھک کر رک گئے اور ان پودوں کی طرف بڑھے جہاں صنوبر اور فیصل چھپے ہوئے تھے۔ صنوبر اور فیصل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان پر چھلانگ لگادی۔ فیصل نے پہریدار کو نیچے گرا کر اس کی کنپٹی میں گھونسہ مارا تو وہ بے ہوش ہوگیا، دوسری طرف صنوبر نے اٹھتے ہوئے دوسرے پہرے دار کی گردن پر مخصوص انداز میں کراٹے چاپ کا وار کیا کڑاک کی آواز کے ساتھ پہرے دار کی گردن کی ہڈی ٹوٹی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا اب وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب ان کا رخ مرکزی عمارت کے دروازے کی طرف تھا۔ مرکزی دروازہ لاک تھا۔ لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا صنوبر نے اپنی ہیئر پن کی مدد سے دروازے کا لاک کھولا اور آہستگی سے دروازے کو دھکیل

شمع بک ایجنسی کی مفید کارآمد اور دلچسپ کتابیں

برج سنبلہ	25/-	ٹیلی پیتھی سیکھیے	50/-	نوجوانوں کے مسائل	25/-
برج میزان	25/-	ٹیلی پیتھی کیا ہے؟	40/-	پرسکون زندگی	25/-
برج عقرب	25/-	ٹیلی پیتھی اور مراقبہ	30/-	خود سے محبت کیجئے	25/-
برج قوس	25/-	ہپناٹزم سیکھیے	30/-	آئیڈیل جیون ساتھی	25/-
برج جدی	25/-	مسمریزم سیکھیے	40/-	دوستی ایک فن ہے	25/-
برج دلو	25/-	علم النفس سیکھیے	40/-	ترقی کا راستہ	25/-
برج حوت	25/-	فن دست شناسی	75/-	پرکشش شخصیت	25/-
علم نجوم سیکھیے	60/-	پامسٹری گائیڈ	30/-	خوشگوار زندگی	25/-
برجوں کا انسائیکلوپیڈیا	60/-	آسان یوگا	30/-	تعلقات بڑھایئے	25/-
شمع اسٹار گائیڈ	40/-	یوگا سیکھیے	45/-	بچوں کی نگہداشت	60/-
اعداد میں قسمت	35/-	فن جادوگری	30/-	بچوں کی تعلیم وتربیت	60/-
علم الاعداد	20/-	عالم ارواح	40/-	اخلاقیات کے اصول	30/-
علم الاعداد کی روشنی میں آپ کیا ہیں؟	30/-	چھ پراسرار علم	40/-	ترقی کیسے کریں؟	30/-
نگینے بولتے ہیں	60/-	کامیابی کا راز	25/-	بچوں کی نفسیات	30/-
پتھروں کے خواص اور فوائد	50/-	پریشان ہونا چھوڑیئے	25/-	خواتین کے مسائل	30/-
انسان اور قدرتی پتھر	75/-	ذہنی دباؤ سے نجات	25/-	کامیابی کا سفر	30/-
خوابوں کے اسرار	25/-	گفتگو کا فن	25/-	کامیاب لوگ	30/-
خواب اور تعبیر خواب	25/-	زندگی گزارنے کے اصول	25/-	بے مثال زندگی	30/-
خواب نامہ (درمیانہ)	30/-	ناکامی سے بچنے کا فن	25/-	خوشی کیا ہے؟	30/-
خواب اور تعبیر	40/-	ترقی کے پندرہ اصول	25/-	الجھن سلجھن	75/-
خواب نامہ یوسفی	90/-	قوت ارادی کا جادو	25/-	اسلامی نام	20/-
مدنی خواب نامہ	100/-	ازدواجی تعلقات	25/-	اسلامی نام	40/-
شمع فالنامہ	90/-	دوسروں پر جادو کیجئے	25/-	اسلامی نام (دو ٹائٹل)	30/-
شعبدہ بازی کے کھیل	40/-	خود اعتمادی بڑھایئے	25/-	بابرکت اسلامی نام	25/-
شعبدہ بازی سیکھیے	30/-	دولت وشہرت کا زینہ	25/-	شاہکار اسلامی نام	30/-
شعبدہ بازی	60/-	ڈپریشن	25/-	اسلامی نام (16=36x23)	75/-

شمع بک ایجنسی، نوید اسکوائر اردو بازار کراچی Ph:32773302

کر اندر جھانکا، کوریڈور سنسان پڑا تھا وہ دونوں بے دھڑک اندر گھستے چلے گئے۔

ایک کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخص سو رہا تھا۔ جو شکل وصورت سے ملازم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے تمام کمرے چیک کرنے لگے۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، لیونگ روم سب ہی اعلیٰ درجے کے اشیا سے مزین تھے۔ خالی کمروں میں جھانکتے ہوئے وہ ایک کمرے کے دروازے پر جا پہنچے۔ صنوبر کے وجدان نے اسے بتایا کہ یہ کمرہ خالی نہیں ہے اپنے اندازے کی تصدیق کے لئے اس نے کمرے کے دروازے سے کان لگا دیئے مگر اندر گہری خاموشی تھی۔ دروزے کے ناب کو گھمایا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ صنوبر نے اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکالا اور اس کی مدد سے لاک کھول دیا۔ دروازے کو ہلکا سا کھول کر اندر جھانکا کمرے میں سنگل بیڈ پڑا تھا جس پر لحاف اوڑھے کوئی بے خبر سو رہا تھا۔ زیرو واٹ کے بلب کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ خاموشی سے دبے قدموں کمرے میں داخل ہو گئے کمرے کا اندر سے جائزہ لینے پر وہ بری طرح چونک پڑے یہ کمرہ دراصل تجربہ گاہ تھی جس میں چاروں طرف مختلف قسم کے محلولوں کے جار رکھے تھے مختلف اقسام کی مشینیں اور لیپ ٹاپ موجود تھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک قد آور بڑا سا گملا رکھا تھا جس میں ایک دس سالہ معصوم سا لڑکا سینے تک مٹی میں دھنسا پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

بچے کو دیکھتے ہی انہیں جھٹکا سا لگا اس بچے کی تصویر وہ کسی فائل میں دیکھ چکے تھے۔ وہ آئی جی صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا۔

ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے وہ فائزہ کی تلاش میں انجانے میں ڈاکٹر بھوت جیسے خطرناک مجرم کے سر پر جا پہنچے۔ فیصل نے بیڈ پر پڑے شخص پر سے جھٹکے سے لحاف ہٹا دیا۔ ڈاکٹر بھوت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ صنوبر نے اس کے گلے پر تیز دھار خنجر رکھ دیا۔ ''خبردار نہ ہی کوئی آواز نکالنا اور نہ ہی کسی قسم کی ہوشیاری دکھانا ورنہ تمہاری شہ رگ کاٹ دوں گی۔''

''یہ خنجر ہٹاؤ میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔'' ڈاکٹر رچرڈ عرف بھوت خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''فیصل اس کی طرف پسٹل تانے خاموش کھڑا تھا۔ ''تم نے تو ہمارے سامنے خودکشی کر لی تھی پھر تم اس وقت زندہ کیسے نظر آ رہے ہو؟ جواب سچ دینا ورنہ ایک پل میں تمہاری گردن دھڑ سے الگ ہو جائے گی۔'' صنوبر نے سفاک لہجے میں اسے دھمکی دی۔

''وہ گولی خاص قسم کی ہے جسے بغیر پانی سے نگلا جا سکتا ہے۔ اس گولی کے اثرات ایسے ہیں کہ انسان صرف دس منٹ کے لئے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے اس کی نبض اور سانس اس طرح رک جاتی ہے کہ دیکھنے والا چاہے کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو اسے مردہ سمجھتا ہے تم لوگ میری لاش چھوڑ کر باہر چلے گئے دس منٹ بعد ہوش میں آتے ہی میں تجربہ گاہ میں موجود خفیہ راستے سے فرار ہو گیا۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''تمہارا باس کہاں ہے؟ اور اس کی اصلیت کیا ہے؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''آج اس کے آنے کا دن تھا مگر وہ نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ نقاب میں آتا ہے آواز بدل کر بات کرتا ہے، میں اسے نہیں جانتا۔'' ڈاکٹر بھوت اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''تم غیر ملکی ہو یقیناً تمہارا تعلق کسی مغربی ملک سے ہے پھر یہاں یہ درندگی بھرا کھیل کھیلنے کیسے پہنچے؟'' صنوبر نے پوچھا۔ ''وہ ہمارے کنٹری میں آیا تھا اسے کسی ذرائع سے میرے بارے میں سن گن ملی کہ میں ہیروئن تیار کرنے کا ماہر ہوں اس نے فون پر مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی چونکہ مجھے بھاری معاوضے کی پیشکش ہوئی تھی اس لئے میں نے ہامی بھر لی۔ دوسرے روز اس کے گروہ کے ایک آدمی نے مجھ سے ملاقات کر کے معاملات طے کیا، یہاں آ کر پہاڑی علاقے میں جدید ترین لیبارٹری قائم کی، ہم وہاں پوست کی کاشت کرنے لگے، ہیروئن تیار کرنے کے بعد اس ملک

سے لے کر دنیا بھر میں سپلائی کی جاتی ہے۔

بھوتوں کا ڈرامہ اس لئے رچایا گیا ہے کہ کوئی بھولا بھٹکا بھی وہاں ڈر کے مارے نہ آئے۔'' ڈاکٹر بھوت نے جواب دیا۔

''انسانوں پر تمہارے تجربات کا کیا مقصد ہے؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''یہ میرا جنون ہے مجھے اس طرح سکون ملتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے میں نے خاص قسم کے پودے افریقہ سے منگوائے ان میں ایسی تبدیلی کی کہ انسان کے جسم سے سرکاٹ کر پودے کی شاخ داخل کر دیتا تھا۔ پھر انسانی جسم کو زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے یہ پودا انسانی جسم میں اپنی جڑیں بڑھاتا ہوا پھلتا پھولتا ہے۔ میرے خاص قسم کے انجکشن کی بدولت اس پودے کی شاخ توڑنے یا پھول توڑنے سے انسانی خون رسنا شروع ہو جاتا ہے۔'' وہ تفصیل سے بتاتا چلا گیا۔

اسی وقت دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ اور فیصل کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا۔ انہوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ وہاں نیلی آنکھوں والا ایک نقاب پوش کھڑا تھا۔ ڈاکٹر بھوت بولا۔ ''باس آپ۔''

باس کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا۔ اسی پسٹل سے نکلنے والی گولی نے فیصل کے پسٹل والے ہاتھ کو زخمی اور پسٹل سے محروم کر دیا تھا، بلاشبہ اس کا نشانہ بے مثال تھا۔

نقاب پوش کے ہاتھوں میں موجود پسٹل پر سائلنسر لگا ہوا تھا اس لئے گولی چلنے کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ ''لڑکی ڈاکٹر کو چھوڑ دو اور مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' باس بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

صنوبر نے ڈاکٹر بھوت کی شہ رگ سے خنجر ہٹا دیا۔

''اب اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر ایک طرف پھینک دو ہوشیاری مت دکھانا میرا نشانہ بے مثال ہے اتنا تو تم جان ہی چکی ہو گی۔'' وہ سفاک لہجے میں بولا۔

صنوبر نے اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ باس نے پسٹل کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، صنوبر اس کا ارادہ بھانپ کر ڈاکٹر بھوت کی طرف دوبارہ بڑھی، ڈاکٹر بھوت نے بھاگنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ باس کے پسٹل سے نکلنے والی گولی ڈاکٹر بھوت کے سینے میں جا لگی، وہ چیختا ہوا نیچے گرا باس بوکھلا گیا۔

فیصل بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور فضا میں قلابازی کھائی، اس کی دونوں لاتیں بیک وقت باس کے سینے سے ٹکرائیں، پسٹل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گرا، نقاب پوش گرتے ہی پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ فیصل اس کے کھڑا ہونے کا انداز دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ ماہر فائٹر کی طرح اسٹانس بنائے کھڑا تھا۔ فیصل نے تیزی سے اس کے چہرے پر گھونسہ مارا۔

نقاب پوش نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور زور دار فرنٹ کک اس کے سینے پر رسید کی، وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ بجلی کی سی تیزی سے باس نے ایسپن کک فیصل کے چہرے پر رسید کی۔ فیصل کی آنکھوں کے آگے ستارے رقص کرنے لگے ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ باس نے زوردار سائیڈ کک فیصل کے سینے پر ماری تو وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے جا ٹکرایا۔

باس نے پے در پے کِکس اور پنچ کی فیصل پر بارش کر دی چند لمحوں بعد ہی وہ کمرے کے فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ باس اس کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا۔ ''کیا ہوا بچے اتنی جلدی کنی بل نکل گئے۔'' نقاب پوش ہنسا۔

فیصل ڈگمگاتا ہوا اٹھا۔ باس فتح کے نشے میں چور آگے بڑھا اور دائیں پاؤں پر گھوم کر فیصل کے چہرے پر راؤنڈ کک رسید کرنا چاہی، اس بار فیصل نے اپنی کلائی سے بلاک کیا اور گھوم کر بیک کک نقاب پوش کے سینے پر رسید کی، نقاب پوش لڑکھڑایا، فیصل نے اپنا دایاں پاؤں اٹھایا یوں لگا جیسے وہ فرنٹ کک مارنا چاہتا ہو، باس نے اس کا وار روکنا چاہا مگر یہ دھوکہ تھا فیصل نے فوراً ہی جمپ لگا کر اپنے بائیں پاؤں سے جمپ فرنٹ کک نقاب پوش کے چہرے پر رسید کی۔ باس الٹ کر گرا،

گرتے ہی جیسے ہی اٹھا، فیصل نے اپنے پاؤں کی زور دار ٹھوکر اس کی ٹانگوں کے درمیان ماری تو وہ کراہتا ہوا جھک گیا، مارشل آرٹ مقابلے میں یہ داؤ فاؤل کہلاتا ہے لیکن ایسے موقع پر جائز تھا۔

فیصل نے آگے بڑھ کے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب چہرے پر ماری، نقاب پوش پشت کے بل گر کر تڑپنے لگا۔ ٹانگوں کے درمیان نازک مقام پر لگنے والی کک کی بدولت وہ اب تک سخت تکلیف میں تھا۔ فیصل نے آگے بڑھ کر تڑپتے ہوئے باس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔

اگلا ہی لمحہ دونوں کو حیرت زدہ کر گیا۔ باس بزنس کی دنیا کی مانی ہوئی شخصیت فائزہ کا باپ ضیا ہمدانی تھا۔

فائزہ کا باپ فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ فیصل نے اس کے جسم پر ٹھوکریں برسانی شروع کر دیں اسی وقت میگا فون پر چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”یہ عمارت پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے گھیرے میں ہے۔ عمارت میں موجود افراد خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔“ اعلان کے جواب میں فوراً ہی گولیوں کی آواز سنائی دی۔ شاید عمارت میں موجود محافظوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔

دونوں اطراف سے زور دار فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ گاہے بہ گاہے برسٹ بھی چلائے جا رہے تھے اسی وقت نیچے پڑے ضیا ہمدانی نے ایک طرف پڑے پسٹل کو اٹھا کر اس کا رخ فیصل کی طرف کر دیا۔

صنوبر نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سوچ لیا کہ اگر اس نے ذرا بھی دیر کی تو فیصل کو کھو بیٹھے گی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ میں پکڑا خنجر ہمدانی کی طرف پھینک دیا۔ خنجر ضیا ہمدانی کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ وہ بنا آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا۔ وہ دونوں باس اور ڈاکٹر بھوت کی لاشوں پر نفرت بھری نظر ڈال کر زبیر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بڑی جدوجہد سے زبیر کو گملے سے نکالا اور محتاط انداز میں باہر نکلے۔ کمانڈوز عمارت کے اندر داخل ہو چکے تھے اس دو بدو مقابلے میں تربیت یافتہ کمانڈوز نے درجن سے زائد ڈاکٹر بھوت کے کارندوں کو ہلاک کر دیا تھا کچھ زندہ گرفتار ہو چکے تھے۔ صنوبر اس کمرے میں گئی جہاں فائزہ قید تھی۔ فائزہ کی ہتھکڑی ہیئر پن سے جیسے ہی کھولی۔ وہ صنوبر سے لپٹ کر رونے لگی۔ ”یہ تم نے خالد کے ساتھ کیا کیا تھا؟“ صنوبر نے پوچھا۔

”آپی میرے ڈیڈی کرمنل ہیں انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر اب میں خالد سے ملی تو وہ اسے جان سے مار دیں گے اس لئے اس دن سپر اسٹور میں میں نے اس سے بے رخی برتی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

زبیر کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ماہر ترین ڈاکٹر اسے ہوش میں لائے۔

صنوبر، فائزہ اور فیصل اسپتال پہنچے تو افسوس ناک خبر ملی، خالد کوما میں جا چکا تھا۔ فائزہ ڈاکٹروں کے روکنے کے باوجود زبردستی ICU میں جا گھسی اور روتی ہوئی ساکت پڑے خالد سے لپٹ کر رونے لگی، اس کے آنسو خالد کے چہرے پر گرتے جا رہے تھے۔

جہاں سچی محبت ہو وہاں معجزے بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ خالد کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے آنکھیں کھول دیں اور کپکپاتی ہوئی آواز میں پکارا۔ ”فائزہ“

فائزہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور خوشی کے مارے کھلکھلا کر ہنس پڑی، ICU میں موجود ڈاکٹرز، فیصل اور صنوبر کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے تھے، یہ خوشی کے آنسو تھے جو، ان کی آنکھوں سے نکلے تھے، اسی وقت ان کے کانوں سے فیصل کی چہکتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ شیکسپیئر نے کہا تھا۔ ”آنسو خوشی کے ہوں یا غم کے دونوں ہوتے ہیں ایک جیسے۔“

”بکومت! یہ شیکسپیئر نے نہیں کہا، یہ گانے کے بول ہیں۔“ صنوبر نے اسے ڈانٹا۔ ”آپی کبھی تو میرا بھرم رہنے دیا کرو۔“ وہ مسکین لہجے میں بولا اور سب مسکرا اٹھے۔

بک لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
یہاں لائبریری اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
ساؤنڈ سسٹم
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور